یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

ہماری مطبوعات
عثمان ذوالنورین
تاریخ ادبیات ایران
قصص القرآن
تاریخ ملت
خلافت راشدہ
صدیق اکبر
ترجمان السنۃ
ندوۃ المصنفین دہلی

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

یوم جمہوریہ ہر سال کی طرح اس سال بھی تزک و احتشام سے منایا گیا اور کیوں نہ منایا جائے آخر اس دن ہمارے ملک کا آئین تکمیل ہو کر نافذ ہوا۔ جس کی بدولت ہر ہندوستانی کو جمہوری حق ملا یہ ہی حق اسے اپنے ملک میں اپنی مرضی کی حکومت بنانے اور اپنی ناپسند حکومت کو جائز طریقہ سے ہٹانے کا موقع تفویض کرتا ہے۔ ورنہ جب ہمارے ملک پر انگریز سامراج کا تسلط و دبدبہ تھا تو ملک کے کسی بھی باشندے کو حکومت سازی میں شرکت کا حق ہی حاصل نہ تھا۔ سارے ہی بڑے بڑے فیصلے ہندوستان سے دور دوسرے ملک میں ہوتے تھے اور وہ نافذ ہندوستان میں ہو جاتے تھے۔ کتنی غیر انسانی یہ بات ہے کہ جس ملک میں کوئی بڑا فیصلہ نافذ ہوتا ہے وہ اس ملک میں نہیں بلکہ باہر دوسرے ملک میں پہلے طے پاتا ہے اور پھر اگر یہ رضا ورغبت نہیں تو بذریعہ جبر وستم کے اس ملک کے عوام کو ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ظلم و جبر کا دور کبھی زیادہ دن نہیں چل پاتا ہے اس لئے اس ظلم و ناانصافی کے خلاف ہندوستانیوں میں غم و غصہ پیدا ہوا اور یہ غم و غصہ ہی بالآخر مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت و رہنمائی میں ایک بڑی کامیاب تحریک آزادی کی کامیابی کا باعث و محرک بنا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے انگریز سامراج کو اپنا بوریہ بستر اسمیٹ کر اس ملک سے رفو چکر ہونا پڑا، ملک کو آزادی کی فضاء میں سانس لینا نصیب ہوا۔ اور اس کے بعد اس ملک کی گاڑی کو چلانے کے لئے ایک آئین مرتب کیا گیا، جس کے تحت ہر ہندوستانی

کہ جمہوری حق مل گیا۔

جب تک مہاتما گاندھی رہے، مولانا آزاد رہے، پنڈت جواہر لال کی موجودگی میں یہ ملک جیسے تیسے جمہوری لائن پر ٹھیک سے چلتا رہا۔ آزادی کی تحریک چلانے والے رہنما زندہ تھے اس لئے انہیں آزادی اور جمہوریت کی قدروں کا علم تھا اور پھر ان میں خلوص، ایثار اور جذبۂ قربانی تھا ان کے سامنے ملک کی خدمت اور ملک میں رہنے والے تمام باشندوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی کو ان تک بآسانی پہچانے کا عزم مصمم تھا۔ اسلئے آزادی کے شروع دنوں میں کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی جس سے اس ملک اور ملک کے عوام کے مستقبل کے بارے میں کسی فکر نے گھیرا ہو۔ مگر جوں جوں آزادی کی تحریک کے صف اول کے رہنما وفات پاتے گئے ملک میں ابتری کے اثرات سامنے آنے لگے اور آج جبکہ آزادی کے پچاس سال پورے ہونے کو ہیں ملک کے موجودہ سیاسی رہنماؤں نے ملک کو وہاں پہنچا دیا ہے جس کو دیکھ کر ہر محب الوطن کو دکھ و صدمہ ہے اور وہ ملک کے مستقبل کی طرف سے فکر و تشویش میں مبتلا ہے۔ حوالہ کانڈ میں کتنے ہی وزیر و لیڈرانِ ملک کے نام اخبارات کے سامنے عوام کے سامنے آچکے ہیں اور ان کے پاس سے جو سامان و رقم برآمد ہوئی یا ہو رہی ہے اسے سن کر بھی کسی طلسمی دنیا کی کہانیوں کی یاد دماغ میں کوند جاتی ہے۔ لاکھوں نہیں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپوں کے اسکنڈل جب سنتے اور اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں تو عجیب سے دل و دماغ پر کیفیت ہوتی ہے۔ کیا اسی کے لئے آزادی کی تحریک چلائی گئی تھی۔ آزادی کی تحریک کے صف اول کے قائدین کو اگر ذرا بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ آزادی کی حصولیابی کے بعد مفاد پرست لوگ ملک کو اس طرح لوٹنے کھسوٹیں گے تو وہ قطعاً تحریک آزادی کے لئے

اپنی جانوں پر کھیل کر آگے نہ آتے بلکہ خاموش کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ جاتے۔

ملک کے آئین ساز اداروں میں اس کے اراکین کا جو برتاؤ وسلوک ہے اسے ۱۹۹۷ء کے جنوری ماہ میں ہندوستان کے عوام نے ملک کے ایک صوبہ راجستھان اسمبلی میں اخبارات کے ذریعہ دیکھا — ذیل میں ہم اخبار روزنامہ "نوبھارت ٹائمس" مورخہ ۱۲ر جنوری ۱۹۹۷ء کی ایک خبر کو من وعن قارئین کے ملاحظہ کے لئے شائع کر رہے ہیں: "راجستھان اسمبلی میں پیر کو ریکارڈ توڑ ہنگامے کا منظر دیکھنے کو ملا۔ ممبران اسمبلی کے درمیان میں ہاتھا پائی تو ہوئی ہی صوبائی گورنر کے ساتھ بھی دھکا مکی ہوئی بلکہ ممبران نے گورنر کو اپنی تقریر پڑھنے کے لئے بزور طاقت روک بھی دیا۔ اور انھیں اسمبلی ہال چھوڑنے پر مجبور کر دیا اتنا ہی نہیں حزب اختلاف کے ممبران نے ایک سیکورٹی گارڈ کی پٹائی کی اور اس کی پینٹ اتار دی — یہ سب تقریباً پون گھنٹہ تک ہوتا رہا اسمبلی کی تاریخ میں یہ پہلا تاریخی دنگا ریکارڈ ہے سیکورٹی گارڈ اور ممبران کے بیچ جھڑپ بھاری شور وشرابہ توڑ پھوڑ اس وقت رکی جب اسپیکر نے اجلاس کی کارروائی تیس منٹ تک روکنے کے بعد پھر دوسرے دن تک کے لئے ملتوی کر دی — بعض ممبران اسمبلی سیکورٹی گارڈوں کی گھیرا بندی کو توڑتے ہوئے کمانڈوں کی طرح مائک کے پاس پہنچ گئے اور گورنر کے لئے لگائی گئی لائٹ کو اکھاڑ کر ہال میں پھینک دیا۔"

ہمارے شرافت انسانیت تہذیب کا مذکورہ بالا نمونہ جب باہر کے ملک کا کوئی شخص دیکھ رہا ہوگا تو اس پر کیا بیت رہی ہوگی اور وہ ہمارے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا اس کا ہمارے بارے میں کیا خیال بنا ہوگا یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن یہ بات ضرور نوٹ کر لیجئے گا کہ جتنی دیر بھی یہ ہنگامہ دھکا مکی، شور وشرابہ، مار پیٹ چلتی رہی اتنی دیر تک عوام کے خون پسینے کی کمائی سے وصول ٹیکس وغیرہ کی رقم اس پر خرچ ہوتی رہی یعنی آپ باور کریں کہ اسمبلی کی کارروائی جب چلتی ہے تو اس پر منٹ وگھنٹہ میں کتنا خرچ آتا ہے

ایسے میں کرسی کی اپنی قسمت پر رونا ہی آئے گا۔ ایک ممبر اسمبلی کے ٹھاٹ باٹ، دفتری رہائشی الاؤنس بھتے وغیرہ کے اخراجات کہاں سے ادا ہوتے ہیں یہ عوام ہی کے جیبوں کے تو ہوتے ہیں اور جب عوام کو یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک کے روپے پیسے کو اس طرح سے خرچ کیا جاتا ہے۔ تو کسے نہ تکلیف ہوگی یہ دیکھ کر اور سن کر۔ آج ہمارے موجودہ سیاسی راہنماؤں نے ملک کو اس جگہ لا کھڑا کیا ہے جہاں عوام مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں غریب عوام کو ایک وقت کی روٹی کے حصول کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں یہ صرف وہ ہی جانتے ہیں۔ کوٹھیوں کے ایئر کنڈیشنڈ میں بیٹھ کر سیاسی راہنماؤں کو اس کا کیا احساس ہوگا۔ ان کی بلا، عوام جائیں بھاڑ میں، ان کے عیش و آرام اور لوٹ کھسوٹ میں کمی نہ آنے پائے یہ ہی ان بعض سیاسی راہنماؤں کا کردار و عمل بنتا جا رہا ہے جسے دیکھ کر ہر ہندوستانی فکر و تشویش میں بجا طور پر مبتلا ہے۔

ابھی حال ہی میں ہندوستان کے صوبہ مہاراشٹر کے شہر بمبئی میں دنیا کے مشہور پوپ سنگر مائیکل جیکسن نام کی دھوم دھام رہی، مائیکل جیکسن کی بمبئی میں آمد پر پورا بمبئی جیسے مائیکل جیکسن کی اداؤں پر سرشار فدا ہو گیا۔ بمبئی کا ہر جوان لڑکا لڑکی اس پر جاں نثار کرنے پر آمادہ۔ اس کو ٹوٹ کر چاہنے والوں کی تعداد پورے عالم میں بے شمار ہے۔ اس کی ہر ادا ہر چال پر اس بیسویں صدی کی نسل جوان عورتوں مردوں میں مر مٹنے کی جنون کی حد تک جذبہ گھسا ہوا ہے لیکن ابھی تک مائیکل جیکسن کے بارے میں کسی کو یہ بھی وثوق سے معلوم نہیں کہ وہ عورت ہے یا مرد، اس میں مردوں کی بھی ادائیں ہیں اور صنف نازک کی بھی شوخ و چنچل ادائیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جب مائیکل جیکسن ناچتا یا ناچتی ہے تو اس کا پورا ہی جسم حرکت عمل میں ہوتا ہے کمر کو مٹکانے کی ادا جس پر کیا جوان عورت اور کیا جوان مرد سبھی دیوانگی کی حد تک فدا

ہیں۔ جب اس کا بمبئی میں ناچنے کا شو ہوا تو اسکی آمدنی ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں بھی نہیں کروڑوں میں ہوئی۔ اس کی ہر ادا کو کیمرہ مینوں نے اپنے کیمرے میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ بمبئی کے بازاروں میں اس کے فوٹوؤں کی بھاری قیمت میں خرید وفروخت بھی ہوئی۔ ایک دن میں ہی مائیکل جیکسن پورے ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر ایسا سوار ہوگیا کہ اس کے نکلنے میں نہ معلوم کتنا وقت نکل جائے۔ اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ بمبئی کے جس ہوٹل میں مائیکل جیکسن کا بسیرا ہوا اس میں اس کا تکیہ، تولیہ اور بیڈ شیٹ اس کے دیوانوں نے ڈھونڈ نکالی اور اسے جب نیلام کیا گیا تو ایک خاتون نے اسے چھ لاکھ ۴۵ ہزار روپے میں خریدا۔ تاج محل جب ایک بادشاہ نے اپنی رفیقۂ حیات کی یاد میں بنوایا تھا تو پوری دنیا کا سوشلزم والا سماج اس پر نکتہ چینی کرنے کے لئے کمر کس کر میدان میں آگیا۔ شاعروں نے "ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق" کے انداز غزل و شاعری کر کے اس کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن موجودہ زمانے کے لوگوں کو تو اپنی مساوات، اپنی انسانیت پر بڑا ہی ناز و فخر ہے، ان کی موجودگی میں ایک تولیہ، تکیہ، بیڈ شیٹ کسی تاریخ داں کا نہیں کسی دینی عالم کا نہیں کسی سائنس داں کا نہیں بلکہ کمر و کولہوں سے ادائیں بکھیرنے والا ہے اسے لاکھوں میں خریدا جارہا ہے۔ یہ دیکھ کر ہم کیا کہیں اور کیا نہ کہیں یہی سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جارہا ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ اس دور کے انسانوں کی بدقسمتی ہی ہے کہ مال و اسباب کسی انسانیت کی فلاح و بہبودگی کے بجائے اسراف بیجا میں استعمال ہو رہا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو اپنی نیک و حلال کمائی کو کسی انسانیت کی فلاح و بہبودگی کے کام میں خرچ کرے۔ امت مسلمہ کے لئے مذکورہ بالا واقعہ میں بڑا ہی سبق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت میں ایک شخص اپنے پڑوسی کو پکڑ کر کہے گا یا اللہ تو نے اس کو مالدار اور مجھ کو غریب بنایا تھا بسا اوقات رات کو میں بھوکا سوتا تھا

پھر بغیر پیٹ بھر کر سوتا تھا اس سے معلوم کیجئے کہ اس نے مجھ پر اپنا دروازہ کیوں بند رکھا اور آپ کی دی ہوئی دولت سے مجھے کیوں محروم کیا۔

مومن تو خوش نصیب ہے کہ اس پر اللہ تبارک تعالیٰ کا یہ کرم و فضل اور احسانِ عظیم ہے کہ اس کی کمائی کی دولت مائیکل جیکسن کے فضولیات و لغویات کی بجائے نیک کاموں میں صرف ہو رہی ہے اس کی زکوٰۃ و خیرات ضرورت مند بندگان خدا کے کاموں میں آ رہی ہے اس لہو و لعب کے دور میں بھی خدا کا شکر ہے کہ امت مسلمہ میں کافی نام نمایاں ہیں جن کا ہر عمل و کردار نیکی سے بھرپور رہتا ہے۔ ہمارے ملک دہلی میں حاجی عبدالرشید سیفی اے آر والوں کا نام نامی ہمارے دل و دماغ میں ایکدم تازہ ہو جاتا ہے جب کوئی کار خیر کی بات سامنے آتی ہے۔ کسی حکیم کا عمدہ مقولہ ہے کہ صبر کا پھل راحت اور تواضع کا پھل محبت ہے مومن کا فخر اس کا رب اور اس کی عزت اسکا دین ہے۔ منافق کا فخر نسب اور اسکی عزت اسکا مال ہے۔ حاجی عبدالرشید سیفی وہ مومن ہستی ہے جو اس شعر پر عمل پیرا ہیں ؎

اوروں کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم ہیں بہت کچھ
اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

اللہ پاک نے حاجی عبدالرشید سیفی اے آر والوں کو جہاں ایک طرف مال و دولت سے نوازا ہے وہاں ان میں صد درجہ نیکی، شرافت، مذہبیت بدرجہ اتم موجود ہے ان کی نیک و حلال کمائی غریب بندگان خدا کی ضروریات پر خرچ ہو رہی ہے دین و مذہب کے کاموں میں لگ رہی ہے اور یہ بڑی بات ہے ہم تے ۲۵ سال پہلے دیکھا کہ وہ ایک نیک دل انسان کی حیثیت سے انتہائی محنت و مشقت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے کارخانہ میں مستعد عمل ہیں، نماز روزے کے پابند انکساری و شرافت کے پیکر مجسم اخلاقی تواضع کے ساتھ بندگانِ خدا سے ربط و ضبط بنائے ہوئے ہیں اور اللہ تبارک تعالیٰ نے ان کی

محنت و مشقت اور دیانتداری کے طفیل انھیں جب ایک عظیم صنعت کار بنا دیا گو تب بھی ان میں انکساری و شرافت دیانتداری تواضع و اخلاق سخاوت ملنساری میں نہ صرف کوئی کمی ہی دیکھی بلکہ اس میں اور اضافہ ہی پایا کسی کو غریب سمجھ کر اس کو حقیر سمجھنا حاجی عبدالرشید سیفی کی عادتِ فطری ہے ۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے معلوم کیا کہ مخلوق میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ کون ہے؟ ارشاد فرمایا جس کا دل متکبر، زبان سخت، یقین کمزور اور ہاتھ بخیل ہو۔ اور یہ حاجی عبدالرشید صاحب کی خوش نصیبی ہے کہ ان کا دل و مزاج انکسارانہ زبان میں نرمی، یقین محکم اور ہاتھ سخاوت سے بھرپور دریا دل ہے۔ مفسر قرآن حضرت مولانا احمد سعیدؒ دہلوی، مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے ۔ سالدار سخی مومن دین و ملت کے کام کرنے والوں کے پہیئے ہیں جن پر سوار ہو کر دین و ملت کے فلاحی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے مخیّر مومن ہر دور میں بہ افراط موجود ہوں تاکہ دین و ملت کے فلاح و بہبودگی کے کاموں کے لئے کسی چیز کی کوئی کمی نہ واقع ہو۔ آج جہاں مائیکل جیکسن کی اداؤں پر لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کرنے والے دیوانوں کی ایک بھیڑ ہے وہاں دین و ملت کے کاموں پر اپنی دولت نچھاور کرنے والے گو تعداد میں کم ہی سہی لیکن ہیں تو غنیمت، اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں ہر طرح صحت و سلامتی عطا ہو آمین۔

مہنگائی کی مار نے غریب عوام کا کچومر نکال دیا ہے۔ آٹا مہنگا دال مہنگی چاول مہنگا، کس کس چیز کی کمیابی کا رونا رویا جائے۔ ہر چیز کم ہے اور مہنگی ہے کمی صرف مہنگائی بڑھانے کے لئے ہے یعنی تاجروں کو مالدار بنانے کے لئے ورنہ تو ہر چیز کی افراط ہے۔ جمع خوروں کے گودام ہر چیز سے بھرے پڑے ہیں مصنوعی قلت دکھا کر چیزیں مہنگی

کی جاتی ہیں۔ جس کا سیدھا اثر غریب عوام پر پڑتا ہے۔ انھیں اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لئے کیا کیا تگ و دو کرنی پڑتی ہے یہ صرف غریب عوام ہی کو معلوم ہے کسی مالدار جمع خور و تاجر کو اس کا ہلکا سا بھی گیان نہیں ہے ـــ ہندوستان کا یہ تاجر طبقہ کب سنبھلے گا اور کب اسے ہوش آئے گا کہ جب یہ غریب عوام کی مشکلات محسوس کریگا اور اناج کی جمع خوری کرکے مہنگائی بڑھانے سے باز آئے گا۔

سب سے قابل نفرت فعل یہ ہے کہ اناج کی جمع خوری کرکے اناج مہنگا کیا جائے اور غریب عوام کو اس کے حصول کے لئے نااہل بنا کر انھیں بھوکوں و فاقہ کشی کرنے پر مجبور کیا جائے۔

جنوری و فروری ۱۹۹۷ء کا یہ مشترکہ شمارہ

کلکتہ ایک تقریب میں شرکت کی غرض سے جانا ہوا جس کی وجہ سے دفتر میں تعطیل رہی۔ اور تعطیل کی وجہ سے رسالہ "برہان" پھر لیٹ ہوگیا۔ مجبوراً زیر نظر شمارہ "برہان" ماہ جنوری فروری ۱۹۹۷ء کا مشترکہ شائع کیا جارہا ہے۔

قارئین ہماری مجبوری کا خیال فرماتے ہوئے اس کوتاہی کو نظر انداز کرتے ہوئے ہمارے لئے دعاگو رہیں گے۔

(ادارہ)

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ نمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا اس کے بقایا مضمون کا آخری قسط

اُفتادِ طبع اور مزاج

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اپنے ممتاز فکر و بصیرت۔ فراستِ ایمانی اور علمی عظمتوں کے ساتھ ساتھ مفتی صاحبؒ کردار و عمل کی دنیا میں بھی اپنی انتہائی بلند و بالا شخصیت رکھتے تھے اور درحقیقت کسی انسان کی زندگی میں اس کا کردار اور عمل و سلوک ہی وہ پیمانہ ہے جس سے اس کے محاسن و معائب کی پیمائش کی جاسکتی تھی۔ مفتی صاحب سے مل کر ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک باشعور عالمِ دین اور عالی ظرف انسان سے ملاقات ہو رہی ہے۔ اُن کی بات چیت بڑی دلآویز اور تسکین بخش ہوتی تھی۔ اور اس میں علم و فضل کا وزن محسوس ہوتا تھا۔ اپنے پرائے سب کے لئے خیر خواہی، ہر کسی کے درد کا احساس، اپنے تعلق رکھنے والوں کی حد سے زیادہ پاسداری اور ان کی فلاح و بہبود کی فکر۔ ہر تعلق کو نبھانے کی انتہائی کوشش۔ رفتار و گفتار میں توازن اور سلامت روی، وضعداری اور بے اندازہ تحمل و برداشت اُن کے کردار کے چھپائے ہوئے اوصاف تھے۔ ان کے مزاج میں سادگی کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی، شعور اور نفاست کو بڑا دخل تھا ہمیشہ سادہ لباس پہنتے تھے۔ خوراک بھی بہت کم تھی۔ کھانے پینے میں حد سے زیادہ محتاط تھے۔ لیکن رہن سہن اور اپنی بود و باش میں معیاری۔ اور قرینہ کی زندگی گذارتے تھے۔ خود جلیل القدر عالمِ دین مجوّد اور حافظ قرآن تھے مستند اور محترم علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اپنے دَور کے باخدا بزرگ اور شیخِ طریقت کے فرزند

ارجمند تھے، اس تمام کے باوجود انھوں نے کبھی عام مولویانہ زندگی اپنائی نہ وہ طور طریقے اپنائے جو دینی مدرسوں سے پڑھ کر نکلنے والوں میں عام طور پر مانوس و متعارف ہیں۔ اپنے موروثی اور ذاتی فضائل و کمالات پر کسی نخوت و غرور کا سایہ بھی اُن پر نہ پڑ سکا۔ ارشاد و بیعت کو اگر وہ اپنی زندگی کا معمول بنا لیتے تو آج دُور دُور تک ان کے مُریدوں اور متوسلین کی صفیں پھیلی ہوئی نظر آتیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ پیری مُریدی کے مُروّجہ طور طریقے اُن کی نظر میں کبھی نہ سما سکے۔ اُن کی علمی عظمتیں اور فکر و شعور کی وسعتیں ان رواجی حدود میں سمٹ کر رہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وعظ و ارشاد کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ تقریریں بھی کرتے تھے، بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کرتے۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تقریر و خطابت کا حق ادا کر دیتے تھے۔ اُن کی ہر تقریر میں جو حلاوت۔ دلنشینی۔ نکتہ آفرینی اور تعمیری و اصلاحی انداز ہوتا تھا بہت کم کسی مقرر یا خطیب میں دیکھا گیا، پھر بھی انھوں نے وعظ و تقریر کو اپنا وسیلہ معاش کبھی نہ بنایا۔ این و آن کی ہوس اور گھٹیا قسم کے منافع کی فکر اور لالچ سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ وہ حد درجہ سیر نفس اور خیر الغنیٰ غنی النفس کا مصداق تھے۔ بڑے بڑے تاجروں اور دولت مندوں سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ لیکن ان تعلقات کو اپنے علمی وقار کے ساتھ نباہتے تھے۔ اور اُن کی خاطر اپنی اونچی سطح سے ایک سیڑھی نیچے اُترنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ زندگی کی تلخیوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنے میں بھی ان کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا۔ گھریلو زندگی سے لیکر اپنے تعلقات اور سماجی روابط تک ان کو بارہا حوصلہ شکن صدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ خود اپنوں کی اور اپنے چھوٹوں کی اذیت رسانی اور فتنہ انگیزیوں سے پالا پڑا۔ ایک ایک تنکا جمع کر کے انھوں نے علم و فن کا ایک آشیانہ "ندوۃ المصنفین" کی شکل میں تعمیر کیا جو اپنی عمر کی ایک دہائی بھی نہ دیکھ پایا تھا کہ تقسیم ہند ایک سیلاب بلا بن کر اس کے سر سے گذری اور اس کی ہلاکت خیزیوں

نے دَم کے دَم میں اس کو لوٹ پھونک کر، اُجاڑ کر ویران کر دیا۔ مفتی صاحب پناہ گزین بن کر پوری بے سرو سامانی کے عالم میں قرولباغ سے نکلے تھے، حالات حد درجہ ناسازگار تھے۔ سب کچھ لٹ چکا تھا، مگر مفتی صاحب ہی کی ہمت تھی اور اُن ہی کا ظرف تھا کہ اُس اُجڑی ہوئی زندگی کو پھر بنانے کا تہیہ کیا اور بنا کر دکھا دیا۔

اجلاس میرٹھ اور اس کے بعد جمعیۃ علماء کے نئے کاروباری دَور میں، ان کے چھوٹوں نے جو جو رویّے اپنائے اور اپنی بدزبانی، بہتان تراشی اور تذلیل و توہین کے جو جو کرتب دکھائے، مفتی صاحب ہی کا ظرف تھا کہ ان تمام صدموں کو برداشت کر کے بھی سب کو اسی عالی ظرفی اور کشادہ دلی کے ساتھ سینہ سے لگاتے رہے ۱۹۶۸ء میں خود دیوبند میں مسلم مجلس مشاورت کا جلسہ ہوا۔ پوری تیاری اور پلاننگ کے ساتھ نہ صرف اس جلسہ کو درہم برہم کیا گیا۔ بلکہ شر و فساد کے جانے پہچانے عادی مجرموں نے مسلّح ہو کر سرزمین دیوبند پر معرکۂ کربلا کی تاریخ دہرانے کی شرمناک کوشش کی ۔ اور مفتی صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ہزاروں دیکھنے والے حیران ہی رہے کہ اس منظم اور بے روک ٹوک حملہ سے مفتی صاحب کی جان کس طرح بچ سکی۔ اور مشیّت ربّی نے کس طرح اپنی آغوش حفاظت میں لے کر ان کو زندہ سلامت نکال لیا۔

ان کی اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں بھی (جس کے وہ مدتوں صدر نشین مجلس شوریٰ رہے) آخری دنوں اُن کی جس جس طرح دلآزاری کی گئی اور نفسانیت زدہ عناصر نے جو بزرگوں کی اس یادگار اور قوم کی امانت پر دست قبضہ جمانے کے لئے بلبلا رہے تھے۔ کیسے کیسے ذلیل ہتھکنڈے اپنائے۔ بزرگوں کی پگڑیاں اُچھالیں، اور دارالعلوم کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنایا، وہ سب کچھ ایسی شرمناک داستان ہے کہ اس کے تذکرہ سے بھی ہم بزرگوں کی اَرواح مقدسہ کو اذیت پہونچانا گوارا نہیں کر سکتے۔

المختصر۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بارہا ایسے تند و تلخ حوادث و صدمات کو جھیل کو بھی مفتی صاحب رح کے رویہ اور رفتار میں کسی شکوہ مندی اور تلخ نوائی کی پرچھائیں تک کبھی نظر نہ آسکی۔ ان کی بے مثال رواداری، سلامت روی، کشادہ دلی اور خیر اندیشی زندگی کے آخری سانس تک برقرار رہی۔ اور کردار مؤمن کی خوبیاں اپنے ساتھ لئے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

ندوۃ المصنّفین

این کار از تو آید و مَردان چنین کنند

گذشتہ صفحات سے گذرتے ہوئے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مفتی صاحبؒ نے کتنی مصروف زندگی گذاری اور ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا دائرہ کتنا وسیع تھا، پھر بھی ان کا سب سے اہم کارنامہ جو اُن کی زندگی بھر کا مشن اور مقصدِ حیات کہا جاسکتا ہے جو اُن کے باقیات صالحات کا خلاصہ و یادگار ہے اور جس کی قدر و قیمت کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے مفتی صاحب کو اعلیٰ ترین علمی صلاحیتیں، مقدس وراثت و ماحول۔ فکر و شعور اور ذوق و سلیقہ کی عظمتیں بخشی تھیں، وہ ادارہ ندوۃ المصنفین کی تاسیس و تشکیل ہے۔

مفتی صاحب کے اَسلاف و اَجداد دارالعلوم جیسے عظیم علمی و دینی اِدارہ کے معمار تھے تو خیر خلف لخیر سلف (مفتی صاحبؒ) نے آگے قدم بڑھا کر علمی مآثر و مآخذ کی چمن بندی کی اور وہ دارالنشر والترجمہ (ندوۃ المصنفین) قائم کیا۔ جو آج کی مہذب اور ترقی یافتہ دنیا کی کسی معیاری اکیڈمی سے کم نہیں۔

پس منظر

اپنے دَور کے مقدس ترین بزرگوں کی آغوش میں اپنی تعلیم و تربیت پوری

کر کے مفتی صاحب نے ایک مفتی اور دینی علوم کے اُستاذ کی حیثیت سے زندگی کے میدان میں قدم رکھا۔ کئی سال دارالعلوم دیوبند میں اور پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں اسی حیثیت سے خدمت علم و دین میں مصروف رہے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں ڈابھیل چھوڑ کر کلکتہ تشریف لے گئے تو وہاں کو لوٹولہ کی مسجد میں ان کے درس قرآن اور دینی خطبات کا سلسلہ شروع ہوا اور دور دور تک اس کی دھوم مچنے لگی۔ اور ہزاروں فرزندانِ توحید اور خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ نسل کے لوگ حلقہ بگوش عقیدت و ارادت ہو گئے

کلکتہ کے قیام میں مفتی صاحب کو مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت قربت ہو گئی تھی جن کی علمیت اور کمال تحریر و خطابت نے ایک عالَم کو مسحور کر رکھا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی کلکتہ پہونچ چکے تھے۔ کم و بیش روزانہ ہی ان تینوں اکابر کی نشست ہوتی اور دیر تک علمی مسائل اور وقت کے بدلتے ہوئے حالات پر تبادلۂ خیالات کا سلسلہ جاری رہتا۔ ان مذاکرات نے مفتی صاحب کے فکر و احساس پر گہرا اثر کیا۔ یہ زمانہ نہ صرف ہندوستان اور ایشیاء بلکہ پوری دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کرا رہا تھا۔ سائنس کے حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کے ڈنکے بج رہے تھے اور مغربی تعلیم و تہذیب کا طوفان پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اور اس کی فتحمندیوں کے سامنے پُرانے افکار و عقائد دم توڑ رہے تھے۔ اور انسانی دنیا کے قدیم نظریات اور طور طریقے بے بس اور مبہوت نظر آ رہے تھے۔

اِس نئی روشنی کی براہ راست ٹکر اسلامی عقائد و روایات سے تھی۔ اور اسلامی تاریخ کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ دنیا عقل و شواہد کے ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی تھی اور انسانی فکر و فہم کی بلند پَروازیاں پُرانے مسلمات و رجحانات کو آنکھیں دکھا رہی تھیں۔ ایسے انقلابی دَور میں محض وعظ و تقریر اور درس و ارشاد کے فرسودہ نظام سے چمٹے رہنا۔ قال اقول کی گردان رَٹنا یا کفر و الحاد کے فتوے صادر کرتے

رہنا، اس دَور کے تقاضوں سے مُنھ چھپانے اور اپنی ہزیمت ولپسپائی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ وسط ایشیا کی قدیم مسلم آبادیاں۔ روسی ترکستان کے ملاقے۔ تاجکستان۔ ازبکستان۔ سمرقند۔ تاشقند۔ بلخ و بخارا وغیرہ اور ترکی و افغانستان جیسے متعدد مسلم ممالک اسی افسوسناک تجربہ کا شکار ہوئے۔

درحقیقت خالص مادّی فکر و تہذیب میں ڈوبے ہوئے اس دَور کا شدید تقاضہ یہ تھا کہ نئے رجحانات کے مقابلہ میں دین برحق کی لازوال صداقت اور مذہب و تاریخ کی قدیم حقیقتوں کو ازسرِ نو علم و تحقیق کی چھلنی میں چھان کر ایسے دلپذیر انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے کہ نئی روشنی سے سہمے ہوئے دلوں اور دماغوں کو تسکین میسر آسکے۔ اور اسلامی علوم و فنون اور دینی نظریات و معتقدات کے چہرہ کو قدامت و جمود کے گرد و غبار سے نکھار کر اُن کی صحت مند رہنمائی اور نفع بخشیوں سے دنیا کے اس نئے دَور کو بھی قوتِ استدلال کے ساتھ روشناس کرایا جائے۔

یہ اپنے وقت کا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اس کاوش فکر و قلم کیلئے بڑی ممتاز صلاحیتیں درکار تھیں۔ ان باہوش۔ متوازن۔ شاداب و زرخیز دماغوں کی ضرورت تھی جو 'قدیم' کے پورے جوہر شناس بھی ہوں۔ اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں ذہنوں کی نئی پیاس اور نئے جذبات و رجحانات کا مزاج بھی پہچانتے ہوں۔ جو دلیل و بیان کے نئے انداز پر قادر ہوں اور اپنی بات کو بڑے شگفتہ و سلیس اسلوب تحریر کے ذریعہ نئی نسل کے دلوں میں اتار سکیں۔

بحمداللہ اُمّت کا دامن ایسے نوابغِ روزگار سے خالی نہیں تھا۔ اور ایک طرف فیلسوف مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ مولانا شبلی نعمانی۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ سید سلیمان ندوی۔ عبدالسلام ندوی۔ ابوالکلام آزاد۔ مناظر احسن گیلانی۔ اور ابوالاعلیٰ مودودی نے اس خدمت کا بیڑہ اٹھایا تو دوسری طرف مرکز دیوبند

کے جواہر و نوادر مفتی عتیق الرحمٰن۔ اور اُن کے رفقاء کرام نے زیادہ منظّم اور اجتماعی شکل میں اس مہم کو سنبھالنے کا تہیّہ کیا۔ یقیناً ہماری تاریخ ان ارباب فکر و قلم اور پوری اُمت کے خیر اندیش مصلحین کے احسان عظیم سے ہمیشہ گرانبار رہے گی۔

اسی پس منظر میں مفتی صاحب نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران (۱۹۳۷ء) ہی میں "ندوۃ المصنفین" جیسے علمی و لٹریری ادارہ کی بنیاد رکھی۔ جس کی تاسیس میں مولانا آزاد کے بیش قیمت مشوروں کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب کے قدر دان و جان نثار حافظ مقبول احمد پٹنہ والے۔ حاجی محمد اسماعیل سگریٹ والے اور شیخ فیروزالدین جاپان والے سب سے پہلے معاونین تھے۔ اور علامہ کشمیری رحؒ کے ممتاز شاگرد مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی (مؤلف ترجمان السنّۃ) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا حامد الانصاری غازی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور قاری محمد یوسف میرٹھی اس کے اولین رفقاء فکر و قلم۔

اِدھر دہلی کی مرکزیت و مرجعیت یقیناً اس کی متقاضی تھا کہ ایسا مؤقر و مستند ادارہ کلکتہ کی بجائے دہلی میں قائم ہو تو اس کی قیمت و افادیت کہیں زیادہ بڑھ سکے گی۔ چنانچہ مفتی صاحب نے بہت جلد اس کا بندوبست کیا۔ اور قرول باغ کی نئی اور کشادہ آبادی میں (عیدگاہ دہلی کی مغربی جانب) لب سڑک ایک نفیس اور نو تعمیر بنگلہ کرایہ پر لیکر شایانِ شان فرنیچر اور دفتری لوازمات سے آراستہ کیا۔ اور ندوۃ المصنفین کو باقاعدہ دہلی منتقل کر دیا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد اس کا علمی ماہنامہ "بُرہان" بھی دہلی سے جاری کیا جو آجتک بحمداللہ جاری ہے۔ اور ہندوستان کے مؤقر ترین علمی جرائد میں شمار کیا جاتا ہے۔

یہ مفتی صاحب کے حسن ذوق، انتظامی سلیقہ اور نفاست پسندی کا ہی نتیجہ

تھا کہ ندوۃ المصنفین بہت جلد ہندوستان کا ایک نامور مرکز علم و تحقیق اور معیاری اکیڈمی بنکر عوام و خواص میں اپنا وزن قائم کر سکا" اور اسلامی علوم و فنون، تاریخ و سیرت وغیرہ پر جو ستھرا معیاری اور باسلیقہ لٹریچر اس سے شائع ہوا۔ اس کی قدر و قیمت کا اعتراف ہندوستان۔ پاکستان۔ بنگلہ دیش۔ بلکہ بیرونی دنیا کے علمی حلقوں میں بھی کیا گیا۔ اس کی کتنی ہی مطبوعات آج دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہی ہیں۔ کتنی ہی مطبوعات کے ایڈیشن بار بار شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کی طلب و فرمائش آج بھی برقرار ہے۔

اس عظیم ادارہ کی مطبوعات سینکڑوں تک پہونچ چکی ہیں۔ جس میں شہرۂ آفاق اور اپنی قدر و قیمت میں انتہائی وقیع یہ ہیں۔

ترجمان السنۃ	۵ جلدیں		(از مولانا سید بدر عالم میرٹھی)
تفسیر مظہری	۱۴	"	(مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی)
انتخاب الترغیب والترہیب	۲	"	(الحافظ المحدث المنذری۔ ترجمہ مولوی عبداللہ دہلوی)
مکمل لغات القرآن	۲	"	
تاریخ ملت	۱۱	"	(قاضی زین العابدین و مفتی انتظام اللہ شہابی)
زاد المعاد فی سیرۃ خیر العباد	۴	"	
قصص القرآن	۴	"	(مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق			(مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)
اسلام کا اقتصادی نظام			(مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)
اسلام کا زرعی نظام			(مولانا محمد تقی امینی)
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر			(مولانا محمد تقی امینی)
تاریخ علم فقہ			(مفتی سید عمیم الاحسان)

العلم والعلماء (مترجم)	(علامہ ابن عبدالبر)
اسلام کا نظام عفت وعصمت	(مولانا ظفیر الدین مفتاحی)
اسلام کا نظام مساجد	(مولانا ظفیر الدین مفتاحی)
اسلام کا نظام حکومت	(مولانا حامد الانصاری غازی)
اسلام کا فلسفہ سیاست	(ڈاکٹر ماجد علی خاں)
تاریخ مشائخ چشت	(پروفیسر خلیق احمد نظامی)
مسلمانوں کا عروج وزوال	(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)
فہم القرآن	(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)
اسلام میں غلامی کی حقیقت	(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)
صدیق اکبر رضؓ	(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)
عثمان غنی رضؓ	(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)
عرب وہند عہد رسالت میں	(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)
دیار یورپ میں علم اور علماء	(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)
خلافت اُمویہ اور ہندوستان	(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)
خلافت راشدہ اور ہندوستان	(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)
حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط	(ڈاکٹر خورشید احمد فارق)
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ	(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)
تاریخ گجرات	(مولانا سید ابوظفر ندوی)
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	(پروفیسر خلیق احمد نظامی)
قرآن اور تعمیر سیرت	(ڈاکٹر میر ولی الدین)
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تربیت	(مولانا مناظر احسن گیلانی)

دینی مدارس اور بنیادی دینی تعلیم

مفتی عزیزالرحمان، چمپارنی ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

بحیثیت مسلمان شریعت کے فرائض میں اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت اور کفالت کی طرح اسلام کے بنیادی عقائد و مسائل سے انھیں واقف کرانا اہم فریضہ ہے۔ ملت کی زندگی کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ ملت جس کے لئے خدا کی طرف سے آئی ہوئی کتاب و سنت جو ایک مقبول اور متعین دین کی صورت میں ہے، اس پر نہ صرف جینا مرنا ضروری ہے بلکہ نئی نسل کے لئے اس کی تعلیم کا انتظام اور یہ اطمینان ضروری ہے کہ وہ بھی اسی خدائی تعلیم اور متعین دین پر زندہ رہے گی، جس کے بارے میں قرآن کریم میں مختلف پیرائے میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا گیا: "واعبد ربک حتی یاتیک الیقین" اپنے رب کی فرماں برداری کرو یہاں تک کہ موت آجائے۔ اور دوسری جگہ فرمایا گیا۔

"ولا تموتن الا و انتم مسلمون" اور نہ موت آئے تمہیں مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو، اور فرمایا گیا۔

"قوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ" اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپکو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جسکے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

* * * *

ملت اسلامیہ ہند کی ذمہ داری اس ملک میں اس اعتبار سے بھی بہت بڑھ جاتی

ہے کہ یہاں حکومت کی طرف سے کوئی لازمی طور پر ایسا نصاب تعلیم یا انتظام جاری نہیں ہے بلکہ ایسا انتظام اور نصاب تعلیم جاری ہے جو اسلام کے بالمقابل عقائد کی تعلیم پر مشتمل ہے، اور جس میں توحید و رسالت کے بنیادی عقائد کے منافی شرک و وثنیت کے مضامین پڑھائے جاتے ہوں، جہاں مسلمان بچے بھی دوسری مذہبی قوم کی دیومالا (جس کی اکثریت ہے) پڑھنے پر مجبور ہوں، جن پر خدانخواستہ یقین کر لینے سے کوئی مسلمان نہیں رہ سکتا۔

جس ملک میں نصاب تعلیم طرز تعلیم (رسم) ومحاضرات کتابیں اور ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے ذریعہ مسلمانوں اور ان کی نسلوں کی نہ صرف ذہنی وفکری اور تہذیبی نسل کشی کی کوشش کی جارہی ہو بلکہ مذہبی واعتقادی نسل کشی کی بھی اور مسلمان نسلوں کے ذہن کو شرکیہ عقائد اور وثنیہ نظریات، باطل افکار کی سموم لہروں سے متاثر کر کے مذہب سے بیگانگی اور اجنبیت پیدا کرنے کی کوشش جاری ہو، ایسی صورت حال میں مسلمانوں پر اپنی آئندہ نسل اور اولاد کو اعتقادی ایمانی اور ذہنی طور پر مسلمان رکھنے کا انتظام کرنا اور انکو بنیادی دینی تعلیم کے انتظام کی ذمہ داری کا احساس انتہائی ضروری اور اپنی اولاد کے حق میں ان کی کفالت ان کی صحت ان کے لباس اور عام تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ لازمی اور ضروری سمجھنا ہوگا جس طرح حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اپنی اولاد سے "ماتعبدون من بعدی" کے سوال اور جواب نعبد الٰھک والٰه آبائک ابراھیم واسماعیل واسحاق کے ذریعہ کیا تھا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ فرماتے ہیں۔

ہندوستان کی ملت اسلامی کو اپنی اولاد اور نئی نسل کی بنیادی دینی تعلیم کی ذمہ داری غذا اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے برابر بلکہ ان سے زیادہ ہی کرنی ہوگی اس کے لئے آزاد مکاتب ومدارس کا قیام گھروں میں دینی ماحول پیدا کرنے خواتین

دستورات کے ذریعہ بنیادی عقائد سے واقف کرنے کا اہتمام اسی طرح انبیاء و رسل کی خصوصیت کے ساتھ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت و سیرت سے نہ صرف آشنا اور متعارف بلکہ گرویدہ و معتقد بنانے کی کوشش اور ایمان و توحید کی محبت کفر و شرک سے نفرت اور غیر اسلامی طور طریق سے وحشت ان کی گھٹی میں اتارنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے بنیادی عقائد جن پر دین کی بنیاد ہے اور ایمانیات کے کسی جز سے انکار جس طرح ایک آدمی کو دائرۂ اسلام سے دائرۂ کفر میں پہنچا دیتا ہے غور کرنے کی بات ہے کہ ان اجزاء ایمان سے واقفیت کتنا اہم ہوگا۔ صورت حال یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور ہماری قوم کی نئی نسل کی اکثریت ان بنیادی عقائد سے ناواقف ہے۔ اسی طرح روزمرہ کے مسائل اور شریعت کے وہ حصے جن سے زندگی میں عمومی طور پر ہر ایک کو سابقہ پڑتا ہے۔ اس کو عمومی اشاعت کی طرف کتنی توجہ کی ضرورت ہے۔

مشہور حدیث نبوی طلب العلم فریضة علی کل مسلم سے حصول علم کی عام طور پر فرضیت سے اکثر علماء نے بنیادی تعلیم مراد لیا ہے۔

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان اپنی اولاد کے چند روزہ زندگی کے آرام و آسائش ذریعہ معاش اور وقار کے لئے تو سوچ سوچ کر گھلتا رہے مگر اپنی اسی محبوب اولاد کے قبر و حشر اور آخرت کی زندگی کے بارے میں کوئی فکرمندی نہ ہو۔ حاصل یہ کہ پوری ملت میں دین کی بنیادی تعلیم کا عمومی نظم ہونا اور اس کے لئے انتظام کی طرف توجہ دینا جہاں علماء کرام اور ذی ہوش لوگوں کی ذمہ داری ہے، وہیں عام مسلمان بھی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء کرام تشریف لائے ہیں سب سے پہلے انہوں نے اپنے اہل و عیال اور اپنی قوم کو بنیادی عقیدے کی دعوت

دی اور انھوں نے بنیادی تعلیم کی طرف مشترکہ طور پر توجہ دی ہے۔

متعدد انبیاء کرام کی یہ مشترکہ دعوت (یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ) قرآن نے بیان کیا ہے، اسی طرح خدا کی صفت خبیر اور لطیف اور انسانی زندگی کے حساب وکتاب اور میدان حشر میں جوابدہی کا تصور حضرت لقمان نے اپنے بچے سے نہایت پیارے انداز میں ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہے، "یبنیّ انھا ان تک مثقال حبۃ من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السموٰت او فی الارض یات بھا اللہ ان اللہ لطیف خبیر" (لقمان)

اے میرے پیارے بیٹے اگر رائی کے دانے کے برابر کوئی گناہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا آسمان وزمین میں ہوگا تو خدا کے علیم وخبیر قیامت کے دن اس کو حاضر کر دے گا اس لئے کہ وہ انتہائی باریک بیں اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے،

ملک میں بنیادی دینی تعلیم:

یوں تو ملک کے ہر چھوٹے بڑے مدارس بنیادی دینی تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

معیاری جامعات:

بڑے مدارس جہاں معیاری تعلیم ہوتی ہے، اور اس پر زور بھی دیا جاتا ہے ان معیاری مدارس میں ان طلباء اور اساتذہ کی اہمیت بھی ہے جو اعلیٰ تعلیم دے رہے ہیں۔ مگر جو بڑے ادارے ہزاروں کی تعداد میں علماء اور فضلاء وحفاظ کرام تیار کر رہے ہیں ان کی اکثریت مسلمانوں کی چھوٹی بڑی آبادی میں مسلمان بچوں اور بچیوں کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کی خدمت میں مشغول نظر آتی ہے، بہت ہی پسماندہ

بستیوں میں بہت کم تنخواہوں پر ذی استعداد علماء اور حفاظ و قراء خدمت انجام دے رہے ہیں، اس کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے بڑے مدارس دراصل مکاتب اور چھوٹے مدارس کے لئے افراد سازی کا کام کر رہے ہیں، اسی طرح ان میں بہت سے معیاری مدرسوں کے زیر انتظام اور زیر نگرانی ان کے علاقوں میں مکاتب چل رہے ہیں یا بنیادی تعلیم کے لئے ان کی متعدد شاخیں چل رہی ہیں۔

مستقل بنیادی تعلیم کے لئے نظام :

ہندوستان میں ناچیز کے ناقص علم کے مطابق بہت سی تنظیمیں اور مستقل کمیٹیاں ہیں، جو صوبائی اور ضلعی پیمانے پر مسلمان بچوں اور بچیوں کی بنیادی تعلیم کے لئے مکاتب کا نظام چلا رہے ہیں، جیسے دینی تعلیمی کونسل، مجلس دعوت الحق، جمعیۃ حزب اللہ بہار۔

بڑے شہروں میں مساجد کا نظام :

ہندوستان میں ہر بڑے شہر بمبئی، دلی، کانپور، لکھنؤ وغیرہ میں اکثر مساجد میں مکاتب کا نظام چل رہا ہے، جن میں مسجدوں کے امام یا دوسرے معلمین بنیادی تعلیم کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

دیہاتوں میں خود کفیل مکاتب :

دیہاتوں میں بھی مسلمان مکاتب کا نظام چلا رہے ہیں، اس کے علاوہ گورنمنٹ پرائمری اسکولوں کا نظام چلا رہی ہے، مگر افسوس اور غور طلب بات یہ ہے کہ دیہاتوں میں تعلیمی ماحول نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کے اکثر بچے ان مکاتب سے فائدہ نہیں

اشارہ ہے، اسی طرح شہروں میں بھی اکثریت دینی بنیادی تعلیم سے محروم رہ جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ گھروں میں کہیں معلم کے ذریعے برائے نام تعلیم دلائی جا رہی ہے، مگر غریب طبقہ کی اولاد دیہاتوں سے شہروں میں آکر ہوٹلوں، موٹر گیراجوں اور اسی طرح کے فریلی کاموں میں لگ جاتی ہے۔

غرضیکہ بلا امتیاز مسلمانوں میں تعلیم کی اہمیت کے نہ ہونے کے سبب کافی بچے بنیادی دینی تعلیم سے محروم رہ کر پوری زندگی غیر اسلامی گذارتے ہیں۔

اگر ہمارے گھروں میں ہر باپ اپنی اولاد کے لئے خوراک پوشاک کے ساتھ اسلامی عقائد و اعمال کو ان کی روحوں میں پیوست کرنے اور ان کے دل و دماغ کی گہرائی میں اتارنے کی طرف متوجہ رہے اور اس ذمہ داری کا احساس اس پر طاری رہے، تو کیا عجب ہے کہ کوئی مسلمان بچہ ماں کی گود اور گھر کے ماحول سے اس طرح اسلامی تعلیمات و فکر کا حامل اور اسلامی زندگی کا شیدائی نہ بن جائے کہ کوئی باد سموم اس کے ایمان و عقیدہ کو جھلسا سکے اور کوئی طوفان اس کے ایمان سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے

اللہ کے رسول صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد اور زیر اثر لوگوں کی دین و شریعت اور ضرورت کے سلسلے میں نگہبانی اور نگرانی کے فریضہ کو یاد دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا: "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" (مشکوٰۃ) تم میں کا ہر شخص نگہبان ہے اور ہر ایک سے اپنے زیر اثر لوگوں کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ شوہر سے بیوی کے سلسلے میں باپ سے اپنی اولاد کے بارے میں گھر کے سرپرست سے گھر والوں کے سلسلے میں مکھیا چودھری سے اپنے شہر اور گاؤں کے لوگوں کے سلسلے میں بادشاہ سے اپنی رعایا کے بارے میں۔

اس ذمہ داری کو کسی ایک طبقہ کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر بڑا اپنے چھوٹوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہے اور یہ ذمہ داری اپنے اپنے دائرہ میں مخصوص فریضہ

فرض کے درجے میں ہے اس لئے کہ اس ملت کے لئے جس کے لئے خدائی تعلیم اور ایک مقبول و متعین دین پر نہ صرف جینا اور مرنا ضروری ہے بلکہ اپنی اولاد و نسل کے لئے یہ انتظام و اطمینان بھی ضروری ہے کہ وہ بھی اسی متعین و مقبول دین پر زندگی گذارے گی اسی لئے قرآن میں حکم دیا گیا" واعبد ربك حتیٰ یاتیك الیقین" اپنے رب کی بندگی کرو یہاں تک کہ موت آجائے۔ تو جس طرح آخری دم تک عبدیت و اطاعت فرض ہے اور دین اسلام کے ساتھ ایسا تمسک اور شریعت میں تصلب کہ موت اسی مذہب و دین پر آئے" ولا تموتن الا وانتم مسلمون" نہ مرو مگر تم اسلام کی حالت یا استقامت علی الدین یہ ہے کہ ہر حال پر اس آسمانی شریعت پر قائم رہے اور قائم رکھنے کی حکمت عملی اختیار کرے۔ اس ہدایت کے ساتھ ملت اسلامیہ کے ہر بچے کو بالخصوص اپنی اولاد کو کم از کم بنیادی دینی تعلیم سے آگاہ کرنا یہ اسی ہدایت کا اہم حصہ ہے اور اس سے غافل رہکر اپنی عبادت و طاعت پر مطمئن ہو جانا روح شریعت اور نشاء خداوندی سے لاعلمی یا اعراض ہے۔ اس لئے دین کے دوسرے نظام کے ساتھ اس ملک کے اندر مسلمان بچوں کے لئے بنیادی دینی تعلیم کا منظم اور منصوبہ بند نظام کے لئے جد وجہد میں نہ یہ کہ ملت کے صرف علماء کرام کی یہ ذمہ داری ہے بلکہ قوم کے تمام طبقوں، تنظیموں اور اداروں کی یہ ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں بنیادی طور پر غور کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں بنیادی دینی تعلیم جو شرعاً صد فی صد ضروری ہے۔ موجودہ حالات میں ہمارے مذکورہ نظام سے کتنا فی صد کام ہو رہا ہے اور بقیہ کے لئے کون سا نظام مؤثر اور دوررس ہو سکتا ہے اس نکتہ پر غور کرتے ہوئے قوم کے بچوں کی مختلف حالتوں کا اندازہ کرنا اور انکے مختلف حالات کے اعتبار سے نقشہ مرتب کرنا ہی قابل عمل ہو سکتا ہے۔

اس ناچیز کی ناقص رائے میں نئی نسل کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ وہ بچے جو کمسنی میں غیر مسلم انتظامیہ کے تحت قائم نرسری اسکولوں کانونٹوں میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔

۲۔ وہ بچے جو بچپن ہی میں موٹے چھوٹے کاموں میں لگا دیئے جاتے ہیں۔

۳۔ وہ بچے جن کے والدین یا سرپرست ان کے لئے گھروں پر بنیادی دینی تعلیم کے لئے استاذ کا نظم کرتے ہیں۔

۴۔ وہ نوجوان جو اسکولوں کالجوں میں بچپن ہی سے داخل ہونے کے سبب بنیادی دینی تعلیم سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں۔

۵۔ وہ نوجوان یا عمر دراز لوگ جو اپنی یا سرپرستوں کی کوتاہی سے بنیادی تعلیم سے محروم رہ گئے۔

ان پانچ قسموں میں بنیادی دینی تعلیم کو عام کرنے کی مہم میں الگ الگ انداز میں کام کرنے سے ہی کامیابی مل سکتی ہے۔ ناچیز کی رائے میں مندرجہ ذیل تجویزوں پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ نرسری اسکولوں اور کانونٹوں میں داخل چھوٹے بچوں کے لئے اسی قسم کے متبادل نرسری اسکول کا نظام جن میں انگریزی اور جدید تعلیم کے ساتھ عقائد اور بنیادی دینی تعلیم کا عنصر غالب عنصر شامل ہو اور ان کی تربیت کے لئے اسلامی ماحول فراہم ہو۔

۲۔ دوسری قسم کے بچوں کے والدین میں تعلیم کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ ان میں اولاد کی تعلیم و تربیت کا احساس فرض پیدا کر کے انھیں مکاتب و دینی مدارس میں داخل کرنے پر آمادہ کیا جائے ساتھ ہی ان بچوں کے لئے سہولتوں اور اوقات کے ذریعہ بنیادی دینی تعلیم کا نصاب جو عقائد پر مشتمل ہو انکے لئے فراہم کیا جائے

۳۔ ٹیوشن کے ذریعہ پڑھائے جانے والے بچوں کو بنیادی دینی تعلیم کا ایسا نصاب

جو ضروری عقائد اور روزمرہ کے مسائل اور سیرت طیبہ پر مشتمل ہو۔

۴۔ عصری تعلیم گاہوں میں داخل طلباء کو صباحی یا مسائی یا ہفتہ وار پروگرام کے ذریعہ بنیادی دینی تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔

۵۔ عمر دراز تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ کاروبار میں مشغول لوگوں کے لئے جزوقتی نظام تعلیم مؤثر ہو سکتا ہے۔

امت اسلامیہ ہند کے اندر اسلام کی بنیادی تعلیم لوگوں کے مختلف احوال و ظروف کے اعتبار سے عام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منصوبہ بند طریقے سے جدوجہد کی جائے اس سلسلے میں پورے ملک کے ارباب حل وعقد کی ایک مرکزی رابطہ کمیٹی برائے بنیادی دینی تعلیم تشکیل دی جائے جس کی ذمہ داری یہ ہو کہ ملک کی دوسری تمام ریاستوں میں ریاستی رابطہ کمیٹی کی تشکیل دے کر اس کو ضلع اور بلاک کی سطح پر فعال بنائے اس نظام تعلیم کو رائج کرنے کے لئے ہر علاقے کے دینی مدارس کے ذمہ داروں باثر علماء کرام اور علم دوست افراد کا تعاون حاصل کرے اور باہم مشورے اور معاونت سے اس کو انجام دینے کی جدوجہد کرے اسی طرح ہر ضلع کو جغرافیائی طور پر تقسیم کرکے اس پر ایک نگراں کمیٹی مقرر کرے اگر اس نظم اور منصوبہ بند طریقے سے اس اہم کام کو کرنے کے لئے لوگ تیار ہو گئے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ ہم آئندہ کچھ سالوں میں اپنی نئی نسل کو کم از کم بنیادی دینی تعلیم سے صد فی صد واقف کرانے میں کامیابی حاصل کرلیں گے۔

ختم شد

اُردو کے چند مشہور شعراور انکے ناظم

پہلی قسط

عبدالرؤف خاں ایم اے۔ اُدے پور کلاں (راجستھان)

اردو کے بہت سے اشعار یا مصرعے زبان زد عوام وخواص ہیں۔ لیکن عوام کو بالعموم اُن اشعار کے کہنے والے شعراء کا یا تو نام معلوم نہیں یا غلط طور پر کسی اور شاعر سے منسوب کرتے ہیں مصرعوں کے ساتھ یہ بات زائد ہے کہ مکمل شعر یاد نہیں ہوتا۔ یہاں صرف چند اشعار اور مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ جن کی تخریج یا تو متعلقہ شاعر کے دیوان یا راقم کے محدود ذخیرۂ کتب میں موجود تذکروں سے کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بعض رسائل وجرائد سے بھی مدد لی گئی ہے۔

درج ذیل شعر جسے عام طور پر بسمل رام پرشاد سے منسوب کیا جاتا ہے؛

(۱) سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

دراصل شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی غزل کا مطلع ہے۔ یہ غزل شاعر موصوف نے کلکتہ کے ۱۹۲۱ء کے کانگریس سیشن میں پیش کی تھی۔ مکمل غزل ملاحظہ خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۱۰۲ صفحہ ۴۴۲ پر۔

(۲) غافل مجھے کرتا ہے، یہ گھڑیال منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

یہ شعر بہت مشہور ہے اور کچھ لوگ اسے " غافل تجھے کرتا ہے۔۔۔۔ الخ " قرأت کے ساتھ اپنے گھڑیال کے اوپر بھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ شعر محمد اکرام آشنا کا ہے۔ (ر۔ک۔ تین تذکرے

از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص ۲۰۳ بحوالہ طبقات الشعرا ص ۲۹۲)

(۳) قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیوں کر

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

امیر مینائی (انتخاب یادگار ص ۴۴ طبقۂ دوم)

اس شعر کو جسٹس سید محمود نے اپنے ایک فیصلہ میں بھی استعمال کیا تھا۔ پہلے مصرع میں عام طور پر "قتل" کے بجائے "خون" مشہور ہے۔

(۴) وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں

اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

میر فتح علی شیدا (تذکرہ مسرت افزا ص ۱۳۶)

مصرعِ اولیٰ کو اس طرح بھی پڑھا جاتا ہے ؏ وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں۔ جو درست نہیں ہے۔

منشی کرامت علی شہیدی کا ایک شعر اس طرح مشہور ہے:

(۵) اُس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر

تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

لیکن مصرعِ اولیٰ کی صحیح قرأت ہے:۔ عام ہیں اُس کے[1] تو الطاف شہیدی سب پر

(سخن شعرا ص ۲۶۳)

نواب محمد علی خاں رشکی ابن نواب شیفتہ کا مشہور شعر ہے:

(۶) یہ منصبِ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں (سخن شعرا ص ۱۸۵)

---

[1] "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" میں: عام ہے اس کا تو الطاف شہیدی سب پر" لکھا ہے۔ ص ۳۵

پہلے مصرع کو عام طور سے: یہ رتبۂ بلند ملا ... الخ

(۷) برگِ حنا پہ جاکے لکھوں دردِ دل کا حال
شاید کہ رفتہ رفتہ لگے دلربا کے ہاتھ (نامعلوم)

یہ شعر قطعی طور پر مصطفیٰ قلی خاں یکرنگ کے مندرجۂ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:-

برگِ حنا اوپر لکھو احوالِ دل میرا شاید کبھو تو جا لگے اُس دلربا کے ہاتھ
(تذکرہ شعرائے اردو ص ۲۰۷)

تذکرۂ شورش ص ۴۳۵ پر مصرعِ ثانی میں "کبھو" کی بجائے "کبھی" ہے لیکن تذکرہ مسرت افزا کے ص ۲۶۲ پر دوسرا مصرع یہ لکھا ہے ع شاید کبھی تو جا کے لگے دلربا کے ہاتھ
اس سلسلہ میں حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے:-

برگِ حنا پہ یارو میرا حالِ دل لکھو
شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ
(تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۸۴)

آتش (خواجہ حیدر علی) کا بہت مشہور شعر ہے:

(۸) بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا (کلیاتِ آتش ص ۱۳ مطبوعہ ۱۸۸۰ء)

لوگ پہلے مصرع کو "بہت شور سنتے تھے ... الخ" پڑھتے ہیں[۱]

(۹) فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
(بالاجی تریبک نانک ذرہ (سہو وسرقہ ص ۱۳۱ مصنفہ علامہ کالیداس گپتا رضا)

[۱] یہ شعر میر سے بھی منسوب ہے اور انکی کلیات میں بھی موجود ہے (ملاحظہ ہو کلیاتِ میر ص ۱۰۴۴ مرتبہ رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد ۱۹۷۲ء) لیکن فی الحقیقت یہ شعر بالاجی تریبک نانک ذرہ کا ہے

درج ذیل شعر کو عموماً میر سے منسوب کیا جاتا ہے :

(۱۰) وہ آیا بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

لیکن حقیقت میں یہ شعر مہاراج بہادر برق لکھنوی کا ہے :

وہ آیا بزم میں اتنا تو برق نے دیکھا پھر اس ..... (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۴۳)

سید محمد خاں رند کے درج ذیل دو شعر عام طور پر سننے کو مل جاتے ہیں :

(۱۱) آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دوسرا شعر :

(۱۲) کیا ملا عرض مدعا کر کے بات بھی کھوئی التجا کر کے (دبستان آتش ص ۳۴۹،۱۱)

حکیم تجمل رسول خاں تجمل دہلوی کا ایک شعر ہے جو زبانوں پر نہ چڑھ سکا :-

(۱۳) بعد فنا جنازے پر آیا نہ جائے گا
اونسے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا (سخن شعرا ص ۸۲)

لیکن داغ کا یہ شعر تقریباً ہر ایک اردو داں کی زبان پر رہتا ہے :-

دل کیا ملاؤ گے کہ ہمیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

(۱۴) عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس برمحل مصرعے سے کون واقف نہیں۔ یہ مرزا محمد علی عرف مرزا بچو المتخلص بہ فدوی کے شعر کا ثانی مصرعہ ہے۔ مصرعِ اول ہے : چل ساتھ کہ حسرت دلِ مغموم سے نکلے (انتخاب مرتبہ ازقطب الدین باطن ص ۸۰)۔ لیکن غلام ہمدانی مصحفی نے پہلے مصرعے کی قرأت یہ لکھی ہے۔

ہو ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے ۔ (تذکرۂ ہندی از مصحفی ص ۱۷۴)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے "گلشنِ بےخار" کے صفحہ ۱۴۸ پر پہلا مصرع اس طرح لکھا ہے: چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے

کریم الدین نے بھی اپنے تذکرے "طبقاتِ شعرائے ہند" صفحہ ۱۷۴ پر مذکورہ قرأت ہی لکھی ہے یعنی: چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے. لیکن عبدالغفور نساخ نے فدوی کا مطلع سب سے الگ دیا ہے:۔

ٹک ساتھ ہو حسرت دلِ مغموم سے نکلے

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے[1] (سخنِ شعراء ص ۳۶۰)

لیکن درست وہی ہے جو مصحفی نے لکھا ہے ۔ جناب کالیداس گپتا رضا نے بھی سہو و سراغ ص ۱۳۱ پر بحوالہ دو تذکرے تذکرۂ عشقی ۲: ۱۳۵/ع "ہو ساتھ کہ حسرت دل مرحوم سے نکلے" ہی لکھا ہے ۔

مشہور مطلع ہے:

(۱۵) کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر { منولال صفا لکھنوی
فعل بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر { سہو و سراغ ص ۱۳۲ }

یہ شعر مصرعِ ثانی میں معمولی تبدیلی کے ساتھ انشا کے دیوان میں بھی ملتا ہے یعنی:

فعل بد تو اُن سے ہو لعنت کریں شیطان پر (کلام انشا ص ۹۶ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

(۱۶) زبان زد مصرع ہے:

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مکمل شعر اس طرح ہے:۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

---

[1] صاحب جواہرِ سخن بھی اسی قرأت کے ساتھ لکھتے ہیں: ٹک ساتھ ہو حسرت دلِ مغموم سے نکلے ۔۔۔ (۱: ۲۵۸)

اور یہ شعر نواب محمد یار خان امیر ٹانڈوی کا ہے (ملاحظہ ہو تین تذکرے ص ۱۸۱ بحوالہ طبقات الشعراء الف ۱۸۹)

(۱۷) مرزا عظیم بیگ عظیم کا ایک شعر ہے:۔

شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق — وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

(ماہنامہ نیا دور اودھ نمبر ص ۱۱۶ فروری، مارچ ۱۹۹۴ء)

اس شعر کا پہلا مصرع بالعموم اس قرأت کے ساتھ مشہور ہے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

لیکن راقم اس کی تخریج سے قاصر رہا۔

(۱۸) مصرع: "اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی" عام طور سے ہر شخص کی زبان پر رہتا ہے۔ لیکن مصرع اولیٰ اور شاعر کے نام سے عوام میں شاید ہی کسی کو علم ہو۔ دراصل مکمل شعر یوں ہے:

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

اور شاعر لالہ مادھو رام جوہر ہیں (سہ ماہی نوائے ادب بمبئی ص ۱۲۶ اپریل ۱۹۹۶ء)

(۱۹) در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں (نواب واجد علی شاہ اختر)

(۲۰) زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہ شعر عام طور پر اسی طرح مشہور ہے۔ لیکن مصرع اولیٰ درحقیقت یوں ہے:

"بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ"

اور یہ شعر ثاقب لکھنوی کے ذہن رسا کی پیداوار ہے (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ ص ۱۷ فروری ۱۹۹۵ء) لیکن "نیا دور" اودھ نمبر ص ۱۱۷ پر پہلا مصرع یہ ہے:۔

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا

(۲۱) "کمر" کے موضوع پر اردو شعراء نے بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ شعر ہے:۔

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے   کہاں ہے، کس طرف کو ہے کدھر ہے

محمد حسین آزاد نے اسے جرأت سے منسوب کیا ہے (دیکھئے تذکرہ آبِ حیات ص ۲۳۲ مطبوعہ اردو اکادمی لکھنؤ)

لیکن حقیقت میں یہ شعر شاہ نجم الدین مبارک آبرو کا ہے، جو اس طرح ہے:۔

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے   کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

(دیوانِ آبرو ص ۲۴۶ ۱۹۹۰ء)

(۲۲) "کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو"، یہ مصرع ایک فلم کے گانے میں شامل ہونے کے سبب بچے بچے کی زبان پر ہے۔ مگر جس شعر کا یہ مصرع ہے وہ ایک صاحبِ نسبت بزرگ حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸-۵۹ء) کا ہے:۔

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو   (ماہنامہ برہان دہلی[1])

(۲۳)   وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

مذکورہ مصرع غلام ہمدانی مصحفی کے درج ذیل شعر کا ہے:۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عید قرباں   وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

(دیوانِ مصحفی ص ۵۸ پٹنہ)

یہ شعر اس طرح بھی مشہور ہے اور محمد حسین آزاد نے اسے انشا سے منسوب کیا ہے:۔

---

[1] ڈاکٹر مسعود انور (علیگ) نے اپنے ایک مضمون میں جو کاکوری کے بزرگانِ دین سے متعلق تھا، یہ شعر لکھا ہے۔ مضمون "برہان" کے کسی شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ سرِدست اُس شمارہ تک رسائی نہ ہو سکی۔

یہ عجب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا[1]

(آب حیات ص ۲۹۴)

لیکن تعجب کہ ترجمۂ مصحفی میں بھی آزاد نے یہ شعر لکھا ہے:

میں عجب یہ رسم دیکھی مجھے روز عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

(آب حیات ص ۳۱۸)

(۲۴) عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گذرتی ہے
(گل رعنا ۲۶۰ بادشاہ شاہ عالم آفتاب)

(۲۵) انتہائی مشہور شعر ہے:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار جب کبھی گردن جھکائی دیکھ لی

(موجی رام موجی۔ سہو و سراغ ص ۱۳۲)

دوسرا مصرع: "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی" قرأت کے ساتھ زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔

(۲۶) بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

یہ مصحفی کا شعر ہے لیکن صحیح یہ ہے

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے

(دیوان مصحفی ص ۲۴۹ پٹنہ)

(۲۷) درج ذیل شعر کو سودا سے منسوب کیا جاتا ہے:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

---

[1] تعجب ہے کہ مولانا عبدالحیٔ صاحب نے بھی اسے انشا سے منسوب کیا ہے: یہ عجب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں۔۔۔ الخ (ملاحظہ ہو تذکرہ گل رعنا ص ۲۶۶) جبکہ یہ تذکرہ آزاد کے اغلاط پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ لیکن انشا کے دیوان کے کسی قلمی نسخے میں یہ شعر نہیں ملتا (دیکھئے کلام انشا مرتبہ مرزا محمد عسکری و محمد رفیع ص ۲۰)

(نغمۂ عندلیب از قطب الدین باطن ص ۱۱۱)

لیکن اس شعر کے ناظم قائم چاند پوری شاگردِ سودا ہیں اور اصل شعر اس طرح ہے:

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ　　کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
(جواہرِ سخن ۲: ۲۰۹)

مصرعِ ذیل کافی مشہور ہے:

(۲۸)　　یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

یہ مصرع حضرت مظہر جان جاناںؒ کے اِس شعر کا ثانی مصرع ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے　(گلشنِ بے خار ص ۱۸۳)

حضرت جان جاں ہی کا ایک اور شعر ہے:

(۲۹)　　یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا　(تذکرۂ شورش ص ۴۸۱)

(۳۰)　　وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

یہ میر نظام الدین ممنونؔ کے درج ذیل شعر کا مصرعِ ثانی ہے:

تفاوت قامتِ یار و قیامت میں ہے کیا ممنونؔ
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے　(گلشنِ بے خار ص ۱۹۱)

(۳۱) ممنونؔ ہی کا یہ شعر بھی شہرت رکھتا ہے:-

زبانِ نازہ نعش مری دیکھ کر کہا　　گردن پہ کس کی خون ہے اس بے گناہ کا (ایضاً ص ۱۸۸)

(۳۲) صاحبِ "تذکرہ مسرت افزا" نے مندرجہ ذیل شعر میرزا ابراہیم مشتاقؔ سے منسوب کیا ہے۔

غزالو تم تو حاضر ہو کہو مجنوں کے ماتم میں
دِوانہ مر گیا جس وقت اُسے خانہ پہ کیا گزرا　(ص ۲۴۳)

لیکن اصل میں یہ شعر راجہ رام نارائن موزوںؔ صوبیدارِ عظیم آباد (پٹنہ) کا ہے جیسے

موزوںؔ نے نواب سراج الدولہ کی جنگ پلاسی میں شہادت کی خبر سنکر کہا تھا :

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذرا

(تذکرۂ شعرائے اردو از میر حسن ص ۱۵۸)

جناب محمد عمر صاحب (نور الٰہی) نے بھی اپنی تصنیف "سراج الدولہ" میں مذکورہ تذکرہ کے حوالے سے اس شعر کو موزوںؔ ہی سے منسوب کیا ہے (دیکھئے ص ۲۴۵) مگر مصرعۂ ثانی کے آخری لفظ "گزرا" کی بجائے "گزری" لکھا ہے۔

موزوںؔ کو بعد ازاں نواب میر قاسم نے گنگا میں غرق کرا دیا (یادگارِ شعرا از اسپرنگر ص ۲۰۱)

(۳۳) کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

محمد رضا برقؔ کا مصرع ہے۔ مکمل شعر ہے :

اذاں دی کعبے میں، ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

(جواہر سخن ۳ : ۴۰۲ مؤلفہ مولوی محمد یسن کیفیؔ)

(۳۴) دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (آب حیات ص ۱۶۳)

صاحبِ تذکرۂ آبِ حیات مولانا محمد حسین آزادؔ نے اسے ایک ۱۲، ۱۳ سالہ لڑکے سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کالی داس گپتا رضاؔ نے اسے پنڈت مہتاب رائے تاباںؔ کے درج ذیل شعر کی ترقی یافتہ شکل بتلایا ہے :

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(سہو و سراغ ص ۱۳۰ و ۱۳۱)

کاش مندرجہ بالا "ترقی یافتہ شکل" شعر کی تخریج بھی رعنا صاحب فرما دیتے۔

(۳۵) ٹوٹی ہت مسجد بنی مسمار بت خانہ ہوا

جب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ ہوا

ڈپٹی کلکٹر عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرے "سخن شعرا" میں مذکورہ شعر کو ناظم اکرام الدین نادر کو قرار دیا ہے (ص ۴۹۳) لیکن درحقیقت یہ شعر پیرا علی علی اعلیٰ کا ہے ۔ توڑ بت زاہد نے کیوں مسجد یہ بت خانہ کیا

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

(تذکرۂ شعراء اردو میر حسن ص ۲۹)

ابوالحسن امیرالدین احمد نے بھی تذکرہ مسرت افزا، صفحہ ۴۸ پر اعلیٰ کے ترجمہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ لیکن دوسرا مصرع: بت تو اک صورت بھی تھی ... آخرہ لکھا ہے

(۳۶) نہ کر عوض مرے جرم و گناہِ بے حد کا

الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں

خواجہ محمد وزیر (جواہر سخن ۳ : ۳۷۵)

لیکن عام طور پر مشہور اس طرح ہے :

نظر نہ کر مرے جرم و گناہ بے حد پر ...

تمہیں غیروں سے کم فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی

چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

(جعفر علی حسرت ۔ دلی کا دبستان شاعری ص ۲۶۶)

لیکن سعادت خان ناصر نے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں مذکورہ مطلع کی قرأت یہ بتلائی ہے :

تمہیں عالم سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی

غرض اب ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی (ص ۱۰۸)

عوام میں مطلع کے بجائے بصورت بیت یوں مشہور ہے:

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

(۳۷) جعفر علی حسرت ہی کا ایک اور شعر ہے :-

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے ٭ لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے
(تذکرۂ ہندی ص ۸۴، تذکرہ مسرت افزا ص ۸۱ نیز سخنِ شعرا ص ۱۲۸، گلشنِ سخن ص ۱۱۴)

لیکن کریم الدین نے طبقاتِ شعرائے ہند میں مصرعِ ثانی کی قرأت بتغیرِ خفیف یہ لکھی ہے :-

لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے۔ (ص ۲۵۲)

میر دوست علی خلیل کا غلو کی مثال میں بہترین شعر ہے :-

(۳۸) رونے پہ باندھے جو سری چشم تر کمر
کیسی زمیں فلک پہ ہو پانی کمر کمر (سخنِ شعرا ص ۱۵۱)

کسی کے انتقال پر بالعموم یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے :-

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مکمل شعر ہے :-

(۳۹) خبر سن کر مرے مرنے کی وہ بولے رقیبوں سے
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں (داغ)

(دیوانِ داغ ص ۱۰۸)

داغ کے سینکڑوں اشعار ضرب المثل کی طرح مشہور و معروف ہیں مثلاً :

(۴۰) ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
(دیوانِ داغ مرتبہ محمد علی زیدی ص ۱۳۱)

خواجہ حیدر علی آتش کے درج ذیل شعر کو سادگی کے مفہوم میں عام طور پہ مستعمل
رہتے ہیں :-

(۴۱) تکلف سے بَری ہے حسنِ ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

(کلیاتِ آتش دیوان اول ص ۲۳۰)

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ذیل میں درج شعر زبان زد ہے :-

(۴۲) فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستاں کے لیے (دیوان شیفتہ ص ۱۲۵)

دوسرا مصرع عوام میں اس طرح مشہور ہے :-

بڑھا ہی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے

(۴۳) جو طبیب اپنا تھا، اُس کا دل کسی پر زار ہے
مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

(سودا۔ کلیاتِ سودا مرتبہ ڈاکٹر اسرت لعل عشرت ص ۸۶:)

ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھی مذکورہ قرأت ہی لکھی ہے (دیکھئے رجب علی بیگ سرور
چند تحقیقی مباحث ص ۷۶) لیکن ڈاکٹر محمد حسن نے پہلے مصرع کی قرأت معمولی تبدیلی
کے ساتھ یہ لکھی ہے :-

جو طبیب اپنا تھا دل اُس کا کسی پر زار ہے

(کلیاتِ سودا جلد اول ص ۲۷۶، نئی دہلی ۱۹۸۵ء)

ایک برمحل مصرع ہے :

(۴۴) اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ مصرع مولوی وحیدالدین احمد خاں وحید الہ آبادی کی غزل کا مطلع ہے :-

کچھ کہہ کے اُس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

(دراسات از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص ۱۸۱) (باقی آئندہ)

سرپرست اعلیٰ
عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر
جامعہ ہمدرد
نگران اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی
مارچ و اپریل ۱۹۹۷ء
برہان
جلد ۱۲۰ شمارہ ۱۶/۱۵
اس شمارے میں
نظرات عمیدالرحمان عثمانی ۲
اشاعت کے دو اہم ذرائع ۷
مفتی عزیزالرحمان چمپارنی
جامعہ نگر اوکھلا دہلی ۲۵
اردو کے چند مشہور شعرا اور انکے ناظم ۲۱
عبدالرؤف خاں ایم۔ اے (راجستھان)
تحریک ہجرت، جنگ آزادی کا ایک بھولا ۲۹
دسرا باب
مختار احمد مکی صدر شعبۂ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور (بہار)
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر ایک عظیم سمینار ۳۸
مجلس ادارت اعزازی
سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی
دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

متحدہ محاذ حکومت کے وزیر خزانہ مسٹر چدمبرم نے ۹۸-۱۹۹۷ء کا سالانہ
بجٹ پیش کر دیا اس سے پہلے وزیر ریلوے مسٹر رام ولاس پاسوان نے ریلوے
بجٹ پیش کیا۔ دونوں بجٹ میں غریب عوام کو سہولیات فراہم کرنے کے دعوی تو
بڑھ چڑھ کر کئے گئے ہیں لیکن بجٹ کو باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر
بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ متحدہ محاذ کی حکومت بھی ہندوستان سے غریبی دور
کرنے کا کوئی جامع اور واضح خاکہ پیش کرنے سے عاجز و مجبور ہی رہی ہے اور کوئی
اس بات سے انکار نہیں کر سکے گا کہ جب بھی عام انتخابات کے بعد کوئی بھی حکومت
مرکز میں تشکیل پائی ہے اس نے سالانہ بجٹ میں وہ بھاری بھرکم ٹیکس لگائے ہیں کہ
عام آدمی کا ان ٹیکسوں کے وزن کے بوجھ سے کچومر ہی نکل گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ جب
بھی کسی ایک چیز پر ٹیکس لگتا ہے یا ریلوے میں کرائے بھاڑے کی مد میں اضافہ ہوتا
ہے تو اس کا اثر بازار میں بکنے والی ہر ہر چیز پر بالواسطہ یا بلا واسطہ ضرور پڑتا ہے
اگر پٹرول پر دام بڑھتے ہیں تو پٹرول سے چلنے والی گاڑیاں لبسیں وغیرہ جو مال ڈھوتی
ہیں ان میں اناج بھی ہوتا ہے سبزیاں بھی ہوتی ہیں دالیں اور مسالے بھی ہوتے ہیں
غرض روزمرہ کی ہر کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ خود بخود ہی مہنگی
ہو جائیں گی کیونکہ ان کی مال برداری پر زیادہ مصارف صرف ہو رہے ہیں تو پھر کون
ایسا ہوگا جو مال برداری کے مصارف خود برداشت کرے اور اشیائے ضروریہ

کاان بھاو داموں فروخت کرے۔ جب حکومت ہی غریبوں کے خیال سے غافل ہے تو تاجر حضرات غریبوں کے توجہ کو دیکھنے پر کیوں مجبور ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران جب تک غریبوں کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک غریبوں کے مسائل وہ کس طرح حل کرنے کے اہل بنیں گے۔ غریبوں کی جھونپڑی کا نظارہ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی ملک میں غربت و افلاس اعداد و شمار کے آئینے میں دیکھیں تو یہ بات طے شدہ ہے کہ ملک میں غریبی بہت بڑھ گئی ہے یہ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے جو کسی بھی طرح ایک صحت مند معاشرے کے لیے باعث تشویش و افسوسناک ہی ہے۔ اور اس کا جلد از جلد سدّ باب کے لیے سنجیدگی سے کوئی حل نہ سوچا گیا تو ملک کے بھیانک مستقبل کے تصوّر سے ہر محبِ وطن کا دل مشوش ہونا قدرتی بات ہے۔

ایک طرف ملک میں غریبی کا ختم ہونا خواب معلوم دے رہا ہے دوسری طرف ملک میں بڑے اسکنڈل جو اجاگر ہو رہے ہیں اس سے راجہ مہاراجوں کے خزانوں کے قصّے بھی ماند پڑتے نظر آرہے ہیں۔ ہزاروں کی تو اب کوئی گنتی ہی نہیں لاکھوں کی قیمت ہی گھٹ گئی کروڑوں و اربوں روپے کے گھوٹالے سن سن کر طبیعت عجیب و غریب خیالات و تصوّرات میں غرق ہو جاتی ہے۔ وزیروں اور سرکاری افسران اور ان سے متعلق اہالی موالی تک کروڑوں و اربوں روپیوں کے قصّوں کہانیوں سے الف لیلوی شہزادوں کی صف میں کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اب تو افسران و وزیروں کی ایک آدھ بیوی کا بھی قصہ اخبارات کی خبروں کی زینت بن رہا ہے۔ کیا آزادی ان ہی لوگوں کے لئے حاصل کی گئی تھی کہ وہ ملک کو خوب لوٹیں کھسوٹیں۔ کوئی انہیں چھیننے والا تک نہیں ہے۔ گاندھی جی بیچارے کھدر پوشی میں ملک کی بلند تقدیر دیکھ رہے تھے وہ چرخہ کات

کہات کرگم گم یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ ملک میں پہلے غریب عوام [illegible]
ملے اگر گاؤں کے لوگ کھدّر پہن رہے موٹا اناج کھا رہے ہیں تو شہروں کو بھی اسی طرح
کھدّر پہن کر اور موٹا اناج کھا کر مساوات کا سکّہ رائج کرنا چاہیئے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا
کہ آزادی کے بعد یہ سب تقریروں کی ہی باتیں رہ جائیں گی عملاً اس کے بالکل [illegible]
چالاک اشخاص سیاسی لیڈران ملک کی دولت پر اپنا حق سمجھ کر قابض ہوں گے اور
غریبوں کے حصّے میں وہ ہی ہوگا جو ان کا مقدّر بن چکا ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔ کہ آج بھی
ملک کے بیشتر گاؤں میں عورتیں پینے تک کا پانی روزانہ میلوں تک پیدل چل کر حاصل کرتی
ہیں اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے زندگی کی دوسری بنیادی ضروریات کے
حصول کے لیے انھیں کس طرح جدوجہد و تگ و دو کرنی پڑتی ہوگی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ساری برائیوں کی پیداوار کی واحد وجہ ملک میں اخلاص کا
فقدان انسانیت کی کمی اور خود غرضی کا دور دورہ ہی ہے۔ خود غرضی اور حرص و ہوس
ہمارے معاشرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب یہ چیزیں کسی کو نظر ہی نہیں
آتی ہیں ملک کے ارباب حل و عقد سوئے ہوئے ہیں انھیں فکر ہی نہیں ہے کہ سماج سے
اس برائی کو کیسے ختم کریں۔ حب الوطنی کا نعرہ تو بہت دیا جاتا ہے لیکن ہمارے سیاستداں
نہیں سمجھتے کہ حب الوطنی کا عملی تقاضہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ ملک میں ہر انسان مساوی درجہ
کا مالک ہو ہر شخص کو اس کی بنیادی ضرورت روٹی کپڑا امکان میسر ہو حکمراں طبقہ اخلاص
و بے غرضی کے ساتھ عوام الناس کی خدمت میں مگن ہو جب سیاستداں ہی اخلاص سے
عاری ہوں گے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ ایک عام انسان کہاں سے اخلاص کو حاصل کرے
گا۔ اخلاص کوئی ایسی شئے تو ہے نہیں کہ جسے بازار سے خرید کر لے آیا جائے۔ یہ تو انسانی
نفس کے اختیار کی چیز ہے اور جب انسانی نفس میں اخلاص کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہے

ملک کے عوام کی کس طرح خدمت ہو سکے گی، وہی اسکنڈل اور بدعنوانی کی بھرمار دیکھنے کو ملے گی جس سے غریب عوام کا جینا مشکل ہو رہا ہے۔

یوپی اسمبلی کے انتخابات ہوئے پانچ مہینے گزر چکنے کے بعد اب وہاں بی ایس پی اور بی جے پی کے اشتراک سے حکومت کی تشکیل ہو گئی ہے۔ بی ایس پی کی مایاوتی نے بطور وزیراعلیٰ یوپی کا حلف لیکر اپنی کابینہ بنالی ہے۔ جسمیں نصف نصف وزراء دونوں جماعتوں یعنی بی ایس پی اور بی جے پی کے ہوں گے اور چھ چھ ماہ بعد کے وقفے سے دونوں جماعتوں میں کسی ایک کو وزیراعلیٰ کا عہدہ ملے گا۔ اس حکومت سازی سے ایک بات صاف ہو گئی ہے کہ اب سیاست میں اصول کی بات بالکل بے میل بات ہو گئی ہے جو اصول کی بات کرتا ہے وہ بے وقوف ہے دقیانوسی ہے بی۔ ایس پی کل تک گلا پھاڑ پھاڑ کر بی جے پی کو فرقہ پرست، منو وادی، برہمن وادی پارٹی کہتی تھی مگر آج اسی کے سہارے وہ حکومت بنا رہی ہے اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہو گی اور بی جے پی کے نزدیک بی ایس پی ایک جاتی واد جماعت تھی جو ملک کے لئے خطرناک ہے کیا اس بی ایس پی کو اپنی حمایت دے کر اس نے ملک کے لئے خطرہ پیدا کیا اور جاتی واد کو بڑھاوا دینے کی اب وہ مجرم نہیں ہے کیا؟ کہنے اور کرنے میں فرق کی شرمناک مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا سیاستدانوں کی باتوں میں کہنے سننے اور عمل میں جو فرق دیکھنے میں آرہا ہے وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں شاید ہی ملا ہو۔ اب تو روزانہ ہی یہ دیکھنا ہم ہندوستانیوں کا مقدر بن گیا ہے۔

مائیکل جیکسن کے بعد اب یانی نے آگرہ میں سنگیت کے ایک پروگرام میں ہندوستان کے منچلے لوگوں کے دلوں میں مستی کا طوفان پیدا کر دیا۔ مائیکل جیکسن نے گذشتہ سال ۹۶ء

نظرات

متحدہ محاذ حکومت کے وزیر خزانہ مسٹر چدمبرم نے ۹۸-۱۹۹۷ء کا سالانہ بجٹ پیش کر دیا اس سے پہلے وزیر ریلوے مسٹر رام ولاس پاسوان نے ریلوے بجٹ پیش کیا۔ دونوں بجٹ میں غریب عوام کو سہولیات فراہم کرنے کے دعویٰ تو بڑھ چڑھ کر کئے گئے ہیں لیکن بجٹ کو باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر بآسانی پہنچا جا سکتا ہے کہ متحدہ محاذ کی حکومت بھی ہندوستان سے غریبی دور کرنے کا کوئی جامع اور واضح خاکہ پیش کرنے سے عاجز و مجبور ہی رہی ہے اور کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکے گا کہ جب بھی عام انتخابات کے بعد کوئی بھی حکومت مرکز میں تشکیل پائی ہے اس نے سالانہ بجٹ میں وہ بھاری بھرکم ٹیکس لگائے ہیں کہ عام آدمی کا ان ٹیکسوں کے وزن کے بوجھ سے کچومر ہی نکل گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ جب بھی کسی ایک چیز پر ٹیکس لگتا ہے یا ریلوے میں کرایے بھاڑے کی مد میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کا اثر بازار میں بکنے والی ہر ہر چیز پر بالواسطہ یا بلا واسطہ ضرور پڑتا ہے اگر پٹرول پر دام بڑھتے ہیں تو پٹرول سے چلنے والی گاڑیاں لبسیں وغیرہ جو مال ڈھوتی ہیں ان میں اناج بھی ہوتا ہے سبزیاں بھی ہوتی ہیں دالیں اور مسالے بھی ہوتے ہیں غرض روزمرہ کی ہر کھانے پینے کی چیزیں ہوتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ خود بخود ہی مہنگی ہو جائیں گی کیونکہ ان کی مال برداری پر زیادہ مصارف صرف ہو رہے ہیں تو پھر کون ایسا ہوگا جو مال برداری کے مصارف خود برداشت کرے اور اشیائے ضروریہ

کو ان ہی داموں فروخت کرے۔ جب حکومت ہی غریبوں کے خیال سے غافل ہے تو تاجر حضرات غریبوں کے بوجھ کو دھرنے پر کیوں مجبور ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے حکمران جب تک غریبوں کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک غریبوں کے مسائل وہ کس طرح حل کرنے کے اہل بنیں گے۔ غریبوں کی جھونپڑی کا نظارہ ائرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی ملک میں غربت و افلاس اعداد و شمار کے آئینے میں دیکھیں تو یہ بات طے شدہ ہے کہ ملک میں غریبی بہت بڑھ گئی ہے یہ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی ہے جو کسی بھی طرح ایک صحت مند معاشرے کے لیے باعث تشویش و افسوسناک ہی ہے۔ اور اس کا جلد از جلد سد باب کے لیے سنجیدگی سے کوئی حل نہ سوچا گیا تو ملک کے بھیانک مستقبل کے تصور سے ہر محب وطن کا دل مشوش ہونا قدرتی بات ہے۔

ایک طرف ملک میں غریبی کا ختم ہونا خواب معلوم دے رہا ہے دوسری طرف ملک میں بڑے اسکنڈل جو اجاگر ہو رہے ہیں اس سے راجہ مہاراجوں کے خزانوں کے قصے بھی ماند پڑتے نظر آ رہے ہیں۔ ہزاروں کی تو اب کوئی گنتی ہی نہیں لاکھوں کی قیمت ہی گھٹ گئی کروڑوں و اربوں روپے کے گھوٹالے سن سن کر طبیعت عجیب و غریب خیالات و تصورات میں غرق ہو جاتی ہے۔ وزیروں اور سرکاری افسران اور ان سے متعلق اہالی موالی تک کروڑوں و اربوں روپیوں کے قصوں کہانیوں سے الف لیلوی شہزادوں کی صف میں کھڑے دکھائی دے رہے ہیں۔ اور اب تو افسران و وزیروں کی ایک آدھ بیوی کا بھی قصہ اخبارات کی خبروں کی زینت بن رہا ہے۔ کیا آزادی ان ہی لوگوں کے لیے حاصل کی گئی تھی کہ وہ ملک کو خوب لوٹیں کھسوٹیں۔ کوئی انھیں چھونے والا تک نہیں ہے۔ گاندھی جی بیچارے کھدر پوشی میں ملک کی بلند تقدیر دیکھ رہے تھے وہ چرخہ کات

کاٹ کر گھر گھر یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ ملک میں پہلے غریبی ختم کر و سب کو مساوی درجہ ملے اگر گاؤں کے لوگ کھدر پہن رہے موٹا اناج کھا رہے ہیں تو شہر والوں کو بھی اسی طرح کھدر پہن کر اور موٹا اناج کھا کر مساوات کا سکہ رائج کرنا چاہیئے۔ مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ آزادی کے بعد یہ سب تقریروں کی ہی باتیں رہ جائیں گی عملاً اس کے بالکل متاثر چالاک اشخاص سیاسی لیڈران ملک کی دولت پر اپنا حق سمجھ کر قابض ہوں گے اور غریبوں کے حصے میں وہ ہی ہوگا جو ان کا مقدر بن چکا ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔ کہ آج بھی ملک کے بیشتر گاؤں میں عورتیں پینے تک کا پانی روزانہ میلوں تک پیدل چل کر حاصل کرتی ہیں اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے زندگی کی دوسری بنیادی ضروریات کے حصول کے لئے انھیں کس طرح جدوجہد و تگ و دو کرنی پڑتی ہوگی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ساری برائیوں کی پیداوار کی واحد وجہ ملک میں اخلاص کا فقدان انسانیت کی کمی اور خود غرضی کا دور دورہ ہی ہے۔ خود غرضی اور حرص و ہوس ہمارے معاشرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اب یہ چیزیں کسی کو نظر ہی نہیں آتی ہیں ملک کے ارباب حل و عقد سوئے ہوئے ہیں انھیں فکر ہی نہیں ہے کہ سماج سے اس برائی کو کیسے ختم کریں۔ حب الوطنی کا نعرہ تو بہت دیا جاتا ہے لیکن ہمارے سیاستداں نہیں سمجھتے کہ حب الوطنی کا عملی تقاضہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ ملک میں ہر انسان مساوی درجہ کا مالک ہو، ہر شخص کو اس کی بنیادی ضرورت روٹی کپڑا مکان میسر ہو حکمراں طبقہ اخلاص و بے غرضی کے ساتھ عوام الناس کی خدمت میں مگن ہو جب سیاستداں ہی اخلاص سے عاری ہوں گے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ ایک عام انسان کہاں سے اخلاص کو حاصل کرے گا۔ اخلاص کوئی ایسی شئے تو ہے نہیں کہ جسے بازار سے خرید کر لے آیا جائے۔ یہ تو انسانی نفس کے اختیار کی چیز ہے اور جب انسانی نفس میں اخلاص کی کوئی قدر و قیمت نہ رہے

گی تو ملک کے عوام کی کس طرح خدمت ہو سکے گی، وہی اسکنڈل اور مہنگائی کی بھرمار دیکھنے کو ملے گی جس سے غریب عوام کا جینا تک دوبھر ہو رہا ہے۔

یوپی اسمبلی کے انتخابات ہوئے پانچ مہینے گذر چکنے کے بعد اب وہاں بی ایس پی اور بی جے پی کے اشتراک سے حکومت کی تشکیل ہو گئی ہے۔ بی ایس پی کی مایاوتی نے بطور وزیراعلیٰ یوپی کا حلف لیکر اپنی کابینہ بنالی ہے۔ جسمیں نصف نصف وزراء دونوں جماعتوں یعنی بی ایس پی اور بی جے پی کے ہونگے اور چھ چھ ماہ بعد کے وقفے سے دونوں جماعتوں میں کسی ایک کو وزیراعلیٰ کا عہدہ ملے گا۔ اس حکومت سازی سے ایک بات صاف ہو گئی ہے کہ اب سیاست میں اصول کی بات بالکل بے میل بات ہو گئی ہے جو اصول کی بات کرتا ہے وہ بے وقوف ہے دقیانوس ہے بی۔ ایس پی کل تک گلا پھاڑ پھاڑ کر بی جے پی کو فرقہ پرست۔ منو وادی، برہمن وادی پارٹی کہتی تھی مگر آج اسی کے سہارے وہ حکومت بنا رہی ہے اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہو گی اور بی جے پی کے نزدیک بی ایس پی ایک جاتی واد جماعت تھی جو ملک کے لئے خطرناک ہے کیا اس بی ایس پی کو اپنی حمایت دے کر اس نے ملک کے لئے خطرہ پیدا کیا اور جاتی واد کو بڑھاوا دینے کی اب وہ مجرم نہیں ہے کیا؟ کہنے اور کرنے میں فرق کی شرمناک مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ سیاستدانوں کی باتوں میں کہنے سننے اور عمل میں جو فرق دیکھنے میں آ رہا ہے وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں شاید ہی ملا ہو۔ اب تو روزانہ ہی یہ دیکھنا ہم ہندوستانیوں کا مقدر بن گیا ہے۔

مائیکل جیکسن کے بعد اب یانّی نے آگرہ میں سنگیت کے ایک پروگرام میں ہندوستان کے منچلے لوگوں کے دلوں میں مستی کا طوفان پیدا کر دیا۔ مائیکل جیکسن نے گذشتہ سال ۱۹۹۶ء

میں بمبئی کے منچلوں کے سامنے مٹک مٹک تحرک کر کر اور کولہوں کو ہلا ہلا کر جو واہ واہ لوٹی اسے تو ایک طرف رکھیے یہ دیکھیے کہ غریب ملک کے عوام کی جیبوں سے جو روپیہ الٹے پروگراموں کے انعقاد کے لئے نکلوایا گیا اس کا حساب کروڑوں میں بنتا ہے ہم لوگ الف لیلوی داستانیں پڑھ کر قصے کہانیوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں لیکن یہ الف لیلوی قصے کہانیاں تو قصہ پارینہ بن چکے ہیں اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی میں عملاً سب کچھ دیکھ کر کیا بیت رہی ہے بس یہ نہ پوچھیے؟ مائیکل جیکسن بمبئی میں کیا آیا۔ ہندوستان کے پورے منچلوں کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھا گیا، لڑکیاں دل دے بیٹھیں اور ارمان سجانے سنوارنے لگیں، اور لڑکے آہیں و سسکیاں بھرتے رہ گئے اور اب یانی جو آیا تو منچلوں کے دل پھر مچل اٹھے فلمی ایکٹرسیں یانی کی دیوانی ہو گئیں اسے اپنے دلوں میں جگہ دینے کے تخیل میں کھو گئیں اور منچلے نوجوان جھوم جھوم کر مستیاں بھر بھر کر جواں دلوں کی جواں ملکاؤں کو اپنے دل و دماغ کے آنگن میں بٹھا کر کروٹیں بدلنے لگے ہیں جس ملک کی تصویر یہ ہو اسے کون دنیا نوسی ملک کہے گا۔ مائیکل جیکسن اور یانی کا دیوانہ ملک کا یہ منچلا دیکھ کر سب ہائیں! ہائیں کرتے رہ گئے۔

اشاعت کے دو اہم ذرائع

از: مفتی عزیز الرحمان چمپارنی ، ریاض العلوم دھلی

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ط

ایک اہم بات جو مدارس اور ارباب مدارس کے لئے بہت ضروری ہے عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جہاں قلم سے زیادہ بذریعہ زبان، اور تحریر کے بجائے بذریعہ تقریر تعلیم و تعلم کا رواج ہے جس کے نتیجے میں طلباء مدارس میں ذوق تحریر خاطر خواہ پیدا نہیں ہو پاتا ضرورت ہے کہ ہم اس پر غور کریں۔

ہجرت سے پہلے

آج سے چودہ سو سال پہلے کے عہد کو جس میں کفر و شرک بھی، طغیانی و سرکشی بھی، ارتداد و دہریت بھی، لادینیت و لامذہبیت بھی، فسق و فجور بھی، عصیان و معصیت بھی، قتل و غارتگری بھی، جنگ و جدال بھی، زنا و شراب بھی، چوری اور رہزنی بھی عام تھی لیکن بعثت اسلام سے پہلے کے اس عہد منحوس کو نہ ہم عہد کفر کہتے ہیں نہ ہی زمانہ شراب و زنا۔ بلکہ اس عہد کو عہد جاہلیت کہتے ہیں معلوم ہوا کہ بے علمی اور جہالت ہی سارے امراض و شرور کا سبب ہے اور سارے برائیوں کی دیواریں خشت جہالت ہی پہ تمام ہو گئیں اور جب معلم انسانیت نے اپنا مقصد بعثت ان الفاظ میں

بیان کیا "کنت بعثت معلماً" (مشکوٰۃ ج ا کتاب العلم) تو عالم سے ساری تاریکیاں چھٹ گئیں جو اسلام سے پہلے چھائی ہوئی تھیں اور اسلام نے تعلیمی پہلو کو اتنی اہمیت دی کہ بالفاظ قرآن فرمادیا گیا" فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (پ ۱۴) اہل علم سے پوچھو اگر تم کو علم نہیں ہے۔ اور بالفاظ حدیث فرمادیا گیا" طلب العلم فریضة علی کل مسلم[1]" علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اور اس طرح دوسرے بہت سارے احکامات متبعین اسلام پر اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے جاری کیے گئے تاکہ فرزندان اسلام تعلیم کی اہمیت کو زندگی کے ہر موڑ پر محسوس کرتے رہیں۔ نیز اس کی ترویج واشاعت کی تاکید کرتے ہوئے مبلغ اسلام محسن انسانیت ؐ نے تقریباً سوالاکھ صحابۂ کرام کی جمعیۃ کثیرہ سے ان الفاظ میں خطاب فرمایا:" فلیبلغ الشاهد الغائب رُبّ مبلغ أوعی من سامع" (بخاری ج ا کتاب العلم) چاہیئے کہ حاضر غائب تک پہونچائے اور بسا اوقات جس کے پاس پہونچائی جاتی ہے سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنیوالا ہوتا ہے اور فرمایا (بلغوا عنی ولو آیة) پہونچا دو۔ میری اگر ایک ہی آیت تم کو معلوم ہو اور مزید فرمایا:" نضر الله امرا سمع منا شیئاً فبلغه کما سمعه فرب مبلغ أوعی من سامع" (ترمذی ابن ماجہ، دارمی) اللہ تعالیٰ شاداب رکھے اس شخص کو جو میری بات سنے اور اس کو من وعن پہنچا دے۔ بہت سے مبلَّغ مبلِّغ سے زیادہ محفوظ کرنے والے ہوتے ہیں۔

---

[1] "مسلمة" کا لفظ مدرج ہے جیسا کہ ملا علی قاری نے "موضوعات" میں اور صاحب "اللآلی المصنوعة فی احادیث الموضوعة" نے لکھا ہے۔

تحصیل علم اور اس کی ترویج پر ان الفاظ میں بشارت دی گئی ہے۔ "من طلب العلم کان کفارة لما مضیٰ" (ترمذی، دارمی) جو شخص علم دین حاصل کرنے میں مشغول ہو جائے گا گذشتہ گناہوں کے کفارہ کا سبب بن جائے گا۔

غرض اینکہ تعلیمات اسلام اور احکام شریعت آج چودہ سو سال سے قرناً بعد قرنٍ ونقلاً بعد نقلٍ ہم تک پہونچے اور اس طرح ان ارشادات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع و فرماں بردار اور جاں نثار صحابۂ کرام بھلا کسطرح دین کی نشر و اشاعت سے راہ فرار اختیار کر سکتے تھے۔ انہوں نے اسی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا تھا اور اطراف عالم میں دین اسلام کی قندیلیں روشن کیں اور جسطرح صحابۂ کرام نے امانتِ اسلام کو اپنے بعد کی نسلوں میں منتقل کرنے کی ذمہ داری سے تا دمِ آخر سبکدوش نہیں سمجھا اسی طرح اس کے بعد۔

تعلیمات اسلام اور احکامِ شریعت کو ہر جانے والے نے آنے والی نسلوں کے سپرد کر دیا۔ اسی طرح ایک مدت مدید سے یہ قرناً بعد قرنٍ نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچا۔

تعلیماتِ دین کی حفاظت کے لیے تو بہت سے اسباب ہیں لیکن جب ہم ان اسباب کی حفاظت پر غور و فکر کی نگاہ ڈالتے ہیں تو دو ذریعے سب سے معیاری اور اساسی معلوم ہوتے ہیں ایک زبان دوسرے قلم انسان کے جواہر میں یہ دو اہم جوہر قدرت نے ودیعت فرمائے۔

چنانچہ ان دونوں صلاحیتوں کے ذریعہ انسان ما فی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کو دنیا میں خواہ باطل ہو یا حق ہر ایک کی ترویج کی تہ میں ان ہی دونوں صلاحیتوں کا استعمال نظر آئے گا۔ اور زبان و قلم کے استعمال اور دماغ کی پرورش کے لئے علم و ماحول ایسے ہی ضروری

ہے جیسے جسم کے لئے روح ۔ اور یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ زبان و قلم ترجمان ہیں ان حقائق اور معارف کے لئے جن سے قلوب اور اذہان مملو ہیں اور حقائق و معارف کی تحصیل نگاہ مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں اسی لئے اولاً مطالعہ اور ان مضامین کو ذہن نشین کرنا پھر انہیں بہتر انداز اور اسلوب میں پیش کرنا ہی مرد کامل کی خوبیوں کے امارات ہیں ۔

(پہلے زبان پھر قلم) ان دونوں نعمتوں کی ترتیب میں اگر زبان کو اولیت اور قلم کو ثانویت کا درجہ باعتبار خالق کے دیں تو بہت حد تک یہ بات مناسب سمجھی جاسکتی ہے ۔

اس موقعہ سے ہم یہ عرض کریں کہ قلم کو زبان پر اور تحریر کو تقریر پر فوقیت اس اعتبار سے بھی حاصل ہے کہ اکثر اخص الخواص نے بذریعہ قلم ہی اپنے پیغامات خواص تک پہونچائے ہیں اور خواص نے عوام تک بذریعہ زبان یا بذریعہ قلم، چنانچہ یہی ترتیب احکام خداوندی کے نزول کے سلسلہ میں بھی نظر آتی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب کسی ملک کا بادشاہ اپنے ملک میں اپنے قوانین و فرامین پہونچانا چاہتا ہے اور اپنی رعایا کو ان قوانین کا پابند کرنا چاہتا ہے تو وہ ان قوانین کو مرتب کرتا ہے اور قوانین کو وہ خود لے کر گھر گھر نہیں جاتا بلکہ اپنے کسی معتمد فرد کو اس کے لئے منتخب کرتا ہے اور وہ بادشاہ کے فرامین اور احکامات کو ایک نظم و ضبط کے ساتھ رعایا تک پہنچاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ بھی اپنے احکامات اپنے خاص فرشتوں کے ذریعہ اپنے منتخب انبیاء کرام تک پہونچاتا ہے ۔ (آیت قرآنی سے ثبوت)

اِقرأ باسم ربک الذی خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔

اِقرأ وربك الأكرم الذی علّم بالقلم. علّم الانسان ما لم یعلم۔ (سورہ علق)

پڑھئے (اے نبیؐ) اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھئے (اے نبیؐ) اپنے رب کا نام جو باعزت ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا انسان کو (دوسری ضرورت کی چیزیں بھی سکھائیں)

مولانا ثناء اللہ امرتسری اپنی تفسیر میں آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ اصل بات یہ ہیکہ "اِقرا باسم" پر جو "ب" ہے اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ "ب" ذریعہ پر ہے اس صورت میں ترجمہ ہو گا۔ اللہ کے نام سے پڑھ اس معنی کے لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میں پڑھا نہیں ہوں۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ "ب" مفعول پر آتی ہے جیسا کہ تفسیر کبیر میں امام ابو عبیدہ کے حوالہ اور عربی شعر کی سند پر اس کا معنی لحاظ کیا ہے کہ قرأت کے مفعول پر "ب" بارہا آتی رہتی ہے۔ پہلا معنی دوسرے کی نسبت سے زیادہ متبادر ہے بنا بریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن مبارک ادھر منتقل ہوا۔

اس بحث کے بعد اصل بحث اس موقعہ پر یہ کرنی ہے کہ سورۃ کو لفظ "اِقرا" سے شروع کیا گیا اور قرأت کا تعلق زبان سے ہے اور زبان سے دنیاوی امور زیادہ انجام پذیر ہوتے ہیں اس عموم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "اِقرا" کا لفظ دو مرتبہ آیا اور قلم کا لفظ بعد میں آیا اور ایک مرتبہ آیا۔ اس سے یہ نکتہ نکلا کہ قلم کو زبان کے بعد استعمال کیا جاتا ہے اور قلم کا استعمال بلحاظ زبان کے کم ہے اور صرف خاص تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہے۔

پس تربیت زبان اور قلم میں ان آیات کی روشنی میں بھی زبان کو اولیت اور قلم کو ثانوی حیثیت ہوگی۔ نیز قلم کے لئے فن کتابت کی اہمیت بھی ان آیات

ثابت ہوئی۔ دوسری آیت: "الٓمٓ ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتقین" (پ ۱ ع ۱) سورہ بقرہ کی اس پہلی آیت میں بھی لفظ کتاب کا تذکرہ اسی امر کی طرف مشیر ہے کہ ہدایات منضبطہ اور احکامات مرتبہ بشکل کتاب ہوتا ہے اور صاحب کتاب اپنے قوانین وفرامین (جن کی پیروی میں فلاح وبہبود مضمر ہو) کتاب کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام میں تو چار ایسے جلیل القدر اور رفیع المقام نبی ہیں جن کو کتابیں دی گئیں اور ان کے علاوہ دوسرے پیغمبرانِ اسلام کو صحائف اور تختیاں عطا کی گئیں۔ چنانچہ تیسواں پارہ میں فرمایا صحف ابراہیم وموسیٰ یہاں حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا علیہ الصلاۃ والسلام کا تذکرہ ہے اور موسیٰؑ کی تختیوں کا تذکرہ سورہ اعراف کی رکوع میں ان الفاظ میں فرمایا گیا" وکتبنا لہ فی الالواح من کل شئٍ موعظۃ وتفصیلاً لکل شئٍ فخذھا بقوۃ وامر قومک یاخذوا باحسنھا" اور ہم نے ان کے لئے تختیوں پر ہر قسم کے پند ونصائح اور ہر قسم کی تفصیل لکھ دیا ہے اس لئے اس کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنی قوم کو حکم دیدو کہ وہ اچھی طرح اس کو محفوظ کرلیں اور حضرت یحییٰؑ سے ارشاد فرماتے ہوئے قرآن کے سورہ مریم کے رکوع نمبر ۱ میں ارشاد عزوجل ہے" یایحییٰ خذ الکتاب بقوۃ وآتیناہ الحکم صبیاً" اے یحییٰ کتاب کو اچھی طرح پکڑ لو اور ہم نے تم کو بچپن میں حکمت عطا کردی۔ ان آیات کے علاوہ دوسری بہت سی آیات واحادیث کتابی کی شکل میں دینے کا ثبوت ملتا ہے اور یہ امر بھی کس قدر قابل اعتنا ہے کہ قرآن کے معاملات کے سلسلہ میں حفظ محض پر قناعت کیا نہ اسے غایت احتیاط قرار دیا ہے بلکہ انتہائے احتیاط یہ ہے

کہ کتابت کا التزام معاملات میں کیا جائے اس کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: یٰایھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجل مسمّیً فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ان یکتب کما علمہ اللہ فلیکتب" (پ۳۔۶٤)

آیت کریمہ سے تداین میں اہتمام کتابت کے لئے تاکیدی حکم کے ساتھ فن کتابت کا فضل الٰہی اور نعمت معبود حقیقی ہونا بھی ثابت ہوا اور اس کے شکر گذاری کا حکم بھی معلوم ہوا۔

اس سے یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ قلم اور تحریر با عتبار زبان کے زیادہ اہمیت و نزاکت کا حامل ہے۔ عہد نبوی کے روشن ایام جنمیں تعلیم بھی ہے تبلیغ بھی سیاست بھی، اقتصادیت بھی، جلوت بھی اور خلوت بھی، عوام سے بھی ساتھ ہے اور شاہان عرب وعجم سے بھی لیکن آپ اپنی دعوت عوام تک بذریعہ زبان اور شاہان عرب وعجم تک بذریعہ قلم پہونچاتے ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف جلد ا کتاب الایمان میں اس خط کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔ جو آپؐ نے شاہ کسریٰ ہرقل کے پاس بھیجا۔

• بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ من محمد عبد اللہ ورسولہ إلی ھرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الھدی۔ امابعد۔ فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یوتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الاریسین ویا اھل الکتاب تعالوا إلی کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون (بخاری ج ۱)

شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے عظیم روم ہرقل کی طرف اسلام ہو

اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔ امابعد۔ میں تجھ کو اسلام کی ہدایت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرکے تو دائرہ سلامتی میں داخل ہو جا اللہ تعالیٰ تجھے دو گنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اس دعوت حق سے منہ پھیر لیا تو تجھ پر اریسین کا گناہ بھی ہوگا اور اے اہل کتاب آجاؤ تم لوگ ایسے کلمہ کی طرف جو برابر ہے تمہارے درمیان یہ کہ نہ عبادت کریں ہم مگر اللہ ہی کی اور شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ رب بناوے ہم ہیں کا بعض بعض کو اللہ کے علاوہ پس اگر تم لوگ منہ پھیرو تو تم لوگ گواہ رہو اس بات کے کہ ہم مسلمان ہیں۔

غرض اینکہ دحیہ کلبی کو قیصر روم کی طرف عمر بن عمیہ ضریؓ کے ہاتھ حضرت جعفر بن ابو طالب اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں شاہ حبشہ کے پاس عبداللہ بن حذافہ سہمی کو حاکم یمامہ ہوصہ بن علی کے پاس سابط ابن عمرو کو ہجر کے حاکم مناظر بن ساوی کے پاس علی بن حضرمی کو اور عمان کے دونوں حاکموں جفیہ عیاد کے دونوں بیٹوں کے پاس عمرو بن العاص کو متدلہ ابن حارث منسانی کے پاس شجاع ابن وہب اسری کو (طبرانی) حافظ فتح الباری جلد نمبر ۸ صفحہ ۸۹ میں لکھتے ہیں کہ ان کے علاوہ ذی کلاع کے پاس اور دیگر سارے بادشاہوں اور سرداروں کے پاس بذریعہ تحریر پیغام پہونچایا اور اس کے نتیجہ میں بعض نے قبول کرکے دارین کی سعادتیں حاصل کیں اور بعض ٹھکرا کر دنیا و عقبیٰ کی ذلتوں کے مستحق ہوئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا پیغام حق بلقیس ملکہ سبا کے پاس ہدہد پرندے کے ذریعہ ارسال فرمایا اور اپنا فرمان بذریعہ خط جاری فرماتے ہیں۔ قرآن نے اس کو نقل کیا ہے۔ صاحب جلالین رقم طراز ہیں۔

من عبد اللہ سلیمان بن داؤد إلی بلقیس ملکۃ سباء بسم اللہ الرحمن الرحیم والسلام علی من اتبع الھدی۔ امابعد۔ فلا تعلوا علی واتونی

مسلمین ثم طبعہ بالمسک وختمہ بخاتمہ ثم قال لہدہد اذھب بکتابی ھذا فالقہ الیھم ثم تول عنھم فانظر ماذا یرجعون ؛ (رمٹ ۳۱۹ پ۱۹ ع ۱۸)

اللہ کے بندے سلیمان بن داؤد کیطرف سے ملکہ سبا بلقیس کی جانب اس اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت کرم والا نہایت رحم کرنے والا مہربان ہے سلامتی ہو اس شخص پر جو ہدایت کی اتباع کرے بہرحال تم پر یہ حکم ہے کہ تم میرے اوپر سر بلندی نہ اختیار کرو، فرمانبردار بن جاؤ۔ پھر اس خط پر مشک سے مہر ثبت کیا پھر ہدہد سے کہا کہ میرے اس خط کو ان کے پاس لے جاؤ اور ان کے سامنے ڈال کر دیکھو کہ وہ کیا کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے خط کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ اتنے ہی ہیں" انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمان الرحیم الا تعلوا علیّ واتونی مسلمینؑ (پ۱۹ ع ۱۸) اور اس کے بعد جب وہ خط ملکۂ بلقیس کے پاس پہنچا تو اس نے مشیرین کار کو اکٹھا کیا اور اس خط کو قوم کے سامنے پیش کیا اور کہا۔

"قالت یاایھا الملؤا افتونی فی امری ماکنت قاطعۃ امراً حتی تشھدون قالوا نحن اولوا قوۃ واولوا بأس شدید والامر الیک فانظری ماذا تأمرین" (پ:۱۹)

کہا ملکۂ سبا نے ملک کے دانشورو اس معاملہ میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے میں تمہاری رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ صاحب قوت اور جنگجو ہیں مقابلہ کریں گے۔

قالت ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذلک یفعلون۔ (پ: ۱۹ ع ۱۹)

(ملکہ سبا نے کہا) لیکن بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد مچاتے ہیں اور باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اس لئے اس پر غور کرو۔

اس مثال سے بھی واضح ہوگئی کہ دعوت حق اور دیگر پیغام امن وسلامتی بذریعہ قلم دعاۃ اسلام اور مبلغین اسلام نے انجام دئے ہیں۔

بذریعہ قلم دین کی پائیدار حفاظت

اس کے بعد ہم اس پہلو پر غور کریں کہ آج چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی ہمارے پاس جو قرآن وسنت کی امانت من وعن اپنی حالت میں موجود ہے اس کے اسباب اساسی کیا ہیں؟ یہ ایک ایسی حقیقت مسلمہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن بھی کتابت اور تحریری کوشش کے سبب آج بھی موجود ہے چنانچہ ایام نزول میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا مکمل اہتمام بالالتزام فرمایا کہ نازل شدہ کوئی آیت بلا کتابت کے نہ رہ جائے نیز آپؐ اسے حفظ کرنے کی کوشش فرماتے کہ مبادا خدائے ذوالجلال کی طرف سے اترنے والا کوئی حکم ذہن سے اتر نہ جائے چنانچہ قرآن کے ۲۹ ویں پارہ میں سورہ قیامہ کے پہلے رکوع میں فرمایا گیا۔

"لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرانه فاذا قراناه فاتبع قرانه ثم ان علينا بيانه۔" قرآن کے نازل ہونے کے وقت اپنی زبان کو جلدی حرکت نہ دیجئے بے شک اس کا جمع کرنا ہمارا کام ہے اس لئے ہم جب پڑھائیں تو اس کے بعد پڑھا کیجئے پھر ہم اس کو آپ کے اوپر بیان کریں گے۔

توجسطرح قرآن کی حفاظت کے سلسلے میں آپ بڑی عجلت سے کام لیتے تھے اسی طرح آپؐ نے کچھ کاتبین بھی مقرر فرمائے تھے چنانچہ حضرت زید بن ثابت حضرت

معاویہ بن ابی سفیان، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ایک شخص اور ہے جو بعد میں مرتد ہو گیا۔ غرض اینکہ قرآن کی کتابت کا انتظام کرنا، کلام الٰہی کا ضبط کرنا اور تحریر میں لانا اس بات کی بین دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک بذریعہ قلم دین کی حفاظت کی کس قدر اہمیت ہے۔

جمع قرآن کی طرف توجہ صحابہ کرام کے عہد میں

ہر چند کہ آپ نے اپنی حیات میں قرآن پاک کی کتابت کا کام انجام دیا ہے نیز ان کے حفاظ بھی سینکڑوں سے متجاوز تھے، پھر بھی صحابہ کرام میں سے حضرت عمر بن الخطابؓ کی دوررس نگاہ نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ قرآن کریم کو مؤلف اور مرتب کر کے کتاب کی شکل نہ دیدی گئی تو اس کے ضیاع کا خطرہ ہے اور اس خسران کا خمیازہ آنے والی قیامت تک پوری ملت محمدیہ ہی نہیں دوسری قوموں کو بھی بھگتنا پڑے گا چنانچہ آپؓ نے اس کی تالیف کیطرف توجہ فرمائی۔ ابوبکر صدیقؓ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے اس امر پر گفتگو فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محتاط طبیعت اس کام کی موافقت پر اولاً تو تیار نہ ہوئی لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے فوائد اور نتائج اور نہ جمع کرنے کی صورت کے نقصانات سامنے رکھے تو آمادگی کا اظہار فرما دیا۔ اس کام کی ذمہ داری کا بار گراں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر ڈالدیا۔ جمع قرآن کیطرف غایت توجہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے سلسلہ میں صحابہ کرام کی ایک ایسی بڑی جماعت کام آگئی جو حفاظ قرآن پر مشتمل تھی اس لئے بعد میں فکر ہوئی کہ جو دولتیں سینوں میں محفوظ ہیں صاحب قلب کے ساتھ قبر میں چلی جائیں گی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ایام ماضیہ میں اسلاف نے دین کی

دولتیں کاغذ کے حوالے نہ کی ہوتیں تو آج ہم ہرگز ان معارف و حقائق سے واقف نہ ہو سکتے تھے۔

احادیثِ پاک اور محدثین کرام کا جہد بلیغ

شریعت اسلام کا منبع تو قرآن ہی ہے لیکن احادیث کے بغیر اجمال کی وضاحت ممکن نہیں اس لئے احادیث رسول اور اقوال نبوی کی ترتیب و تالیف ـــــ بھی ضروریات دین میں سے ہے اور اسکی ضرورت بھی بہت اہم تھی جسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً سو سال بعد شدت سے محسوس کیا گیا اور شہاب زہری نے اس کام کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے امام مالک رحمہ اللہ نے ـــــ موطا امام مالک پیش کی اور اس طرح امت میں محدثین کا ایک قافلہ تیار ہو گیا جس کا تسلسل آج تک خدمت حدیث، جمع و ترتیب اور جرح و تعدیل کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی کد و کاوش اور پوری زندگی اس اہم خدمت میں وقف فرما کر چھ لاکھ احادیث لکھیں اور انہیں سے چھانٹ کر نہایت محتاط طریقے پر سات ہزار دو سو پچھتر حدیثوں کا مجموعہ جامع بخاری کے نام سے امت کے حوالے کر دیا۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے چودہ برس کی عمر سے آخر عمر تک کی کوششوں کے بعد تین لاکھ احادیث اکٹھی فرمائیں اور ان میں سے بارہ ہزار حدیثوں کا انتخاب فرما کر اپنی جامع کی شکل میں امت مرحومہ کے حوالے کر دیا اور آپ کی پوری زندگی اسی کی نذر ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ آپ کی وفات کا عجیب و غریب واقعہ ہمارے لئے بڑا سبق آموز ہے۔ ایک دن آپ کسی حدیث کی تلاش میں مصروف تھے اور درمیان میں کھجوریں بھی تناول فرماتے جاتے تھے۔ تلاش حدیث میں اس طرح استغراق تھا کہ احساس نہ ہو سکا کہ کھجوریں کتنی

کھالیں۔ حتی کہ کثرت اکل کی بناء پر آپ کا شکم پھٹا اور آپ نے دارفانی سے کوچ فرمایا۔

حضرت امام ابوداؤدؒ نے پانچ لاکھ احادیث میں سے اپنی سنن کی تالیف چار ہزار آٹھ سو احادیث سے فرمائیں اس طرح دوسرے بہت سارے محدثین کرام ہیں جنہوں نے قلم سے علم حدیث کی حفاظت فرمائی اور یہ دولت اس امت کو سپرد فرماکر دنیا سے تشریف لے گئے۔ قرآن وسنت کی خدمت کے علاوہ فقہ و تفسیر علم ومعانی وکلام صرف ونحو غرضیکہ ہر میدان میں جہاں تک بذریعہ زبان ہوسکا دوسروں تک علوم پہونچائے گئے وہیں قلم کے ذریعہ بھی اسے محفوظ کرلیا ہے۔ چنانچہ امام محمد کی مبسوط، جامع کبیر، جامع صغیر، شامی، درمختار، ہدایہ، شرح وقایہ مختصر، توضیح و تلویح، ملل ونحل، کافیہ، شرح جامی، علم الصیغہ، شافیہ غرضیکہ کون سا علم ہے علوم میں جسکی حفاظت قلم کیوجہ سے نہیں ہوئی ہے۔ ان ساری تفصیلات سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ تصنیف وتالیف نشر واشاعت جتنا دیرپا اور مستحکم خدمت ہے شاید دوسری خدمات اتنی مستحکم نہ ہوں۔

لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس دور میں جبکہ اہل یورپ اپنی قلمی صلاحیتوں سے اسلام اور دیگر علوم پر گراں قدر کتابیں تصنیف کرکے ہمیں اپنا محتاج بنالیتے ہیں ہمارے مدارس میں اس خاص شعبے کیطرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے اور طلباء کو اس کام کی طرف نہ تو اساتذہ ہی متوجہ کرتے ہیں اور نہ مجلس منتظمہ اپنے انتظامی پروگرام میں اسے داخل کرنا ضروری سمجھتی ہے حالانکہ تحریری صلاحیت ایسی صلاحیت ہے کہ ایک عالم دین نہایت آسانی سے کتابوں کے سبب اور جرائد کے ذریعہ دین کے پیغامات دور دراز ملکوں میں پہونچا سکتا ہے۔

شکل میں صدقۂ جاریہ چھوڑ سکتا ہے

حضرات! قلت وقت اجازت نہیں دیتا کہ اس کے سارے فوائد بیان کروں نہ اہل دانش اور ارباب فکر سے اس کے فوائد مخفی و مستور ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پورے ہندوستان کا ایک تصنیفی مرکز قائم ہو جس سے سارے اہل قلم کا تعلق ہو تاکہ قلمی خدمات کی صلاحیت پیدا کر لینے کے باوجود بعض صاحب صلاحیت اپنی دوسری مجبوریوں اور ناگفتہ بہ حالات کے شکار ہو کر صلاحیت کو استعمال نہیں کر پاتے یا کھو دیتے ہیں ان کا کوئی معقول انتظام کیا جا سکے۔

دوسری و آخری قسط

اردو کے چند مشہور شعرا اور انکے ناظم

عبدالرؤف خاں، ایم اے، آدئی کلاں، راجستھان

(۴۵) کیا ہی منہ بولتا مصرع ہے :-

کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

یہ مصرع منور خاں غافل لکھنوی کے اس شعر کا ہے

غافل پہ مہرباں نہ ہوا وہ شباب میں	کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

(جواہر سخن ۱۲ ۳ ۸۲۲)

حالی کی مشہور غزل کا ایک شعر ہے :-

(۴۶) کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اِس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

(دیوانِ حالی ص ۱۰۹ - اردو اکادمی دہلی ایڈیشن ۱۹۹۱ء)

مصرعِ ثانی خصوصی شہرت کا حامل ہے ۔

(۴۷) ° خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

یہ مصرع داد خاں سیاح تلمیذ غالب کا ہے ۔ مکمل شعر یہ ہے :-

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

(سہو و سراغ ص ۱۲۷)

(۴۸) کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اور اگر فارغین کو سوء قسمت سے فراغت کے بعد کوئی بڑا ادارۂ تعلیم خدمت کے لئے نہ ملا تب بھی ذوقِ تحریر کی وجہ سے بڑے بڑے اداروں کے مدرس اور طلبہ تک اپنا فیض پہنچا سکتے ہیں۔

اغیار کی ریشہ دوانیوں کا جواب اسی صلاحیت کے ذریعہ نہایت دانشمندی اور دیانت سے دیا جا سکتا ہے نیز اپنی زندگی کے بعد قیامت تک کے لئے علم ہونے کے منتقل کرنے کا مستحکم کام اور اپنی زندہ علامتیں مصنفات و مؤلفات کی شکل میں صدقۂ جاریہ چھوڑ سکتا ہے

حضرات! قلت وقت اجازت نہیں دیتا کہ اس کے سارے فوائد بیان کروں نہ اہل دانش اور ارباب فکر سے اس کے فوائد مخفی و مستور ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پورے ہندوستان کا ایک تصنیفی مرکز قائم ہو جس سے سارے اہل قلم کا تعلق ہو تاکہ قلمی خدمات کی صلاحیت پیدا کر لینے کے باوجود بعض صاحب صلاحیت اپنی دوسری مجبوریوں اور ناگفتہ بہ حالات کے شکار ہو کر اس صلاحیت کو استعمال نہیں کر پاتے یا کھو دیتے ہیں ان کا کوئی معقول انتظام کیا جا سکے۔

دوسری و آخری قسط

اُردو کے چند مشہور شعر اور انکے ناظم

عبدالرؤف خاں، ایم اے، اُدئی کلاں، راجستھان

(۴۵) کیا ہی منہ بولتا مصرعہ ہے :-

کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

یہ مصرعہ منور خاں غافل لکھنوی کے اس شعر کا ہے

غافل یہ مہرباں نہ ہوا وہ شباب میں کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

(جواہر سخن ۲ : ۸۲۳)

حالی کی مشہور غزل کا ایک شعر ہے :-

(۴۶) کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اِس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

(دیوانِ حالی ص ۱۰۹ - اردو اکادمی دہلی ایڈیشن ۱۹۹۱ء)

مصرعِ ثانی خصوصی شہرت کا حامل ہے۔

(۴۷) "خوب گذرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو"

یہ مصرعہ داد خاں سیاح تلمیذِ غالب کا ہے۔ مکمل شعر یہ ہے :-

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

(سہو و سراغ ص ۱۳۷)

(۴۸) کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ذوق کا یہ مصرع زبان زد عوام ہے۔ پوری بیت یہ ہے :

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(کلیاتِ ذوق (اردو) ص ۲۶۳ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۱۹۸۰ء)

(۴۹) غالب کے یہاں یہ مفہوم اس طرح ادا ہوتا ہے :۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(دیوان غالب ص ۵ مطبوعہ ۱۸۶۲ء عکسی)

غالب کے مذکورہ شعر کے پہلے مصرع کو لوگ یوں بھی پڑھ دیتے ہیں :

" یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ تن کی ہے

مولانا حالی نے اسی شعر کے دوسرے مصرع سے غالب کے انتقال کی تاریخ بھی تعمیۂ تخرجہ سے نہایت عمدہ برآمد کی ہے :۔

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر
" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا " (۱۲۸۵ھ)

(۵۰) آخر گل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

(طبقات شعرائے ہند ص ۸۵ نیز گلشن بے خار ص ۵۴)

دوسرا مصرع مشہور اس طرح ہے :

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہ شعر شہزادہ مرزا جہاندار شاہ جہاندار عرف مرزا جواں بخت ولیعہدِ شاہ عالم کا ہے۔

(۵۱) بہت مشہور شعر ہے :۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

لیکن اصل شعر یوں ہے:

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا[1]

(طبقات شعرائے ہند)

شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پوری ص ۱۶۱ نیز گلشن بے خار ص ۱۵۳)

کچھ لوگ اِسے سودا سے منسوب کرتے ہیں جو درست نہیں۔ گرچہ سودا کی بھی اس زمین میں ایک مشہور غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

نے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

(کلیاتِ سودا، ۱: ۲۲۴ مرتبہ ڈاکٹر امرت لعل عشرت)

(۵۲) چرخ کو کب یہ سلیقہ تھا ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(منو لال صفا لکھنوی۔ سخن شعرا ص ۲۸)

لیکن نواب شیفتہ اور کریم الدین نے منو لال کا تخلص صبا بتلایا ہے اور شعر کی قرأت یہ لکھی ہے:۔

---

[1] لیکن صاحبِ تذکرۂ مسرت افزا نے یہ شعر میر کے ترجمے میں لکھا ہے، جو درست نہیں۔

قسمت یہ جاکے دیکھو کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا (ص ۲۲۰)

میر کے دیوان میں بھی یہ شعر نہیں ملتا۔ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے ترجمۂ نیام کے تحت یہ شعر اس طرح لکھا ہے:

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

(گل رعنا ص ۱۸۸ طبع بار ششم)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
(دیکھیے گلشن بے خار ص ۱۲۶ نیز طبقات شعرائے ہند ص ۳۷۳)

اور دونوں تذکرے منولال صفا کے ترجمہ سے خاموش ہیں البتہ گلشن بے خار میں کسی صفا کے بارے میں صرف یہ فقرہ ملتا ہے "صفا تخلص از اسم و رسش آگہی دست ندارد"۔ ایک شعر بھی دیا ہے (ص ۱۲۶) تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۶۸۸ پر بھی صرف یہ عبارت ملتی ہے: "صفا نام و نشان سے اُس کے ہر مرزنا آشنا"

(۵۳) مشہور ترین مصرع ہے: وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا۔
جس شعر کا یہ مصرع ہے وہ لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی کا یہ شعر ہے:

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا (جواہر سخن جلد چہارم ص ۱۳۹)

علامہ کالیداس گپتا رضا نے جوہر کا یہ مشہور شعر بھی لکھا ہے:

(۵۴) بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں (سہو و سراغ ص ۱۰۱)

نسیم کا ایک شعر لکھنا بھی یہاں مناسب ہوگا:

(۵۵) ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

(فرہنگِ آصفیہ ۱: ۵۸۴ کالم ۲)

(۵۶) قائم چاند پوری کے درج ذیل مطلع کا مصرعِ ثانی شہرت رکھتا ہے:

دل ڈھونڈھنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے
(تین تذکرے بحوالہ مجمع الانتخاب ص ۱۰۳)

(۵۷) مسجدیں سونی پڑی ہیں، بھٹیاں آباد ہیں

یہ مصرع میر وزیر علی صبا لکھنوی کے مطلع ذیل کا ثانی مصرع ہے:

فصلِ گل ہے، زاہدوں کو غم ہے، میکش شاد ہیں
مسجدیں سونی پڑی ہیں، بھٹیاں آباد ہیں (جواہر سخن ۳، ۵۴۷)

(۵۸) جس کم سخن سے کیجیے تقریر، بول اٹھے
ہے ہم میں وہ کمال کہ تصویر بول اٹھے

(شیخ حیات اللہ گویا۔ گلشن بے خار ص ۱۶۵ نیز سخن شعرا ص ۴۰۳)

لیکن تذکرہ خوش معرکۂ زیبا مؤلفہ سعادت خاں ناصر نے اس حکایت کے ساتھ میر سعادت علی (تسکین) کے ذیل میں لکھا ہے "میاں دلگیر صاحب کہتے تھے کہ ایک دن میں شیخ ناسخ کی خدمت میں حاضر تھا کہ میر سعادت علی (تسکین) تشریف لائے۔ شیخ ناسخ نے کہا کچھ ارشاد فرمائے۔ میر موصوف (یعنی تسکین) نے شعر مرقوم الصدر پڑھا۔ ناسخ نے کہا شعر آپ کا خوب ہے اگر 'کم سخن' کی جگہ 'بے زباں' ہو تو کمال آپ کا ظاہر اور وہ نادر ہو جائے۔ میر صاحب نے دخل ان کا قبول فرمایا" (ص ۱۲۲)

لیکن گلشن بے خار، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، ناصر کے تذکرہ سے زیادہ مستند ہے۔ دوسرے شیفتہ نے اپنا تذکرہ، ناصر کے تذکرہ سے بارہ سال پہلے ختم کر لیا تھا۔ تیسرے ناصر نے اپنا ضخیم تذکرہ صرف ایک سال کی مدت میں مرتب کیا یعنی ۱۲۶۱ھ میں شروع اور ۱۲۶۲ ہجری میں ختم کیا۔ اس لئے بھی اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ "خوش معرکۂ زیبا" تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۱ نکلتے ہیں اور سالِ اختتام کا مادہ "کلامِ انتخاب اہلِ زبان کا" ہے اس سے ۱۲۶۲ برآمد ہوتے ہیں۔ چوتھے ناسخ کی اصلاح مصحفی سے بھی متعلق بتلائی جاتی ہے۔

(۵۹) غالب کا مصرع ہے: ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا پہلا مصرع یہ ہے : ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
(دیوانِ غالب نسخۂ انجمن ص ۱۲۲)

(۶۰) بہت لگتا ہے دل صحبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
(حالی - دیوانِ حالی اردو اکادمی دہلی ایڈیشن ص ۱۲۹)

(۶۱) شہزادہ مرزا فتح الملک بہادر رمز کا شعر ہے :
ہوئی صورت نہ کچھ اپنی شفا کی
دوا کی مدتوں برسوں دعا کی
(سخن شعرا ص ۱۹۱)

(۶۲) میر حسن تسکین شاگردِ مومن کے درجِ ذیل دو شعر بے حد مشہور ہیں :
نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی — بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
(دلی کا دبستانِ شاعری ص ۳۵۳)

(۶۳) خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
منقولہ مصرع خواجہ میر درد کے اس شعر کا ہے :
وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
(تذکرہ شعرائے اردو ص ۷۵)

(۶۵) الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا
(مومن دیوانِ مومن مرتبہ ضیاء احمد ص ۱)

مومن کا ایک اور مشہور شعر ہے :

(۶۶) یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا (ایضاً ص ۲۴)

مصرعِ ثانی کو کبھی کبھی لوگ اس طرح بھی پڑھ دیا کرتے ہیں:

ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(۶۷) چھوڑ کر کوئے بتاں جانا تو ہے کعبے کو جلد پھر لو تجھے بیدار خدا کو سونپا
تذکرۂ میر حسن میں مذکورہ شعر میر محمدی بیدار سے منسوب ہے (دیکھئے ص ۳۹)
مگر حقیقت میں یہ شعر میر تقی میر کا ہے اور یوں صحیح ہے:

اب تو جاتا ہی ہے کعبہ کو بت خانے سے
جلد پھر لو تجھے اے میر خدا کو سونپا

(نکات الشعرا از میر تقی میر: ص ۱۴۹)

مولانا عبدالحیٔ نے بھی یہ شعر بیدار ہی سے منسوب کیا ہے اور پہلے مصرع کی قرأت بادنیٰ تغیر یہ لکھی ہے: ع چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا تو ہے کعبے کو (گلِ رعنا ص ۲۰۵)

(۶۸) بڑا مشہور مصرع ہے: مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
یہ مصرع حالی کی ایک غزل کے مطلع کا ہے:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں (دیوانِ حالی ص ۱۱۳)

(۶۹) کھل کے گل کچھ تو بہارِ جانفزاں دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

منقولہ شعر ذوق کا ہے اور پہلا مصرع اصل میں یوں ہے:
کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی، صبا دکھلا گئے (کلیاتِ ذوق ص ۲۶۱)

(۷۰) انعام اللہ خاں یقین کا مشہور مصرع ہے:

قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

پورا شعر ہے :-

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو نرا یہ باغ نہیں

(دیوان یقین دہلوی ص ۱۶۳ از ڈاکٹر فرحت فاطمہ)

یعنی مصرعِ ثانی میں "ترا" کے بجائے "نرا" ہے۔ اگرچہ بعض مخطوطات میں "ترا" بھی لکھا ہوا ہے لیکن "نرا" میں جو چیلنج ہے وہ "ترا" میں نہیں۔

(۱۷) شاد عظیم آبادی (سید علی محمد) کے درج ذیل مصرعے کو اردو داں طبقے میں شہرت حاصل ہے:

خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور ہم کو مرنا ہے

لیکن یہ مصرعِ ثانی درست شکل میں اس طرح ہے !

پس از معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہے
خدا مجنوں کو بخشے مر گیا اور مجھ کو مرنا ہے

(شاد کی کہانی شاد کی زبانی ص ۱۱۳ ۱۹۶۱ء)

'لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم' کے پیشِ نظر اس سلسلہ کو اگرچہ اور طول دیا جاسکتا ہے۔ لیکن بخوفِ طوالت اِسے ختم کیا جاتا ہے - ۱۲-

ختم شد
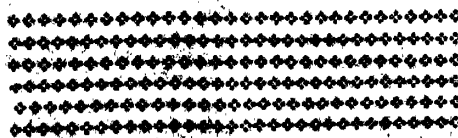
تحریک ہجرت

جنگ آزادی کا ایک بھولا بسرا باب

مختار احمد مکی، صدر شعبہ سیاسیات کریم سٹی کالج، جمشید پور، بہار

۲۰ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کے دہلی اجلاس میں گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک لالہ لاجپت رائے بپن چندر پال اور مولانا آزاد وغیرہ شریک تھے۔ اسی کانفرنس میں امرتسر کے ایک جوشیلہ و جذباتی نوجوان غلام محمد عزیز نے ہجرت کی ایک تحریک پیش کی کہ ہندوستان کے موجودہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ مسلمان یہاں رہیں۔ یہاں مسلمانوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے اور ان کی اپنی حکومت نہیں ہے یہ دار الحرب ہے اس وجہ سے مسلمانوں کے سامنے دو ہی حل رہ جاتے ہیں یا تو وہ جہاد بالسیف کریں یا یہاں سے کسی مسلم ملک کی جانب ہجرت کر جائیں (۱) لیکن کانفرنس میں موجود دوسرے مسلم رہنماؤں نے اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ غلام محمد عزیز نے وائسرائے کے نام ایک تار بھیجا کہ "چونکہ مذہب اسلام ہم کو اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا ہے اس وجہ سے ہم نہایت ہی پرامن طور پر اس ملک کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم امید کریں کہ ہندوستانی حکومت ہمارے راستہ میں کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی (۲) اس تار کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ہندوستان کے مختلف علماء

سے بذریعہ تار ہی فتویٰ بھی مانگا۔ فرنگی محل لکھنؤ کے مولانا عبدالباری کے نام بھی اسی مضمون کا ایک تار آیا۔ اس کے جواب میں مولانا نے تحریر کیا کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر قلب یا ایمان کو مطمئن نہیں کر سکتے اور اسلام کے احکام کے مطابق عمل پیرا ہیں وہ اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق ممکن ہو"۔ (۳)

اس طرح مولانا عبدالباری نے انفرادی ہجرت کی بات کی اور ان لوگوں کے لئے جائز قرار دیا جو ہجرت کرنا چاہتے تھے۔ عام ہجرت کی دعوت نہیں تھی اور نہ ہی یہ تمام لوگوں کے لئے فرض قرار دیا گیا تھا اپنے نقطہ نظر کو مزید واضح کرتے ہوئے انہوں نے ہفتہ وار اخبار مشرق گورکھپور کے ۶ر مئی ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں تفصیل سے ہجرت کی مذہبی بنیادوں اور ان کے اقسام کے سلسلہ میں تحریر کیا۔

۱۔ مکہ سے حبشہ کی جانب دو مرتبہ ہجرت ہوئی یہ دار شرک سے دار اہل کتاب یا دار ظلم سے دار عدل کی جانب ہجرت تھی۔

۲۔ مکہ سے مدینہ کے لئے جو ہجرت ہوئی وہ دارالحرب سے دارالسلام کی جانب ہجرت تھی اور یہ فرض تھی جو کہ فتح مکہ کے بعد منسوخ ہو گئی۔

۳۔ بادیہ نشین کی ہجرت مدینہ کی جانب یہ حقوق مساوات کے لئے تھی یہ بھی منسوخ ہو گئی کیونکہ یہ حکم ہوا کہ جہاں کوئی پیدا ہوا ہے اور وہاں پر نماز یا ارکان اسلام کی اجازت ہے تو اس کو ہجرت کی ضرورت نہیں۔

۴۔ دار فسق وظلم سے دار عدل وتقویٰ کی جانب ہجرت مستحب ہے بلکہ کچھ صورتوں میں تو یہ واجب ہے لیکن ہندوستان کو ہم لوگ دارالسلام سمجھتے ہیں اس وجہ سے یہ ہجرت فرض نہیں ۔۔۔ موجودہ حالت میں ہندوستان سے اگر قابل و ذی استعداد لوگ کابل ہجرت کریں یا محنتی وجفاکش لوگ ہجرت کر کے وہاں

چلے جائیں تو امید ہے کہ اسلام کو فائدہ زائد حاصل ہوگا اور اپنے وطن عزیز کی خدمت بھی ہوگی احادیث سے آخر زمانہ میں شام کی جانب ہجرت کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے ۔ (۴)

لیکن اس سے قبل ہی مولانا آزاد مسلمانوں کو مذہب کے راستہ سیاست میں داخل کرنے کے لئے کوشاں تھے ۔ رانچی سے یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہائی کے بعد ہی اور خاص طور پر فروری میں کلکتہ خلافت کانفرنس کے بعد کوشش شروع کردی اس کے لئے انہوں نے اپنی حزب اللہ جماعت قائم کر رکھی تھی ان کا خیال تھا کہ سیاست مذہب کا ہی ایک حصہ ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو مذہب کے راستہ سے منظم کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو مسلمان اپنا دینی فریضہ جانیں کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی یہ امام ہندوؤں سے معاہدہ کرکے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کردے امام کے سلسلہ میں ان کا خیال تھا کہ اس منصب کے لئے معتبر آدمی کو چننا ہوگا جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے ساتھ ہی وہ ہوشمند اور حالات حاضرہ سے کماحقہٗ واقف ہو اور اس کے لئے وہ اپنی ذات کو امامت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے اور امامت کے مسئلہ کو عام عوام میں لانے سے قبل ہی مولانا کی امامت کے لئے ملک بھر میں خفیہ طور پر بیعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تاکہ جب امامت کا مسئلہ سامنے آئے تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو اور رشک و رقابت کا سدباب ہو جائے اس طرح مسلمان ایک امام کی ذات پر متفق ہو جائیں اس کے لئے انہوں نے جگہ جگہ اپنے نمائندے بھی مقرر کر رکھے تھے جن میں مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی، مولوی محی الدین قصوری، مولوی عبدالقادر وکیل لاہوری، مولانا محمد داؤد غزنوی، عثمان صاحب بھوپالی، سردار محمد اسلم خاں

بلوچستان وغیرہ خاص تھے۔ جو لوگوں کو دعوتیں دیتے اور اپنا ہمنوا بناتے اسکے لیے ایک اچھی خاصی رقم بھی مقرر تھی ہجرت کے سلسلہ میں بھی ان کی کوشش تنظیم کے ذریعہ جاری تھی ۳۰ رجولائی کو مولانا آزاد کا ایک فتویٰ اہل حدیث امرتسر کے شمارہ میں شائع ہوا انہیں کے الفاظ میں :

"تمام دلائل شرعیہ حالات حاضرہ مصالح مہمہ است اور مقتضیات و مصالح پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے بجز ہجرت کوئی چارہ شرعی نہیں ہے ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا اسلامی عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں ۔ ۔ ۔ لیکن ہجرت سے مقدم ہجرت کی بیعت ہے بغیر بیعت ہجرت نہیں کرنی چاہیئے جو لوگ ہجرت کریں پہلے ہجرت پر بیعت کرلیں ۔ ۔ ۔ کیونکہ ہمارا مقصد اب قسطنطنیہ کا بچاؤ نہیں بلکہ اپنے ایمان کا بچاؤ درپیش ہے اور مقصود بقاء ملک نہیں بلکہ صرف بقاء ایمان ہے"[۵]

اس طرح بیعت ہجرت بالواسطہ بیعت امامت تھی اور دونوں تحریکیں مولانا آزاد ایک ساتھ چلا رہے تھے۔ مولانا آزاد کا اثر رانچی کی نظر بندی سے قبل سے ہی صوبہ سرحد اور پنجاب پر اتنا گہرا تھا کہ بقول غلام رسول مہر "جب بھی وہ لاہور جاتے تو ایک ایک لاکھ آدمی دور دراز علاقہ سے ان کو سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے" ۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد نے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور ایک تحریر لکھ کر دی کہ "وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد سلوک سنت میں ان کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ ان کے لئے ایک خطیر رقم بھی انہیں دی گئی ہے لوگوں کو کھلانے کی دعوتیں دی جائیں اور انہیں بیعت

کے لئے آمادہ کیا جائے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو آپ نے ایک خط مولوی عبدالرزاق کو لکھتے رہے کہ "پنجاب سندھ اور بنگال میں تنظیم مکمل ہے" اس طرح پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے ملاؤں نے مولانا آزاد کے اسی اثر کے تحت تحریک ہجرت پر زور دیا جیسا کہ اس فتویٰ سے ظاہر ہے کہ مولانا عبدالباری کے برعکس مولانا آزاد نے نہ صرف ہجرت کی دعوت دی بلکہ اسے فرض قرار دیا اور اس کے لئے ایک مکمل رسالہ ہجرت بھی لکھ ڈالا جس کا حوالہ خود ہی انہوں نے اپنے فتویٰ میں دیا ہے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کانگریس اور خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم سے جہاد بالسیف ہجرت اور عدم تعاون میں کسی ایک کے اختیار کرنے کی بات بھی عام طور پر کی جاتی تھی اور مسلمانان ہند مختلف جگہوں پر ان تینوں کو اختیار کئے ہوئے تھے کیرالا کے موپلا مسلمانوں نے جہاد بالسیف کا اصول اختیار کر رکھا تھا جبکہ وہ اپنے لاٹھی اور بھالے سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے بقول علامہ اقبال ؎ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ پورا ہندوستان خلافت تحریک کے زیر اثر عدم تعاون اور تحریک موالات کا نمونہ تھا جبکہ ہجرت کے لئے پنجاب اور سندھ کے مسلمان تیار تھے۔

بہرکیف ہجرت کے ان فتوؤں اور عام ماحول کے بعد پنجاب اور سندھ کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کے لئے آمادہ تھی۔ جولائی اور اگست کے مہینہ میں تقریباً اٹھارہ ہزار اپنا سب کچھ چھوڑ کر افغانستان کے لئے نکل گئے ابتداً انگریزوں کی جانب سے یہ کوشش ہوئی کہ یہاں کے مسلمان ہجرت نہ کریں لیکن جب وہ باز نہیں آئے تو بقول خان عبدالغفار خاں اس پر پورا زور لگا دیا کہ بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر کے چلے جائیں تاکہ وہ افغانستان کے لئے مشکلات پیدا کر دیں اور ہندوستان سے سیاسی کارکن نکل جائیں اس کے لئے ہجرت کمیٹی بھی بن گئی۔ (۶) انگریزوں کو افغانستان کی جغرافیائی حالات، ان

کی مالی دشواریاں جگہ اور سواری کی قلت کا اندازہ تھا اس کے علاوہ اس نے اپنے تربیت یافتہ افراد بھی اس میں شامل کر دیئے جس طرح انقلاب فرانس کے دوران حامی انقلاب میں ایسے افراد شامل تھے جو انتہائی خوں ریزیاں کرواتے اور بد امنی پھیلاتے جس کے نتیجہ میں یورپ دہل گیا تھا اور انقلاب کی رفتار رک گئی تھی اسی طرح کے گرگے ہجرت کمیٹی اور ہجرت کرنے والوں میں شامل کئے گئے۔ جو لوگوں کو ہجرت کے فتوے دکھاتے اور شرعی حکم کی تلقین کرتے ان کی زمینوں کو اونے پونے داموں میں خریدتے۔ ہجرت کرنے والوں کو سبز باغ دکھاتے جاتے کہ افغانستان پہونچتے ہی وہاں کے باشندے ابتدائے اسلام کے مہاجرین کی طرح ہاتھوں ہاتھ انھیں لیں گے، گلے لگائیں گے۔ راحت ہو گی۔ مالدار ہو جائیں گے اور چین کی زندگی ہو گی وغیرہ وغیرہ اس طرح مقامی مسجدوں کے پیش اماموں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی بھی بن آئی انہوں نے بھی فتویٰ صادر کرنے پر پورا زور لگا رکھا تھا کہ جو ہجرت نہیں کرے گا اس کا بیوی سے تعلق منقطع ہو جائے گا اور طلاق واجب ہو گی۔ بقول خان عبدالغفار خان " ہرنی ویسے ہی تیز گام تھی جب اسے گھنگھرو پہنائے گئے تو پھر کوئی آنکھ سے نہیں دیکھ سکا کہ وہ کدھر نکل گئی مردوں سے زیادہ عورتوں نے تیزی دکھائی۔" (۷)

اسی زمانہ میں افغانستان کے شاہ امیر امان اللہ خاں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ افغانستان " بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجر ہندی را پناہ بدہد"[۸] اس کے بعد تو ہجرت کی تحریک نے مزید زور پکڑا سادہ لوح مسلمانوں کے قافلہ لدے پھدے اپنا مال و متاع گھر کھیت و کھلیان کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ کر افغانستان جانے لگے ہجرت کمیٹی نے اپنا دائرہ اختیار بڑھا دیا۔ لیکن امان اللہ خاں نے اپنے وعدہ کے باوجود مہاجرین کی آبادکاری کا کوئی باضابطہ

اور مناسب انتظام نہیں کیا تھا بقول ظفر حسن ایبک" قافلے پے در پے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہونچنے لگے شروع میں انہیں خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی لیکن ان سب کے لئے قابل اطمینان انتظام ناممکن تھا بے چاری پردہ پوش عورتیں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں بعض بداخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندوزی بھی کی اکثر لوگوں نے روٹی اور کھانا خریدنے کے لئے اپنا اثاث البیت بھی فروخت کرنا شروع کیا جس کو افغانیوں نے نہایت سستے داموں میں خرید لیا۔ فارسی زبان سے بے بہرہ اور نابلد ہونا ان کی بے سائیگی، پردیش اور اس پر وفادار دوستوں کا فقدان یہ سب ایسی مصیبتیں تھیں جن کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے ان کو خود دیکھا اور سامنا کیا ہو۔ (۹)

جب کابل میں ان مجاہدین کی تعداد بہت بڑھ گئی تو ان کو افغانستان کے دوسرے صوبہ مثلاً بخشستر، قطغن، بدخشاں اور ترکستان وغیرہ کو روانہ کیا گیا کچھ لوگ تاشقند وغیرہ بھی چلے گئے خود کابل میں افغانیوں کی جانب سے سخت مخالفت ہوئی ملکی اور غیر ملکی کا سوال اٹھایا گیا انھیں افغانستان خالی کرنے کے لئے بھی کہا گیا مہاجرین نے ایران جانے کا فیصلہ کیا ایرانی اخبارات نے مہاجرین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی مدد اور پذیرائی کی خبریں شائع کیں جب یہ قافلے ایران کے لئے نکلنے لگے تو انور پاشا کا ایک خط امان اللہ خان کے نام آیا جس میں شاہ امان اللہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ مہاجرین کو ایران نہ جانے دیں ورنہ ان کی حکومت عالم اسلام میں بدنام ہو جائے گی نتیجتہً انہیں راستہ سے بلا لیا گیا اس کے باوجود تمام مشکلات اپنی جگہ باقی رہیں تنگ آکر ان کی ایک بڑی تعداد ہندوستان واپس آگئی" انگریز گرگہ اس افراتفری کو مزید ہوا دے رہے تھے لیکن اپنا اثاثہ اور جائداد جو وہ لٹا چکے تھے وہ ان

کو واپس ملنے سے رہا اس تحریک کو جیسے غیر دانشمندانہ طریقے سے اور غیر منظم اور بے سوچے سمجھے مرتب کیا گیا تھا صرف تباہی و بربادی کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہوسکا ہاں ایک دائمی سبق ضرور مل گیا کہ اپنے وطن کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ دامن نہیں۔

ظفر حسن ایبک کا خیال ہے کہ امان اللہ خاں کو یہ امید تھی کہ ہندوستان سے جو مہاجر آئیں گے وہ تعلیم یافتہ ہونگے اور اس سے وہاں کی معیشت سنبھلے گی اور ملک میں عام ترقی ہوگی (۱۰) لیکن اس تحریک کے زیر اثر جو لوگ ہجرت کرکے وہاں گئے ان کی ایک بڑی تعداد سادہ لوح ان پڑھ کاشتکاروں کی تھی افغانستان میں جتنی پریشانیاں ہوئیں اتنی ہی کوتاہ اندیشی اور بدانتظامی خود ہندوستان میں بھی ہوئی اگر ان مہاجروں کو چھوٹے چھوٹے قافلہ کی شکل میں کچھ وقفہ سے بھیجا جاتا تاکہ پہلے گروپ کے ایڈجسٹ ہوجانے کے بعد دوسرا گروپ پہونچتا تو اتنی بدانتظامی نہیں ہوتی مزید یہ کہ اگر امیر کابل کو خط لکھ کر یا کسی دوسرے ذریعہ سے یہ معلوم کرلیا جاتا کہ ان مہاجرین کی پذیرائی اور رکھنے کے انتظامات کیسے ہیں اور اسی مناسبت سے مہاجرین کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں وہاں پہونچتیں تو اس قدر دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

خان عبدالغفار خان کا کہنا ہے کہ مہاجرین کے کچھ گروہ کو امیر امان اللہ نے زمین اور نوکریاں دیں اور تجارت میں حصہ بھی دیا لیکن ان مہاجرین کا اصرار تھا کہ وہ زمین نوکری یا تجارت کی لالچ میں یہاں نہیں آئے ہیں بلکہ جہاد کے لئے اس لئے امیر ان کا ساتھ دیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کیا جاسکے امیر ان سے کہتے کہ پہلے ایک جگہ آباد ہوکر جنگ کی قوت پیدا کرلو پھر انگریزوں سے جہاد کرنا۔

غرضیکہ یہ پوری تحریک جس غیر دانشمندانہ اور ناعاقبت اندیشانہ انداز میں مرتب کی گئی تھی ان کا حشر بھی انتہائی افسوسناک رہا ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خلافت کانفرنس سے وابستہ مسلم لیڈرشپ نے اس اقدام کی شدید مخالفت کی (۱۱) ایک مذہبی معاملہ نے جگ ہنسائی اور مذاق اڑانے کا مزید ایک موقعہ فراہم کیا ان مسلمانوں کی اقتصادی حالت تو یوں بھی بہتر نہیں تھی اس کے نتیجہ میں وہ اور بھکاری بن گئے لیکن جن لوگوں نے اس تحریک کے سلسلہ میں فتویٰ جاری کئے تھے اور لوگوں کو بھڑکایا تھا بڑے اطمینان سے ہندوستان میں مقیم رہے۔

حواشی

۱۔ خان عبدالغفار خان آپ بیتی دہلی ۱۹۷۲ء ص ۴۴
۲۔ قاضی محمد عدیل عباسی ۔ تحریکِ خلافت ۔ دہلی ۱۹۷۸ء ص ۱۳۶
۳۔ " ایضاً ص ۱۳۷
۴۔ ہفتہ روزہ اخبار مشرق گورکھپور ۶ر مئی ۱۹۲۰ء قاضی محمد عدیل تحریکِ خلافت ص ۱۴۸
۵۔ غلام رسول مہر ۔ تبرکات آزاد لاہور ۱۹۵۹ء ص ۲۰۳ تا ۲۰۵
۶۔ خان عبدالغفار خاں ۔ آپ بیتی دہلی ۱۹۷۲ء ص ۴۴
۷۔ " ایضاً ص ۴۴
۸۔ اقبال حسن خاں شیخ الہند مولانا محمود الحسن حیات و کارنامہ علی گڑھ ۱۹۷۳ء ص ۳۴۹
۹۔ ظفر حسن ایبک اپنی آپ بیتی ص ۲۱۳
۱۰۔ " ایضاً ص ۲۰۳
۱۱۔ توضیح کچلو ۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو دہلی ۱۹۸۷ء ص ۳۳

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ پر ایک عظیم سیمینار کا انعقاد

مقامِ شکر ہے کہ دہلی کا نوجوان طبقہ دین ومذہب کے کاموں میں پیش پیش رہنے لگا ہے۔ چنانچہ یہ بات خوشی کی ہے کہ یوتھ ویلفیر سوسائٹی ۱۳۳۶ چوڑی والان دہلی کی طرف سے مورخہ ۳۰ رمارچ ۱۹۹۷ء بروز اتوار کو مدرسہ کریمیہ (یادگار مفسر قرآن حضرت مولانا محمد یوسف دہلویؒ) واقع چوڑی والان دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عظیم دینی وملی، علمی وفقہا اور مفسرانہ خدمات پر روشنی ڈالنے کی غرض سے شاہ ولی اللہ محدثؒ سیمینار منعقد ہوا۔ جس کی صدارت حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں سے صحبت وتربیت یافتہ حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی نے فرمائی۔ یہ سیمینار اس لحاظ سے بھی بڑا کامیاب رہا کہ اس میں ملک وملت کی عظیم دینی وعلمی اور ادبی شخصیتوں نے بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی ہندوستان کے مشہور نامور صحافی حضرات نے بھی اس سیمینار میں شمولیت کرکے اس کی اہمیت وافادیت کی ضرورت کو سمجھا اور محسوس کیا۔ اس سیمینار میں مشہور عالم دین ملت کی عظیم وہمدرد شخصیت حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی یادگار زندہ شخصیت مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب نے اپنی اختتامی تقریر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کی عظیم خدمات پر مدلل روشنی ڈالی اور ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرکے نئی نسل کو ان کی پیروی کے لئے رغبت دلائی۔ یہ سیمینار ہر

لحاظ سے ہر جہت سے دینی علمی ادبی پروگرام کا حصہ تھا جس پر ہم سب کو خوشی ومسرت ہے ۔ اور ملک وملت کی نوجوان نسل کے روشن مستقبل کی علامات کا یہ سیمینار نشان ثابت ہوا ۔ ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی یوتھ ویلفیر سوسائٹی پھوڑی والان کے کارکنان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے ۔

بیانِ ملکیت و تفصیلات

متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

مقام اشاعت : ۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

طابع کا نام : عمیدالرحمٰن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

ناشر کا نام : عمیدالرحمٰن عثمانی

سکونت : ۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ایڈیٹر کا نام : عمیدالرحمٰن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

سکونت : ۱۴۱۵، اردو بازار دہلی ۶

ملکیت : ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمیدالرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط طابع و ناشر)

عمیدالرحمٰن عثمانی

سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مئی، جون ۱۹۹۷ء

برہان

جلد نمبر ۱۲۰ شمارہ نمبر ۵-۶

الف لام میم

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

۱۲ مئی ۱۹۸۴ء دوپہر کو نماز ظہر کے معاً بعد عالم اسلام کی ایک عظیم علمی و دینی شخصیت مسلمانان ہند کے مخلص رہبر و قائد اور ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی اس جہان فانی سے عالم بقاء ہم سب کو اور ملت اسلامیہ کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت انکی وفات کو چودہ سال پورے ہو چکے ہیں ان کی وفات کے بعد سے اب تک ملت اسلامیہ جن پریشان کن مسائل سے دوچار رہی ہے وہ سب ہی پر عیاں ہیں اس دوران میں مسلمانان ہند پر کیا کیا بیتی ہے اس کی بڑی لمبی داستان ہے جس کے اظہار کے لئے بھی بہت بڑا وقت درکار ہے لیکن پھر بھی مختصراً ہم یہ بیان ضرور کریں گے۔ کہ مفتی صاحب کی رحلت کے بعد ملت اسلامیہ ہند اپنے مخلص راہنماؤں سے تقریباً تقریباً محروم ہی ہو کر رہ گئی۔ ہم یہاں یہ تو نہیں کہیں گے کہ مخلص راہنما ختم ہو گئے یہ کہنا نہ صرف غلط بلکہ حماقت ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مخلص و ہمدرد ملت راہنما قوم کی روش کو دیکھ کر یا بھانپ کر گوشہ نشین ہو گئے اور انہوں نے اپنے کو کسی بھی قومی پروگرام سے الگ ہی رکھنے میں عافیت سمجھی، حالانکہ مفتی صاحب کی رحلت کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر ایک عدالتی فیصلے کے ذریعہ مسلم پرسنل لا کی صورت میں جو قہر ٹوٹا تھا وہ کوئی کم تکلیف کا زخم نہیں تھا بلکہ بڑی شدت کا قہر آلود زخم تھا لیکن اس وقت حضرت مولانا

[illegible] تادیر سلامت رکھے نے ملت

[illegible] ں اور اس مسئلہ کو ارباب اقتدار سے اس طرح حل کرایا کہ کسی کی
نکسیر تک نہ پھوٹی اور پارلیمنٹ تک کی منظوری سے وہ عظیم الشان کام کرادیا
جس پر واقعی حیرت ہی ہوتی ہے اور یقیناً یہ عظیم الشان کام ملت اسلامیہ
ہند کے لئے مدتوں فلاح و بہبودگی اور دینی حیثیت سے ہر طرح اطمینان
کا باعث ہی رہے گا۔ لیکن اس کے بعد ایک مسئلہ مسلمانانِ ہند کے سامنے
بابری مسجد کی صورت میں پیدا کیا گیا اور اس میں ہندوستان کی فرقہ پرست
طاقتوں نے جس منصوبہ بندی عیاری و مکاری کے ساتھ دلچسپی لی اسے
مسلمانانِ ہند کے سیاسی قائدین نے کبھی بھی سنجیدگی سے دیکھنے کی شاید
ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس مسئلہ کے منظر عام پر آنے سے مسلمانوں کے
کئی قائد بذاتِ خود تو یقیناً فائدہ میں ہو گئے اور انھیں قوم کی لیڈری کی
رجسٹری و پارلیمنٹ کی ممبری بھی مل گئی لیکن ملت کو اس سے جس قدر نقصان
اٹھانا پڑا ہے اس کا صحیح حساب و کتاب تو انشاء اللہ مستقبل میں کوئی تاریخ
داں تاریخ میں مرقوم کریگا مگر ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ کتنے ہی گھر اجڑ گئے
سینکڑوں نہیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور اتنی ہی عورتیں بیوہ بھی ہو گئیں
ملت کی سینکڑوں خواتین اپنی عصمت ہی کو بچانے میں دربدر بھٹکتی رہیں
اس پر بھی انھیں ناکامی ہی ہاتھ لگی ہائے رے وہ دن وہ راتیں جب ملت کے
لئے بابری مسجد کے انہدام کی خبریں مصیبتوں و پریشانیوں اور قتل و غارت
گری کا باعث ہوئیں۔ کون انھیں بھلائے گا اور کون ہوگا جو اس درندگی و
وحشت کو فراموش کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ملت کے قائدین نے

نظرات

۱۲ مئی ۱۹۸۴ء دوپہر کو نماز ظہر کے معاً بعد عالم اسلام کی ایک عظیم علمی و دینی شخصیت مسلمانان ہند کے مخلص رہبر و قائد اور ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی اس جہانِ فانی سے عالم بقا ہم سب کو، اور ملتِ اسلامیہ کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس وقت انکی وفات کو چودہ سال پورے ہو چکے ہیں ان کی وفات کے بعد سے اب تک ملتِ اسلامیہ جن پریشان کن مسائل سے دوچار رہی ہے وہ سب ہی پر عیاں ہیں اس دوران میں مسلمانانِ ہند پر کیا کیا بیتی ہے اس کی بڑی لمبی داستان ہے جس کے اظہار کے لئے بھی بہت بڑا وقت درکار ہے لیکن پھر بھی مختصراً ہم یہ بیان ضرور کریں گے۔ کہ مفتی صاحب کی رحلت کے بعد ملت اسلامیہ ہند اپنے مخلص راہنماؤں سے تقریباً تقریباً محروم ہی ہو کر رہ گئی۔ ہم یہاں یہ تو نہیں کہیں گے کہ مخلص راہنما ختم ہو گئے یہ کہنا نہ صرف غلط بلکہ حماقت ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مخلص و ہمدرد ملت راہنما قوم کی روش کو دیکھ کر یا بھانپ کر گوشہ نشین ہو گئے اور انہوں نے اپنے کو کسی بھی قومی پروگرام سے الگ ہی رکھنے میں عافیت سمجھی، حالانکہ مفتی صاحب کی رحلت کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر ایک عدالتی فیصلے کے ذریعہ مسلم پرسنل لاء کی صورت میں جو قہر ٹوٹا تھا وہ کوئی کم تکلیف کا نہیں تھا بلکہ بڑی شدت کا قہر آلود زخم تھا لیکن اس وقت حضرت مولانا

سید ابوالحسن علی ندوی کی محترم و معظم شخصیت اللہ انہیں تادیر سلامت رکھے نے ملت کی مخلصانہ راہنمائی کی اور اس مسئلہ کو ارباب اقتدار سے اس طرح حل کرایا کہ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی اور پارلیمنٹ تک کی منظوری سے وہ عظیم الشان کام کرا دیا جس پر واقعی حیرت ہی ہوتی ہے اور یقیناً یہ عظیم الشان کام ملت اسلامیہ ہند کے لئے مدتوں فلاح و بہبودگی اور دینی حیثیت سے ہر طرح اطمینان کا باعث ہی رہے گا۔ لیکن اس کے بعد ایک مسئلہ مسلمانانِ ہند کے سامنے بابری مسجد کی صورت میں پیدا کیا گیا اور اس میں ہندوستان کی فرقہ پرست طاقتوں نے جس منصوبہ بندی عیاری و مکاری کے ساتھ دلچسپی لی اسے مسلمانانِ ہند کے سیاسی قائدین نے کبھی بھی سنجیدگی سے دیکھنے کی شاید ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس مسئلہ کے منظر عام پر آنے سے مسلمانوں کے کئی قائد بذاتِ خود تو یقیناً فائدہ میں ہو گئے اور انھیں قوم کی لیڈری کی رجسٹری و پارلیمنٹ کی ممبری بھی مل گئی لیکن ملت کو اس سے جس قدر نقصان اٹھانا پڑا ہے اس کا صحیح حساب و کتاب تو انشاء اللہ مستقبل میں کوئی تاریخ داں تاریخ میں مرقوم کریگا مگر ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ کتنے ہی گھر اجڑ گئے سینکڑوں نہیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے اور اتنی ہی عورتیں بیوہ بھی ہو گئیں ملت کی سینکڑوں خواتین اپنی عصمت ہی کو بچانے میں دربدر بھٹکتی رہیں اس پر بھی انھیں ناکامی ہی ہاتھ لگی ہائے رے وہ دن وہ راتیں جب ملت کے لئے بابری مسجد کے انہدام کی خبریں مصیبتوں و پریشانیوں اور قتل و غارت گری کا باعث ہوئیں۔ کون انھیں بھلائے گا اور کون ہو گا جو اس درندگی و وحشت کو فراموش کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ملت کے قائدین نے

بابری مسجد کے سلسلے میں اپنی ناعاقبت اندیشہ کا جس طرح مظاہرہ کیا اس پر اس قسم کی تباہی و بربادی کا نظارہ دیکھنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی "قائدین" کی بیکار کی "جذباتیت" نے جو کھیل و تماشہ دکھایا وہ کبھی نہ ہوتا اگر مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ جیسے رہنمایانِ ملّت موجود ہوتے بار بار ان کی یاد آتی ہے ان کی یاد تازہ ہوتی ہے تو وہ یوں ہی نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بہت سے حقائق ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمان جس کسمپرسی کے عالم میں تھے اس وقت تو اس کا کوئی تصوّر بھی نہیں کرسکتا ہے۔ اس وقت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمانؒ، مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ جیسے مخلص و ہمدرد اور دانشورانِ ملّت موجود تھے اللہ کے فضل و کرم سے اور ان کی مدبرانہ قیادت نے ملّت کو آزاد ہندوستان میں باوقار مقام کا مالک بنادیا اجڑے ہوئے لوگ بس گئے۔ تعصب و تنگ نظری کے فضا میں اس تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی کہ حیرت ہی ہوتی ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کو غدّار کہتے تھے وہ ہی انھیں قوم پرست کہنے پر مجبور ہوئے۔ جو فرقہ پرستی کی باتیں کرتے تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے ہی کوشاں ہوگئے۔ یقیناً اس میں مخلص قائدین کی دانشورانہ اور صبر و تحمل اور خالی جذبات سے عاری باتوں کا پورا پورا دخل تھا۔ بابری مسجد کے سانحہ کے وقت مسلمانانِ ہند نے اپنے قائدین مرحوم کی کمی کو زبردست شدت کے ساتھ محسوس کیا لیکن جو خدا کی مرضی اس کے سامنے کسی کی مرضی کو کیا دخل ہوسکتا ہے۔ مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے وہ جذبات و غصّہ سے عاری

تھے۔ ہمیشہ ہی صبر و تحمل کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ غریبوں و مسکینوں سے ان کی ہمدردی و لگاؤ خاص بات تھی وہ دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین رہے مدتوں ممبر رہے وہاں انھوں نے وقف مسائل کو بڑی خوبی سے حل کیا اور مستقبل کے لئے وقف جائداد و املاک کی حفاظت کا قابل تحسین انتظام کیا۔ وہ بیرونِ ملک بھی گئے۔ بیرون ملک کی اچھائیوں و خوبیوں کو نوٹ کیا اور واپسی میں اپنے ملک والوں کو اپنے مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ دینی مدارس میں ان کی تقاریر طلباء کے لئے مشعل راہ ہوتیں۔ آج چودہ برس ہوگئے ان کی رحلت کو مگر انکی یاد اب بھی تازہ ہے ان کے عظیم الشان کارنامے جو قوم و ملک کی فلاح و بہبودگی کے نقطۂ نظر سے انہوں نے انجام دیئے وہ تاریخ میں زریں عنوان سے ثبت ہوں گے اور ان کے اصول ان کی نیکیاں ان کے اچھے اعمال حسن و تدبر کی باتیں مخلصانہ و ہمدردانہ ملت سے بھرپور خوبیاں قیادت کی یاد مدتوں عالم اسلام اور ملک و قوم کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا سرمایہ کی طرح باقی رہے گی انشاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ اس مرد مومن مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

حج کے موقع پر امسال منٰی میں حاجیوں کے خیمے میں زبردست آگ سے تباہی و بربادی کا بڑا ہی ہولناک حادثہ پیش آیا۔ سینکڑوں جاں بحق ہوئے اور ہزاروں حاجی لا پتہ و زخمی ہوگئے۔ نیوز ایجنسی اور اخبارات کی رپورٹ کے مطابق تقریباً ۷۰ ہزار خیمے جل کر خاکستر ہوگئے۔ یہ حادثہ "آگ کیوں

اور کیسے پیش آیا۔ اس کی مختلف وجوہات بیان کی جارہی ہیں مگر معتبر وجہ جو سننے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں کے اکثر حاجی علم و واقفیت سے کورے ہوتے ہیں اور وہ ان مبارک ایام میں خورد و نوش کا سامان لے جاکر وہاں چولہے جلا کر کھانا پکاتے ہیں چنانچہ کسی حاجی کا کھانا پکاتے ہوئے گیس سلنڈر پھٹ گیا اور یہ زبردست حادثہ رونما ہوگیا۔ غلطی کریں ایک دو لوگ ہی، اور اس کا خمیازہ بھگتیں سینکڑوں و ہزاروں بلکہ لاکھوں ہی لوگ یہ کس قدر شرم و افسوس کا مقام ہے غنیمت ہے کہ آگ دوپہر کو لگی اگر خدا نخواستہ یہ آگ رات میں لگ جاتی تو آناً فاناً لاکھوں حاجی لقمۂ اجل ہو جاتے اللہ پاک نے خیر کی ۔ اور بڑی تباہی سے پھر اس کے فضل و کرم نے بچا لیا۔ سعودی حکومت نے اس مشکل میں جس مستعدی سے اس آگ پر قابو پایا اور بڑے زبردست جانی نقصان سے بچایا وہ قابل تعریف ہے ریلیف و امدادی کام میں جس تیزی کے ساتھ عمل ہوا اس کی بھی جتنی بھی تعریف سعودی حکام و حکومت کی کیجائے کم ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ متاثرین حادثہ کی مدد فرمائے۔ آمین ثم آمین

آئندہ کے لئے اس قسم کے حادثات سے بچاؤ کے لئے ٹھوس اور مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ سب سے ضروری یہ ہے کہ ایسے مواقع پر کھانے پکانے کی اور تیل و گیس اور پٹرول کی اشیاء رکھنے یہاں تک بیڑی سگریٹ پینے تک پر سخت ترین پابندی لگا دینی چاہیئے۔ اس پر کسی کو برا ماننے کی بھی ضرورت نہیں ہے آخر آپ اسلام کا ایک بنیادی رکن حج ادا کرنے اور رضا و خوشنودی الٰہی حاصل کرنے جا رہے ہیں کہیں کسی پکنک پر تو نہیں — ہمیں امید ہے کہ سعودی حکومت

ہماری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرکے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔

جس کسی نے بھی یہ بات کہی ہے صحیح اور سچ کہی ہے کہ بعض دفعہ کوئی شکل بھی خیر بن کر آتی ہے۔ جب کانگریس نے دیوگوڑا حکومت سے اپنی حمایت واپس لینے کا خیال و اعلان ظاہر کیا تو پریشانیوں اور مشکلات کے بادل ہندوستانی سیاست پر چھا گئے۔ اور سیکولر خیال کے لوگ وان کی جماعتیں تو عجیب سے کشمکش میں ہو گئیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کیونکہ پارلیمنٹ میں کانگریس کی حمایت کے بغیر سیکولر پارٹیاں اپنی حکومت کسی بھی طرح نہیں بنا سکتی ہیں اور دوسری صورت میں یا تو معلوم و معروف فرقہ پرست جماعت کی حکومت بن سکتی تھی یا پھر ملک میں دوبارہ انتخابات ہوتے جس سے ملک کی معیشت بری طرح متاثر ہوتی، ہندوستانی عوام مہنگائی کے مار کے بوجھ تلے دب کر ہی رہ جاتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بہت جلد یہ مشکل ٹل گئی اور کانگریس کو ہوش آیا سمجھ آئی اور اس نے اپنی حمایت صرف ایک آدمی جناب دیوگوڑا سے واپس لی تھی جماعتوں سے نہیں۔ جس کی وجہ سے بڑی تلاش و جستجو کے بعد جناب آئی کے گجرال وزیر اعظم کی حیثیت سے ملک کو نصیب ہو گئے کانگریس نے متحدہ محاذ کو اپنی حمایت دیدی اور جناب آئی کے گجرال ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہو گئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ دیوگوڑا جی یقیناً اچھے ایماندار شخص ہیں ان کی دس ماہ کی حکومت نے ان کی یہ خوبی ملک والوں پر ظاہر کر دی تھی انھوں نے ملک کی قیادت بھی بڑی قابلیت سے کی مگر ان کے سیکولر کردار سے ملک والے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے بیشک وہ سیکولر کردار کے مالک

تھے لیکن اس بارے میں ملک کے بیشتر عوام کچھ جانتے ہی نہ ہوں تو پھر اس کا تذکرہ ہی بیکار ہے جناب آئی کے گجرال کے سیکولر کردار سے نہ صرف اندرون ملک سبھی عوام کو جانکاری ہے بلکہ بیرون ملک میں بھی ان کے اسی سیکولر کردار کی خوب دھوم مچی ہوئی ہے اور یہ ہندوستان کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ ہندوستان کا وزیراعظم جواہر لال نہرو کے بعد ایک ایسا شخص ہوا ہے جو علم و قابلیت میں تو ہے ہی بے نظیر صاف ستھرے عمل و کردار سیکولر قدروں پر پورا کھرا اترا ہوا ہے. ملک کی تمام اقلیتیں ان کے وزیراعظم کا حلف لیتے ہی خوشی و مسرت سے جھوم گئیں، اردو والے تو انھیں بڑے عرصے سے جانتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرصہ دراز سے ان کے نام کی قصیدہ خوانی کرتے ہی آ رہے ہیں کیونکہ انہوں نے ہندوستان میں اردو زبان کی زبوں حالی کی طرف ارباب اقتدار کو توجہ دلائی اور ان کے سامنے اردو زبان کی فلاح و بہبودگی کے لئے ٹھوس و مفید اور جامع تجاویز و پروگرام ایک رپورٹ کی شکل میں المعروف گجرال رپورٹ، پیش کرکے اپنی نیکی و انسانیت، شرافت اور تعصب سے پاک شخصیت کا تعارف کرایا ہوا ہے. خدا سے دعاء ہے کہ وہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے سالہا سال تک وزیراعظم بنے رہیں ان کو صحت و سلامتی نصیب ہو.

(قسط ۱)

محدثین اور اصولیین کے نزدیک

خبر مشہور کی کیا تعریف و اہمیت ہے؟

مولانا اشتیاق اختر اصلاحی، ای ۲۹، قدم کا باغ، حیدر گنج لشکر گوالیار

علما اور محدثین سب اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی شریعت میں قرآن کریم کو ہی بنیادی اہمیت ہے اور چاروں بنیادوں میں کتاب اللہ ہی کو بنیادی مرکز قرار دیا گیا ہے یہ خدائی کتاب ان اوامر کی اطاعت کو واجب ٹھہراتی ہے جس کا آنحضورؐ نے کرنے کا حکم دیا ہے اور جس کی توصیف قرآن حکیم نے اس طرح کی ہے" وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" (سورۃ النجم الآیۃ: ۳-۴)

ترجمہ: (اور آپ ہویٰ اور خواہش سے نہیں بولتے بلکہ آپ کا بنیادی مرکز وہ وحی ہے جو آپ پر اتری ہے)

یہ دونوں آیتیں آنحضورؐ کے منصب رسالت کی اہمیت کو ثابت کرتی ہیں۔ وحی کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم وحی متلو ہے یعنی وہ وحی جسمیں معجزہ بھرا قرآن نازل ہوا۔ اور دوسری وحی غیر متلو کہلاتی ہے جو وحی کی طرح تو نازل نہیں ہوئی اور نہ ہی قرآن کی طرح تالیف شدہ ہے اور نہ ہی معجزوں سے بھرپا ہوئی ہے لیکن وہ آنحضورؐ سے روایت کی جاتی ہے اور بار بار اس کو

پڑھا جاتا ہے یہ ہی وہ خبر وارد ہوتی ہے جو آنحضورؐ سے بار بار منقول ہوتی ہے اور خبر وہ بھی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے وضاحت کے ساتھ بار بار دہرائی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔" لتبین للناس ما نزل الیھم"
ترجمہ: تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان حقائق کی وضاحت کرد وجوان کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔ (سورہ النحل الآیۃ: ۴۴)

قرآنی ہدایات سے ہم کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس دوسری قسم کی وحی کی اطاعت کو واجب ٹھہرایا اس کا نام سنت یا حدیث ہے جس طرح پہلی قسم کی وحی متلو یعنی قرآن حکیم کے احکام و ہدایات کی پیروی کرنا فرض ہے اسی طرح وحی غیر متلو کے احکام و ہدایات کو ماننا بھی واجب ہے اور ان دونوں میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

" واطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول "۔ (سورۃ النساء الآیۃ (۵۹)
ترجمہ: اور خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)

اس طرح پہلی بنیاد قرآن مجید قرار پائی اور دوسری بنیاد سنت کہی جاتی ہے اور اس پر خبر کا اطلاق ہوتا ہے۔ (بحوالہ الاحکام فی اصول الاحکام علامہ ابن حزم الظاہری: ۱/۲۸ المطبوعہ بمکتبہ مصر ۱۳۴۵ ہجری)

سنت اور اصطلاح کی زبان میں خبر کی تعریف

الخبر جیسیں خ اور ب پر زبر ہوتی ہے یہ الخبار سے مشتق ہے الخبار ایسی زمین کو کہتے ہیں جو نرم اور رگ گدی زرخیز ہوتی ہے اس پہلو سے خبر کو خبر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے بہت سے لوگوں کو فائدے حاصل ہوتے ہیں جس طرح نرم زمین اس وقت بہت گرد و غبار اڑاتی ہے جب اس پر کھر والے گھوڑوں کے کھر دھنستے ہیں۔ خبر قول کی مخصوص قسم کہلاتی ہے اور

زبانی کلام کی بھی مخصوص قسم ہوتی ہے اور اس کو قول کے علاوہ جگہوں پر بھی استعمال
کیا جاتا ہے جیسے شاعر کا یہ قول: "تخبرک العینان والقلب کاتم"
ترجمہ: (آنکھیں تم کو خبر دیتی ہیں اور دل اس کو چھپائے رکھتا ہے کیونکہ وہ خاموش
رہتا ہے) اور معری کا یہ شعر:

نبئت من غرباء لیس علی شرع ❊ یخبرنا ان الشعوب الی صدع

یہ ایسے اجنبی لوگوں کی طرف سے خبر آئی ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں
اور یہ خبر ہم کو یہ بتا رہی ہے کہ قبیلے آپسی لڑائی جھگڑوں میں مشغول ہیں۔
(بحوالہ سمرقندی ابوبکر محمد بن محمد: میزان الاصول فی نتائج العقول: ۲۲ المطبوعہ دار
احیاء التراث الاسلامی، قطر ۱۴۰۴ء)

اصطلاحی زبان میں خبر اس کو کہا جاتا ہے جو سچ یا جھوٹ سے خالی نہیں ہوتی اور
لغت میں خبر کا مخصوص صیغہ ہے جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کوئی خبر دی جا رہی ہے
جیسے کہا جائے زید کھڑا ہوا ہے اور عمرو بیٹھا ہوا ہے یا اس طرح اور دوسرے جملے
استعمال کیے جائیں یہ سب خبر کہلاتی ہیں اور اشعریہ کا یہ مسلک ہے کہ خبر کا مخصوص
صیغہ نہیں ہوتا جو یہ بتاتی ہے کہ جو خبر دی جا رہی ہے اس میں فتنہ و فساد کی
امید ہے اس پہلو سے اہل سنت نے خبر کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے ان کے
نزدیک اسمیں امر و نہی کے احکام خبر و معلومات کے حقائق و معارف۔ امر و نہی
کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ (افعل) یہ کام کرو اور نہی یہ ہوتی ہے (لا تفعل) یہ کام مت
کرو۔ اور خبر یہ ہوتی ہے جیسے تم کہو زید گھر میں ہے۔ اور استخبار (یعنی چھان
بین) یہ ہوتی ہے کہ تم کہو (انا بافی الدار) میں گھر میں زیادتی کرتا ہوں تو
اس صورت میں خبر وہ سچی ہو جائے گی جس کو ہم نے بیان کیا (بحوالہ اللمع فی اصول الفقہ

۱۶۱ العلامہ الشیرازی ابو اسحاق الشیخ محمد صالح احمد منصور الباز مکۃ المکرمۃ ۱۴۰۵ھ

بعض اہل الاصول کے نزدیک مخصوص صیغہ کے ساتھ جو کلام مخصوص ہو اور اسکی خبر دی جائے اور اس بارے میں لوگوں کو معلومات بتائی جائیں لیکن اس میں اشارہ اور دلالت شامل کر دی ایسی دخل نہ ہو کیونکہ اس صورت میں وہ کلام نہیں ہوگا چاہیے اس کے باب میں معلومات بیان کر دی جائیں اور ان کا علم حاصل ہو جائے۔ خبر اس کلام کو کہا جاتا ہے جو تکلیف کے معنٰی سے خالی ہو اور کلام پورا کا پورا تعریف اور تکلیف میں شامل ہوتی ہے اور تکلیف کا مفہوم امر و نہی ہوتا ہے یعنی وہ خبریں جنمیں حکم اور منع کا حکم ہو۔ اس کے برخلاف تعریف خبر اور معلومات فراہم کرنے ۔ پکارنے، تمنّا و آرزو کرنے کے ہوتے ہیں اور یہ تمام امور اور حقائق خبر کی تعریف اور معنٰی میں شامل ہوتے ہیں بحوالہ (میزان الاصول ص ۳۲۱)

خبر کی قسمیں

محدثین اور اہل اصول خبر کو متعدد حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک تقسیم اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ خبر جب ہم تک پہنچتی ہے تو ہم کو اس پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے تو محدثین اور اصولین اس تقسیم کے باب میں آپس میں مختلف ہیں اس کے بعد اصولین اس باب میں علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اس کی تقسیم دوسرے پہلو سے کرتے ہیں اس طرح خبر کی تقسیم کے بارے میں چار مسلک اختیار کئے گئے ہیں ۔

۱۔ حنفیہ لوگوں کا مسلک (۲) جمہور اہل اصول کا مسلک (۳) بعض اصولین کی رائے (۴) محدثین کی رائے ۔

۱۔ حنفیہ حضرات کا مسلک

حنفیوں کا یہ مسلک ہے کہ خبر کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) خبر متواتر (۲) خبر مشہور (۳) خبر آحاد۔

(بحوالہ اصول البغدادی ص ۱۱۹ علامہ البغدادی فخر الاسلام)

فخر الاسلام البغدادی جمہور فرماتے ہیں۔ (آنحضورؐ سے جو احادیث اور اخبار منقول ہوئی ہیں ان کے بھی مختلف درجات اور مراتب ہوتے ہیں۔ بغیر کسی شک و شبہ کے آنحضورؐ تک خبر کا سلسلہ پہنچتا ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں شکوک و شبہات لفظی ہوتے ہیں تیسرا طریقہ وہ ہوتا ہے جس میں معنوی طور سے شکوک و شبہات ہوں۔ خبر کا پہلا درجہ وہ کہلاتا ہے جو متواتر نہ ہو اور جس کو بیان کرنے والے بھی بہت ہوں۔ اور دوسری خبر کی قسم وہ ہے جو مشہور ہو اور حکم بھی بہت سے بیان کریں۔ اور تیسری خبر کی قسم وہ ہے جس کو خبر آحاد کہا جاتا ہے جسکو بیان کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔

۲۔ جمہور اصولیین کا مسلک

جمہور اصولیین جن میں شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ اور ظاہریہ سب شامل ہوتے ہیں کا یہ مسلک ہے کہ سنت کو تین قسموں میں بانٹا گیا ہے۔

۱۔ خبر متواتر	(۲) خبر آحاد

ان کے نزدیک خبر مشہور کی علیحدہ سے کوئی تقسیم نہیں کیونکہ یہ کوئی مستقل بالذات قسم نہیں ہے جیسا کہ ابن قدامہؒ نے تحریر فرمایا ہے (جسکو خبر پہنچے تو اس خبر کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے خبر متواتر اور خبر احاد لیکن جمہور لوگوں کی یہ رائے ہے کہ خبر آحاد کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

(۱) الخبر المشہور	(۲) خبر الواحد

بحوالہ روضۃ الناظر و جنۃ المناظر: ۴۶ سلامۃ بن قدامۃ المطبوعۃ القاہرہ سنہ ۱۱۳۹ھ

بحوالہ: الاحکام فی اصول الاحکام، ۱/۲۴۳ علامہ ترمذی سیف الدین المطبوعۃ المعارف القاہرۃ سنہ ۱۳۳۲ھ)

۳۔ بعض اصولیین کی رائے

اس باب میں علامۃ الماوردی نے منفرد مسلک اختیار کیا ہے وہ خبر کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) الخبر المستفیض (۲) الخبر المتواتر (۳) خبر الآحاد

علامہ الماوردی تحریر فرماتے ہیں۔ رہی خبریں تو وہ تین قسموں میں منقسم ہوتی ہیں ایسی خبریں جن کو بہت سے بیان کیا ہو اور بہت سے فائدہ اٹھایا ہو (۲) ایسی خبریں جو (۳) وہ خبریں جن کو بہت سے لوگوں نے بیان کیا ہو۔ بحوالہ (ادب القاضی علامہ الماوردی : ۱/۳۷ و تحیۃ الارشاد المطبوعہ بغداد ۱۳۹۱ھ)

اور علامۃ التراقی کی یہ رائے ہے کہ سنت و فقہ کی زبان میں خبروں کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

(۱) المتواتر و الآحاد (۲) خبر نہ تو متواتر ہو اور نہ ہی آحاد ہو (۳) وہ خبر چند آدمی نے بیان کی ہو۔ لیکن زیادہ تر قرینہ یہ بتلاتے ہوں کہ یہ خبر صحیح ہے تو اس کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

بحوالہ (شرح تنقیح العقول ص ۱۵۱ (العلامہ عراقی احمد بن ادریس) مطبعۃ الخیر مصر ۱۳۰۶ھ)

اوپر کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حنفی، ماوردی اور التراقی سنت کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں اگرچہ کسی قدر ان میں ان کے ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے برخلاف اس کے جمہور علماء نے خبر کی ایک قسم خبر ثنائی بھی مقرر کی ہے۔

۴۔ محدثین کا مسلک

محدثین جمہور اصولیین سے سنت کی بنیادی تقسیم میں متفق ہیں وہ بھی سنت خبر آحاد اور خبر

متواتر میں تقسیم کرتے ہیں لیکن وہ خبر واحد کی تقسیم کے باب میں مختلف ہیں وہ خبر واحد کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ مشہور، عزیز اور غریب اور اس کو فرد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمود الرحمان اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

" جو خبر ہم تک پہنچی ہے وہ دو قسموں میں منقسم ہوتی ہے اگر یہ خبر جن طریقوں سے پہونچی ہے اگر ان میں تعداد متعین نہیں ہے تو اس کو متواتر کہتے ہیں اور اگر یہ خبر جن طریقوں سے پہونچی ہے وہ متعین تو اس خبر کو آحاد کہا جاتا ہے اس طرح خبر آحاد بھی تین قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے ۔ (مشہور، عزیز اور غریب)

بحوالہ مصطلح الحدیث محمود الرحمان صفحہ ۱۸- ۲۱ المطبوعہ دار الکتاب (الاسلامیہ)

سابقہ تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین اور اصولیین خبر کی تقسیم کے بارے میں ضرور آپس میں مختلف ہیں ۔ پھر اصولیین بھی آپس میں اس باب میں مختلف ہیں اس تجزیہ کے بعد ہم خبر مشہور کے موضوع پر گفتگو کریں گے جس کو کبھی کبھی خبر مستفیض کہا جاتا ہے اس سلسلہ میں اصولیین اور محدثین کا موقف اس طرح ہے ۔

لغت کی زبان میں المشہور کی تعریف

المشہور اسم مفعول ہے جو مصدر شہر یشھر سے ماخوذ ہے جیسے کہا جاتا ہے " شھرت الامر " تم نے معاملہ کی شہرت کر دی اور علانیہ طور پر اس کو ظاہر کر دیا اور اس اعتبار سے سبب المشہور کر دیا گیا جیسا کہ لغت لسان العرب میں منقول ہے ۔ (مشھور ظھور الشیئ فی سنعة حتی

يشهره الناس وفي الحديث من
لبس ثوب شهرة ألبسه الله ثوب مذلة : واشهرة
وقال ابن سيدة : والشهر العدد المعروف من الايام سمي بذلك لأنه يشهر با وفيه علامة ابتدائه وانتهائه (لسان العرب)
كتاب الشين باب الراء (تحقيق على مشتري)
(شہر کا لغت میں یہ مفہوم ہے کسی چیز کو اس انداز میں ظاہر کرنا کہ سب لوگ اس کو جان جائیں اور لوگوں میں اس کی شہرت ہو جائے جیسے حدیث میں ہے جو شہرت کے لباس میں ملبوس ہوتا ہے خدا تعالیٰ اس کو رسوائی اور ذلت کا لباس پہنا دیتا ہے اور ابن سیدہ کا یہ کہنا ہے کہ اشہر اس مخصوص و معروف مہینہ کو کہا جاتا ہے جو بہت سے دنوں سے ملکر بنتا ہے اور اسی لئے شہر کو مہینہ کہا جاتا ہے کہ اس کی شہرت چاند سے ہو جاتی ہے اور اس میں ابتداء اور انتہا کی نشانی ہوتی ہے) (بحوالہ لسان العرب کتاب الشین)
فقہی اصطلاح میں الشہور کا مفہوم مختلف ہے اور اس کی چار تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) حنفیہ کے نزدیک الشہور کا مفہوم (۲) جمہور اصولیین کے نزدیک الشہور کا مفہوم (۳) بعض اصولیین کے نزدیک الشہور کا مفہوم (۴) محدثین کے نزدیک الشہور کا مفہوم۔

۱۔ حنفیہ کے نزدیک خبر مشہور کا مفہوم

حنفیہ الشہور کو سنت کی مستقل قسم قرار دیتے ہیں اور یہ وہ قسم ہوتی ہے جس میں صورت کی مشابہت تو ہوتی ہے لیکن معنیٰ کی نہیں یعنی اس کو اصل میں آحاد میں سے شمار کیا جاتا ہے آغاز میں یہی مفہوم تھا پھر دوسری صدی میں خبر کے اتنے متعدد مفہوم مقرر کرنے

گئے کہ ان کے جھوٹ کے بارے میں کثرت کے سبب متفق ہونا ناممکن تھا اس لئے علماء خبر کے متعدد مفہوم قبول کرتے گئے لیکن حنفیہ کے نزدیک المشہور کا مفہوم اس حدیث کا ہوتا ہے جس کو اتنے زیادہ راویوں نے بیان کیا ہو جن سب کے جھوٹ کے بارے میں متفق ہونا ناممکن نظر آتا ہو اس لئے علماء نے اس مفہوم کو قبول کر لیا اور اسی پر سب عمل کرنے لگے۔ لیکن اصل کے اعتبار سے یہ آحاد کی قسم میں سے ہوتی ہے اور فرعی پہلو سے اس کو متواتر خبر کہا جاتا ہے جیسا کہ علامہ عبدالعزیز البخاریؒ نے وضاحت فرمائی ہے وہ تحریر کرتے ہیں (خبر مشہور کا مفہوم ہوتا ہے کہ اسمیں صورتاً تو مشابہت ہوتی ہے لیکن معنوی پہلو سے یکسانیت نہیں ہوتی اور اس کو اس پہلو سے خبر متصل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اصل کے اعتبار سے اس کو بھی خبر احاد ہی مانا جاتا ہے اور دونوں صورت یگانگت پائی جاتی ہے جب امت اسلامیہ اپنی عدالت اور مذہبی عدم توازن کے سبب اس کو قبول کر لیتی ہے تو خبر مشہور خبر متواتر کے درجہ میں شریک ہو جاتی ہے یہ اعتبار اور بھروسہ دوسری اور تیسری صدی ہجری تک رہا اس کی شہرت ہوتی رہی لیکن بعد کی صدیوں میں اشتہار کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ان صدیوں میں خبر آحاد بہت مشہور ہو گئی تھی اور خبر مشہور کو لوگ بھول چکے تھے۔ (بحوالہ کشف اسرار شرح اصول البزدوی ۲۰/۶۸۸ علامہ عبدالعزیز البخاری المطبوعہ بمکتبۃ الصنائع قسطنطنیہ)

سابقہ تجزیہ سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ حنفیہ کے نزدیک المشہور اس خبر کو کہا جاتا ہے جس میں تین شرطیں موجود ہوں۔

(۱) خبر مشہور آحاد کی اصل سے ہو (۲) خبر مشہور خیر القرون کے زمانہ میں اس

طرح پھیل گئی ہو کہ وہ تواتر کی حد کو پہنچ گئی (۳) انہیں صدیوں کے علماء نے خبر مشہور کا بھی مفہوم اخذ کیا ہو اور اس پر ان کا عمل رہا ہو۔

خبر آحاد جب ان تین شرطوں سے متصف ہو تو اسکو مشہور کیا جاتا ہے حنفیہ اپنے اس موقف کی تائید میں آنحضورؐ کی اس حدیث کو بیان کرتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا: "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم"

ترجمہ: سب سے بہترین دور میرا ہے پھر اس کے بعد جو میرے بعد آئیں یعنی صحابہ تابعین کا۔ (رواہ البخاری رقم الحدیث ۳۴۵/۱ (باب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ بنیادی حقیقت ہے کہ جب اس زمانہ کے لوگوں نے خبر آحاد کو قبولیت دے دی ہو اور اسی کے مطابق ان کا عمل رہا ہو تو یہ ان کے اجماع کی نشانی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو تسلیم کر لیا۔ ان دوروں کے علماء کا یہ اجماع بہت مضبوط کہلائے گا اور ایسی صورت میں اجماع کا درجہ آحاد اور متواتر سے بھی بڑھا ہوا ہوگا۔

اس لئے بعض احناف مخصوص طور پر حنفیہ فقہ کے بانی علامہ ابو بکر الجصاص کی یہ رائے ہے کہ مشہور خبر متواتر خبر کی قسم میں شریک ہے اور اس کو آحاد کی قسموں میں شامل نہیں کیا جائے گا جیسا کہ امام السرخسیؒ نے تحریر فرمایا ہے (امام ابو بکر الرازیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ خبر مشہور بھی متواتر کی ایک قسم سمجھی جائے گی اور اس مفہوم میں کہ ایسی خبر سے لوگوں کا یقینی علم مضبوط ہوتا ہے) بحوالہ اصول السرخسی۔ مولانا السرخسی شمس الائمہ ۲۹۱/۱ المطبعۃ مطبع دار الکتاب القاہرہ ۱۹۷۲ء

۲۔ جمہور اصولیین کے نزدیک خبر مشہور کا مفہوم

جمہور اصولیین شافعیہ حنبلیہ اور جمہور مالکیہ کی خبر مشہور کے بارے میں یہ رائے ہے کہ یہ بھی خبر آحاد ہی کی ایک قسم ہے ان کے نزدیک یہ علیحدہ سے سنت کی کوئی قسم نہیں ہے جمہور کے نزدیک خبر آحاد اس کو کہتے ہیں جس میں خبر متواتر کی شرطیں نہ پائی جاتی ہوں جیساکہ علامہ شیرازی نے کتاب اللمع میں تحریر فرمایا ہے۔

(واعلم ان خبر الواحد ما عن حد التواتر) (کتاب اللمع للعلامۃ الشیرازی صفحہ ۱۶۴)

ترجمہ: اور جان لو کہ خبر آحاد اس کو کہا جاتا ہے جو خبر متواتر سے بالکل نزدیک نہ ہو۔

جمہور کے نزدیک خبر مشہور اس کو کہتے ہیں جن کی درج ذیل متعدد تعریفیں بیان کی گئی ہیں علامہ سیف الدین الآمدی الشافعیؒ تحریر فرماتے ہیں: (خبر الواحد ان نقلہ جماعۃ وتزید علی الثلاثۃ (والاربعہ سمی مستفیضاً مشهوراً) (الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۲، ۴۹)

ترجمہ: خبر احاد کو اس کو کہتے ہیں جس کو ایک جماعت نقل کرے اس جماعت کی تعداد تین یا چار سے اگر زائد ہو جائے تو اس خبر کو مستفیض مشہور کہا جائے گا۔

علامہ ابن النجار الحنبلیؒ اس طرح تحریر فرماتے ہیں (فدخل فی الاحاد من الاحادیث ما عرف بانہ مستفیض مشهور، وھو ما زاد نقلہ علی ثلاثۃ عدول، ولا بد ان یکونوا اربعۃ فصاعدا وقیل ما زاد نقلۃ علی واحد فلابد ان یکونوا اثنین فصاعداً وقیل لہ ما ارتفع من صفت الاحاد ولم یلتحق المتواتر (شرح

الکواکب المنیر (تحقیق وادھبۃ الزحیلی وغیرہ جلد ۳ / ۳۴۶ مکتبۃ الشریعۃ الکتاب الخامس مکۃ المکرمۃ) العلامۃ ابن النجار الحنبلی)

ترجمہ (آحاد میں وہ حدیثیں شامل ہوتی ہیں جو اس پہلو سے مشہور ہوں کہ وہ مستفیض مشہور ہوں اور جن کو تین عادل لوگ بیان کریں اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی تعداد چار سے زائد ہو اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نقل کرنے والے ایک یا دو سے زائد ہو اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خبر احاد اس کو کہا جاتا ہے جو آحاد کے صنف سے بلند ہو لیکن متواتر کے درجے کو نہ پہونچے)

خلاصہ کلام یہ نکلتا ہے کہ جمہور کے نزدیک خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جس میں حسب ذیل شرطیں پائی جاتی ہوں۔

(۱) خبر مشہور اس کو کہتے ہیں جس کو ایک عادل جماعت نقل کرے جس کی تعداد تین یا چار سے زائد ہو۔

(۲) خبر مشہور اس کو کہتے ہیں جس کو ایک فرد یا زیادہ سے زیادہ بیان کریں۔

(۳) خبر مشہور کمزور آحاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے لیکن اس کا درجہ تواتر کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ پھر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جمہور خبر مشہور کو خبر آحاد کے برابر درجہ دینے میں باہم متفق نہیں لیکن اس پہلو سے سب باہم متفق ہیں کہ خبر آحاد سے بڑا درجہ خبر مشہور کو حاصل ہے جبکہ خبر آحاد ہی کا وہ بھی ایک حصہ ہے کہ ابتداء میں خبر مشہور جن راویوں سے منقول ہوتی ہے وہ ابتداء میں تعداد میں ایک ہی ہوتا ہے لیکن بڑھتے بڑھتے اس کے بیان کرنے والوں کی تعداد تین تک ہو جاتی ہے جیسا کہ علامہ ترمذی یا ابن الحاجب کا مضبوط فیصلہ ہے یا راویوں کی تعداد خبر مشہور میں دو تک ہو جاتی ہے

جیساکہ ابن الہمام کا مسلک ہے، جمہور اس بات پر بھی ایک رائے ہیں کہ خبر واحد میں بہت سے لوگ شامل ہو جائیں اور اس کی تصدیق کر دیں اور اس پر عمل کرنے لگیں تو اس کا مقام خبر آحاد سے بھی بڑھ جاتا ہے اور اس کا مضمون علم کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے اسی طرح جس طرح تمام لوگ شخص واحد کے وجوب عمل پر متفق ہوتے ہیں اس سلسلہ میں جمہور کا مضبوط مسلک یہی ہے کہ خبر مشہور کم از کم خبر آحاد سے بھی زیادہ بلند درجہ حاصل کر لیتی ہے اور تواتر کے مقام کو نہیں پہونچتی ہے اور اکثریت امت اس کو اس لئے قبول کر لیتی ہے کہ بہترین زمانوں کے لوگوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے یا بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل بھی کر لینا شروع کر دیا ہو یا بعض لوگوں نے اس سلسلہ میں کوئی تاویل کی ہو جمہور کا یہ مسلک ہے کہ خبر مشہور حدیث عمل کو واجب قرار دیدیتی ہے اور اس سے عمل کا بھی وقوع ہوتا ہے۔ بحوالہ کتاب اللمع للعلامہ الشیرازی ص/۱۶۵ جیساکہ ابن النجار نے شرح الکواکب المنیر جلد ۲/۳۵۰-۳۵۲ میں تحریر فرمایا ہے (میرا مسلک اور رجحان بھی یہ ہی تھا اور اسی رائے کو میں مضبوط سمجھتا تھا پھر مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ جو مسلک اس سلسلہ میں پہلے اختیار کیا تھا وہ ہی زیادہ بھلا ہے اس لئے کہ ان پیغمبر کے تحت جو غلطیوں سے معصوم ہیں غلط اور کمزور نہیں ہوتا اور آنحضورؐ کے معصوم عن الخطاء ہونے کے سبب تمام امت کا اس پر اجماع ہو گیا) اور ابن قاضی الجبل اس طرح تحریر فرماتے ہیں (مذہب الحنابلہ ان اخبار الآحاد المتلقاۃ بالقبول تصح لاثبات اصول الدیانات) (شرح الکواکب المنیر ۲/۳۵۰-۳۵۲۔ للعلامۃ ابن النجار)

ترجمہ: اس باب میں حنبلیوں کا یہ مسلک ہے کہ وہ آحاد خبریں جن کو زیادہ لوگ بیان کریں اور کثرت ان کو قبول بھی کرلے تو دیانت کے اصول کے مطابق وہ آحاد خبریں درست تسلیم کرلی جائیں گی)

۳۔ بعض اصولیین کے نزدیک خبر مشہور کا درجہ

(الف) اس سلسلہ میں ظاہریہ کا مسلک ہے کہ خبر مشہور کو حدیث کی قسموں میں درجہ نہیں ملے گا ان کے نزدیک حدیث دو قسموں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

(۱) حدیث متواتر (۲) حدیث آحاد

آحاد ان حدیثوں کو کہا جائے گا جو تواتر کے درجہ کو پہونچ جائیں چاہے راویوں کی تعداد تین یا تین سے زیادہ ہوجائے علامہ ابن حزمؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

وایضاً فان الخبر وان روی من طرق ثلاثۃ او اربعۃ او اکثر من ذلک فھو کلہ خبر واحد (الاحکام فی اصول الاحکام للعلامۃ ابن حزم الظاھری جلد ۱/۱۴)

وہ خبر جس کو تین یا چار یا اس سے زیادہ افراد نے بیان کیا ہو وہ آحاد کے درجہ میں ہوگی۔

بنیادی سبب یہ ہے وہ خبر جس کو ایک عادل شخص نے بیان کیا ہو وہ چاہے زیادہ راویوں کے طریقوں سے بیان ہوئی ہو یا نہیں اور چاہے اس کو امت اسلامیہ کی اکثریت نے قبول نہ کیا ہو ظاہریہ کے نزدیک اس پر عمل ضروری ہے اور ایسی حدیث کے مضمون کو علم کے برابر درجہ ملے گا۔ اور آحاد خبروں کا درجہ بھی خبر مشہور اور خبر واحد کے برابر ہوگا اس لئے ظاہریہ خبر مشہور کو آحاد کی

مخصوص قسم قرار نہیں دیتے۔

(ب) علامہ شوکانی کا مسلک

علامہ شوکانی کا اس باب میں دوسرا مسلک ہے وہ آحاد خبروں کو تین قسموں میں بانٹتے ہیں۔ (۱) المستفیض (۲) المشہور (۳) خبر الواحد

علامہ شوکانی خبر مشہور کی جو تعریف بیان کرتے ہیں وہ ہی حنفیوں کا مسلک ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

والقسم الثالث المشھور وھو ما اشتھر ولو فی القرن الثانی او الثالث الی حد ینقلہ ثقات لا یتوھم تو　　　علی الکذب ولا یعتبر الشھرۃ بعد القرنین۔ (ارشاد الفحول للعلامۃ الشوکانی ص/۴۴ المطبوعۃ ادارۃ الطباعۃ المنیرۃ دمشق ۱۳۴۸ ہجری)

اور تیسری قسم مشہور ہے اور جس کی شہرت دوسری یا تیسری صدی میں اس حد تک رہی ہو کہ اس کو اس قدر　　　بھروسہ مند راویوں نے بیان کیا ہو جن کا جھوٹ پر متفق ہونا ناممکن ہو اور جس کی شہرت کا اعتبار دو صدیوں کے بعد نہ ہوگا۔

محدثین کے نزدیک خبر مشہور کا مفہوم

جیسا کہ سابقہ میں بیان کر چکے ہیں جمہور محدثین کے نزدیک حدیث کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ متواتر اور آحاد۔ پھر آحاد کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) المشہور (۲) العزیز (۳) ایسی غریب جس کو ایک شخص نے ہی روایت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا یہ مسلک ہے کہ خبر مشہور بذات خود مستقل قسم ہے (بحوالہ الحاکم وابن الصلاح وغیرہما)

کیونکہ ان کے نزدیک خبر مشہور حدیث کی ایک مستقل قسم ہے۔ محدثین کا اس باب میں اختلاف ہے کہ خبر مشہور کی کیا تعریف ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نزدیک مشہور حدیث کی کوئی ایک تعریف نہیں ہے۔ متقدمین محدثین میں وہ لوگ شامل ہیں جو علامہ ابن حجر العسقلانی سے قبل ہوئے ہیں یعنی وہ محدثین آٹھویں صدی کے اخیر میں ہوئے ہیں وہ المشہور کی تعریف دوسرے طریقہ سے بیان کرتے تھے یہاں تک کہ علامہ الحافظ ابن حجر کا دور مبارک آیا۔ اور انھوں نے مخصوص اسلوب میں مشہور کی تعریف بیان کی۔ خبر مشہور کی جامع اور محکم تعریف بیان کی اور اس کے نئے مخصوص شرطوں کی بھی وضاحت فرمائی۔ اس زمانہ کے محدثین سے لیکر موجودہ زمانہ کے محدثین نے حافظ ابن حجر کے رائے ہی کو اختیار کیا ہے اور سب لوگ اپنی تصنیفوں میں متفق طور پر اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس تذکرہ کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں :" ان

المحدثین ینقسمون الی طبقتین فی تعریف المشهور :

(۱) طبقة المتقدمين (۲) طبقة المتأخرين واليك آراءهم۔

ترجمہ : خبر مشہور کی تعریف کے باب میں محدثین دو طبقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ پہلا طبقہ متقدمین محدثین کا ہے دوسرا طبقہ متاخرین محدثین کا ہے۔ اس باب میں محدثین کی کیا رائیں ہیں انکو قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

متقدمین محدثین کے نزدیک حدیث مشہور کا مفہوم

آٹھویں ہجری کے جمہور متقدمین کا اس سلسلہ میں یہ مسلک رہا ہے کہ حدیث مشہور حدیث

کی مستقل قسم ہے بعض متقدمین کی یہ رائے تھی کہ متواتر حدیث بھی مشہور حدیث کی ایک قسم ہے۔ مشہور محدث الحاکم نے اپنی تصنیف (معرفۃ علوم الحدیث) میں حدیث مشہور کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن اس کو متعدد قسموں میں تقسیم کیا ہے حدیث مشہور صحیح اور حدیث مشہور غیر صحیح، حدیث مشہورہ میں وہ حدیثیں بھی شامل ہوتی ہیں جن میں خاص اور عام ہوں اور احادیث مشہورہ انکو کہا جاتا ہے جن کی اہل علم واقفیت رکھتے ہیں اس کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے اور اہل علم ان کی حقیقت کے بارے میں جانتے ہوں اور مشہور حدیثوں میں غیر صحیح حدیثیں بھی شامل ہوتی ہیں کیونکہ بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جو صحیح حدیثوں میں تو مروی نہیں ہوئی ہیں لیکن وہ بہت مشہور ہوگئی ہیں جیسے آنحضور کی یہ حدیث (طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة) (علم کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)

یا یہ حدیث "نضر الله امرأً سمع مقالتی فوعاها" (خدا تعالیٰ اس شخص کو خیر آباد رکھے جس نے میری بات سنی اور اس کو محفوظ کر لیا)

یا یہ حدیث "لا نکاح الا بولی" (نابالغ کا نکاح بغیر ولی کے جائز نہیں) اس کے علاوہ متعدد مشہور احادیث ایسی ہیں جو صحیح سندوں سے نقل ہوئی ہیں جیسے "انما الاعمال بالنیات ولکل امرء مانوی" اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر ایک کو اس کا بدلہ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہو) یا یہ حدیث "ان الله لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعه من الناس" (بے شک خدا تعالیٰ اس وقت تک علم کو نہیں اٹھا لیتا ہے، جبتک لوگ علم کے حصول و طلب میں لگے رہتے ہیں)

(باقی ص۳۲ پر)

حضرت بیدار دہلوی

قاضی سید محمد حسین، انجمن عرب سرائے لال محل، حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

سیدی وجدی حضرت میر سید محمد علی عرف میر محمدی بیدار تخلص۔ عرب سرائے شاہ جہان آباد دہلی کے قدیم باشندہ جوانان عہد محمد شاہ غازی سادات عرب سرائے کے رئیس کبیر، مقتدر و معزز ہستی صاحب نسبت بزرگ فصیح زبان شاعر ہوئے ہیں۔ سادات قبیلہ آباحسن کے فردیکے از اولاد پاک نہاد سیدنا حضرت محی الدین عبد القادر جیلانی بغدادیؒ ہیں۔

عرب سرائے (غیاث پور) جہان آباد دہلی اُن مستند و مشہور خاندانوں کی بستی رہی ہے۔ کہ جن خاندانوں کے شیوخ کرام و سادات عظام کو حضرت مریم زمانی بیگم حمیدہ بانو حرم محترم سلطان وقت نصیر الدین ہمایوں بادشاہ شوہر کی وفات کے بعد ادائیگی فریضۂ حج بیت اللہ و زیارت و سعادت حاضری روضۂ اقدس نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم حصول دولت فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو کر ان چندہ صاحبان حسب و نسب کو باجازت خلیفہ دولت عثمانیہ سلطان اول مع خدامان اہل عرب اپنے ہمراہ لے کر آئی تھیں اور اس جگہ آباد کیا تھا۔ اسی سبب سے یہ بستی عرب سرائے مشہور ہوئی اور اس کے چند سال بعد مقبرہ (مدرسہ) ہمایوں کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔

عرب سرائے اور مقبرہ ہمایوں وہ شہرت یافتہ اور تاریخی مقامات ہیں جہاں

جہاں سقوط دہلی کے دوران، جہاد آزادی ۱۸۵۷ء کے متحدہ قومی سربراہ آخری مغل
بادشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر مع اہل خاندان قلعہ شاہ جہاں سے نکل کر
پناہ گزین ہوئے تھے۔ اور عرب سرائے میں شاہ کے تینوں جرنل شہزادوں نے
پناہ لی تھی۔ اور یہیں اطراف کے دیہات کے حریت پسند وفاداروں کی ایک
بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ لیکن شاہ اور شہزادوں کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے
اپنے وفاداروں شاہ کے سمدھی کی مخبری و سازش کے ذریعہ گرفتار کرا لیا تھا اور پھر
تیسرے دن ان حریت پسند وفاداران آزادی کو فوج لا کر محاصرہ کرکے گھیر لیا تھا
حملہ کرکے فصیل کو تین جگہ سے توڑ دیا تھا۔ عرب سرائے معترہ میں فوج داخل ہو گئی
جہاں تک بھی جہاں بازوں سے بن پڑا اپنے روایتی ہتھیاروں سے مسلح وکثیر تعداد
فوج کا مقابلہ کیا: لاتعداد شہید ہو گئے۔ جو کچھ بچ رہے تھے بلا امتیاز زن و مرد
بچوں کے گرفتار کرکے پابجولاں لایا جاتا اور اجتماعی طور پر قتل کر دیا گیا۔ مکینوں
کے قتل کے بعد خالی مکانوں کو لوٹ لیا۔ منڈی کو لوٹا گیا۔ تمام قیمتی ساز و سامان
کی لوٹ کے بعد مکانوں سے تمام علمی اثاثہ اور مسجد و مدرسے سے تمام مذہبی کتب
کو جمع کرکے آگ لگا دی گئی۔ یہ تھا وفاداران کمپنی کی زیر نگرانی فوج کی خانہ تلاشی
کے مناظر۔ البتہ اس جرم وفاداری کی پاداش میں قتل و غارتگری۔ لوٹ و آتش زنی
کے بعد عرب سرائے و منڈی ویران ہو گئی۔ اور اعلان عام معافی کے بعد پھر وہ چند
نفوس جو دوسرے مقامات پر آزادی کی جنگ میں شریک تھے۔ اور زندہ بچ کر
سرحد پار کہیں پناہ گزین ہو رہے تھے۔ واپس آ گئے اور تباہ و خستہ حال اہل
خاندان افراد کو تلاش کرکے لائے اور دوبارہ آباد ہو گئے۔ لیکن پھر ایک عرصہ
بعد بھی سرکار تصرف میں لے لیا گیا۔ اور عرب سرائے نہ صرف غیر آباد ہوئی بلکہ برباد
ہو گئی۔ اب جو شکستہ فصیل، دروازے۔ جامع مسجد و مدرسہ عرب سرائے وجرا فرغان

نظر آتے ہیں ان ہی آثار سے عرب سرائے کا نام باقی رہ گیا ہے۔ اور جنوبی دروازہ و معقب مقبرہ عیسیٰ خاں و زیر فصیل جو قبرستان "موسومہ تربہ" جس میں شہدائے آزادی بھی مدفون ہیں۔ یہ پرانی یادگار کے نشان جو نظر آتے ہیں جن کو دیکھ کر حسرت و یاس سے دل بھر آتا ہے۔ اور آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ سچ ہے بس باقی رہے نام اللہ کا اس بارے میں تاریخی واقعات کو انشاء اللہ کسی وقت تفصیل سے پیش کروں گا بشرط صحت و زندگی و بتوفیق الٰہی۔

حضرت میر سید محمد علی میر محمدی۔ بیدار، اسی بابرکت و تاریخی اہمیت کی حامل سرزمین کے معزز فرد تھے اور یہیں آپ کی ولادت سردار قبیلہ سادات و سربراہ عرب سرائے سید ابو محمد عبداللہ کے ہاں بہ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت مدرسہ عرب سرائے کے فاضل علماء و مشائخ کرام کی زیر پرستی ہوئی۔ باوجود اس کے فخر و امتیاز و اقتدار شریعت و نجابت خاندانی میراث تھی لیکن بایں ہمہ ابتدائے سن شعور سے دنیاوی نام و نمود و تفاخر و ناموری سے بے نیاز۔ نہایت حلیم الطبع۔ منکسر المزاج غرباپرور واقع ہوئے تھے۔ میلان طبع درویشی کی جانب اور مذاق شعر و سخن میں مابہ الامتیاز حیثیت کے مالک۔ اخلاق حسنہ او صاف حمیدہ سے آراستہ صاحب تقویٰ بزرگ اور اردو فارسی کے فصیح زبان شاعر تھے۔

میدان شعر و سخن میں میر سید محمد علی میر محمدی بیدار دہلوی کو شاہ حاتم و خواجہ میر درد سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ جبکہ ان حضرات شعراء کے حلقہ احباب میں شامل اور ہم عصر ہیں فارسی میں مرزا مرتضیٰ علی فراق سے مشورہ سخن فرماتے تھے۔

حضرت بیدار دہلوی کے متعلق استاذ الاساتذہ ناخدائے سخن میر تقی میر صاحب دہلوی نے اپنے مرثیہ تذکرہ نکات الشعراء میں تحریر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۶، ۲۹)
میاں محمد علی بیدار جوانے است مرد آں خوش خلق از شاگردان [illegible] ریختہ بیار

صاف و شستہ می گویند، صاحب دیوان است۔ از یاران مرتضیٰ قلی بیگ فراق تخلص کہ بسیار شاعر فارسی اندست۔ اکثر صحبتہائے فقراء بگرمی پیش می آید۔ الحاصل مرد خوب رنگین مزاج است۔ خدا سلامت دارد۔ تذکرۂ نکات الشعراء۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی لکھنؤ۔

حوالہ تذکرۃ الشعراء۔ عبدالغفور نساخ ۱۲۸۱ھ مطبوعہ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء صفحہ ۴۷۔ بیدار تخلص میر محمد علی عرف میر محمدی دہلوی۔ شاگرد مرزا مرتضیٰ علی خان فراق و مرید حضرت مولانا فخرالدینؒ شعر گوئی میں اچھی مشق پیدا کی تھی۔ اکبر آباد میں جاکر راہی ملک بقاء ہوئے۔ صاحب دیوان گذرے۔

حوالہ از تذکرہ میر حسن۔ ص ۳۹ پر تحریر ہے کہ:

بیدار۔ میاں محمد علی المتخلص بہ بیدار جوانے محمد شاہی است۔ از شاگردان مرتضیٰ قلی بیگ کہ شاعر فارسی گو بود فراق تخلص می نمود۔ قریب چہاردہ سال شدہ باشد فقیر او را در لباس درویشی شاہجہاں آباد دیدہ بود۔ طبع دردمند است بہ زیور علم آراستہ بود۔ معلوم نیست کجاست۔

حوالہ از گلشن بے خار تصنیف نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ص ۳۵ تا ص ۳۶۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی۔ لکھنؤ۔

بیدار تخلص۔ میر محمدی اصلش از دہلی زماں بسر برد ایں دیار عرب سرائے کہ سرکردہ از جہان آباد جانب جنوب است؛ اقامت داشت۔ باز بہ اکبر آباد نقل کردہ طرح سکون انداخت و ہم در آنجا روح پاکش جسد عنصری را خیر باد گفت از شاگردان مرتضیٰ قلی بیگ فراق شمردہ میشود۔ کسب باطن از خدمت مولانا فخرالدینؒ نمودہ خرقہ خلافت در بر کردہ۔ نسبتی درست داشت داشتہ مدتہا بر سر مشق سخن بودہ بہارتے شایان بدست آوردہ صاحب دیوان است۔

حوالہ تاریخ ادب اردو (مصور) تصنیف جناب بابو رام سکسینہ۔
(مطبع نولکشور، لکھنؤ)

بیدار۔ میر محمد علی عرف میر مہدی۔ المتخلص بہ بیدار۔ خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خان فراق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا:

مولانا "فخر الدین کے مریدوں میں تھے۔ آخری عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے تھے جہاں ۱۲۰۹ھ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر و مرزا کے ہم عصر تھے دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔

حوالہ از خمخانۂ جاوید۔ مصنفہ لالہ سری رام ایم۔ اے جلد اول باب اول ص ۶۳۳ مطبوعہ ۱۳۲۵ھ۔

بیدار۔ میر مہدی دہلوی۔ شاگرد میر درد و شاہ حاتم و مرید مولانا فخر الدین قدس سرہٗ۔ دہلی چھوڑ کر اکبر آباد جا رہے تھے۔ میر و مرزا کے ہم عصر تھے کچھ دنوں مرتضیٰ علی خان فراق سے بھی اصلاح لی تھی۔ دہلی میں قیام کے وقت عرب سرا میں سکونت پذیر تھے۔ کلام صاف و دلپذیر اور معرفت سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بھی شاہ حاتم کے ان شاگردوں میں تھے۔ جنھوں نے اردو زبان کی درستی میں سعی و فکر کی تھی۔ جب سودا نے اس رنگ نا محمود کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی بلکہ سودا کی صفائی کے ساتھ اپنا تصوف کا رنگ بقدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علاحدہ کر لیا۔ ان کے بعض اشعار اپنی دل آویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں۔ ملاحظہ ہو! ۔۔

ربط جو چاہیے بیدار تو اتنا معلوم
مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

نقل حوالہ از گلشن ہند۔ مصنفہ میرزا علی تخلص بہ لطف ص ۶۳ تا ص ۵۹ ۱۹۸۶ء از اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ۔

بیدارؔ تخلص میر محمدی نام۔ شاہ جہاں آبادی۔ دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت معانی میں بخوبی آشنا اور زبان دانان اردو سے ہمیشہ ہمنوا رہے۔ کہتے ہیں کلام اپنا انھوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اس نقاد بازار معانی سے فائدہ بہت اٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔

مذکورہ بالا تمام حوالہ جات مستند مصنفین کے قدیم مرتبہ تذکرہ ہائے شعراء سے نقل کئے ہیں۔ ان تمام حوالہ جات سے یہ حقیقت صاف عیاں اور واضح ہو جاتی ہے کہ: حضرت سید محمد علی۔ میر محمدی۔ بیدارؔ دہلوی نہ صرف یہ کہ وہ شاہ جہان آباد دہلی کے اصل باشندہ ہیں، بلکہ آپ کا مولد وطن بربادی خزاں کا اُجڑا ہوا دیار "عرب سرائے" (غیاث پور) شاہجہان آباد۔ دلی ہے۔

چونکہ بعض تذکرہ نگار صاحبان علم و دانش نے اپنے اپنے مرتبہ تذکروں میں جہاں مقامی و ملکی حالات و واقعات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ بلکہ شعراء کے بیشتر حالات بیان کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ اور شعراء کے سن وفات و مدت عمر بھی تحریر نہیں کی ہے۔ ایسے ہی بلا تحقیق بمثل نقل آپ کو دہلوی کے بجائے اکبرآبادی تحریر کر دیا۔ اور کئی دوسرے ہمنام و تخلص ہونے کی وجہ سے بھی یہ التباس سرزد ہوا ہے۔ (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے) البتہ بضرورت

تعارف تذکرہ ہائے شعراء میں حضرت بیدار دہلوی کا کسی نے مختصر اور کسی نے اضافہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور آپ کے کلام اردو۔ فارسی سے پسندیدہ و منتخب اشعار بطور نمونہ کلام نقل کئے ہیں۔

اگرچہ حضرت بیدار کو سلسلہ عالیہ قادریہ میں اپنے والد بزرگوار سے نسبت سلوک حاصل تھی اور صاحبِ مجاز طریقہ قادریہ تھے لیکن اس میٔ عشق معرفت حق کو مزید فزوں تر و دوآتشہ کرنے کی طلب صادق میں حضرت شاہ فخرالدین چشتی نظامی کے دستِ مبارک پر بیعت ہو گئے۔ اور بہت جلد مرشد حق آگاہ کی فیض صحبت و تربیت اور توجہ خصوصی سے قلب و روح نے وہ جِلا پائی کی خرقہ خلافت و کلاہِ فخر و سعادت اور اجازت بیعت سے سرفراز فرمایا۔ اس نعمت فخر و سعادت کے حاصل ہونے کی خوشی میں با جازت شیخ و مرشد کامل شوق زیارت و حاضری حرمین شریفین و ادائیگی فریضۂ حج اپنے حقیقی اور مخصوص اعزہ و احباب کو ساتھ لے کر حجاز مقدس روانہ ہو گئے۔ اور بعد مدت چند سال واپس آگئے تو اپنے قدیم مسکن عرب سرائے ہی میں قیام پذیر ہوئے ؂

چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا تو ہے کعبہ کو
جلد پھر یو تجھے بیدار خدا کو سونپا

یہاں ضمناً یہ عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ حضرت شاہ فخر قدس سرہٗ العزیز سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے عظیم المرتبہ۔ جلیل القدر بزرگ۔ صاحب فضل و کرم ہستی ہیں جن کا مشائخ عظام میں شمار ہے۔ حضرت شاہ موصوف کو صاحب سلسلہ خواجہ زادتین حضرت نظام الملت والدین قدس سرہٗ العزیز سے والہانہ عقیدت تھی اور اکثر و بیشتر بغرض حصول فیض روحانی و برکات مزار مبارک پر اپنے زیر تربیت وابستگان

جب تشریف لاتے تو اس دوران حاضری اپنے مجاز و محب صادق حضرت میر محمدی بیدار کے غریب خانہ موروثی۔ ملک از عطیہ شاہی موسومہ "لال محل" میں بضرورت خلوت و استراحت قیام فرماتے تھے۔ شیخ موصوف کی پسند خاطر کیو جہ سے حضرت بیدار نے اپنی ملک موروثی جائداد "لال محل" حضرت پیر و مرشد حضرت شاہ فخر کی خدمت بابرکت میں ہدیتاً نذر میں پیش کردی تھی۔

ترک سکونت کے سلسلہ میں جو روایت سنی ہے وہ یہ ہے کہ سیدی و جدی حضرت بیدار کے مشفق و مربی اور مرشد والد بزرگوار قدس سرہٗ اور والدہ مخدومہ کا چند سال کے دوران انتقال ہو گیا تھا۔ البتہ ان صدمات کا ازالہ مرشد کامل حضرت شاہ فخر منبع فیض و برکات کے وجود مسعود میں حاضری۔ آپ کی رفاقت و محبت قلب و روح کے لئے راحت و سکون و باعث دولت طمانیت تھا لیکن مشفق و مہربان مخدوم ماویٰ و ملجاء وابستگان کی دائمی جدائی آپ کی وفات پا جانے سے یہ صدمہ جانکاہ ناقابل برداشت تھا۔ ادھر نظام کی ابتری اور سیاسی بے چینی نے باوجود دلی کی روایتی گہما گہمی اور پر رونق محفلوں اور باوقار مجلسوں میں بھی اس زخم خوردہ دل والے آزردہ خاطر درویش صفت انسان کے لئے ان میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے سیدی بیدار کو گوشہ امن و عافیت و کنج گمنامی و قناعت میں جا رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے اپنا تمام اثاثہ مال و املاک حقدار ورثاء اور مساکین و غرباء پر تقسیم کر دیا اور کل سے سبکدوش ہو کر اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور وہاں جا کر گوشہ گمنامی میں جا رہے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو رہے اور ۱۲۰۹؁ / ۱۰ھ میں وہیں وفات پائی۔ آپ کا مزار سیپ کا بازار آگرہ میں تا حال موجود ہے۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء

کے ہنگامی حالات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی شر پسند نے آپ کے مزار کو نہ صرف نقصان پہنچا کر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ لیکن چند ایک سال بعد برادر محترم حکیم سید حسین دہلوی مرحوم (م ۱۹۹۲ء) نے بکمال سعی و جدوجہد ناجائز قبضہ سے بحال کرانے میں کامیابی حاصل کر کے مزار واحاطہ کی درستی و مرمت وغیرہ کرا دی گئی اور مقامی طور پر جناب میکش اکبر آبادی کی نگرانی میں کر دیا تھا۔ اور اکثر شریف حکیم صاحب مرحوم مزار شریف پر حاضر ہوتے اور ضروریات پوری کرتے رہے ہیں۔

چونکہ حضرت بیدار کا دہلی سے ترک سکونت کے اسباب تو وہی ہیں جو اوپر بیان کئے ہیں۔ لیکن آپ کا قدیم اور مولد وطن تو عرب سرائے دہلی ہی ہے جبکہ بعض تذکرہ نگار صاحبان نے بلا تحقیق حضرت میر سید محمد علی محمدی بیدار دہلوی کو اکبر آبادی تحریر کر دیا ہے۔ جو حقیقتاً غلط اور بے اصل بات ہے۔

دیوان بیدار کی بازیافت؛

اس بارے میں اہل علم و تحقیق کا شبہ اپنی جگہ درست ہے کہ اہل خاندان کے پاس حضرت سیدی و جدی بیدار دہلوی کے ہر دو مخطوطہ دیوان اردو و فارسی کیوں نہیں ہیں۔ تو اس شبہ کے ازالہ میں پہلی وجہ تو وہ ہے جو واقعات ۱۸۵۷ء کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں۔ اگرچہ اس کے کافی عرصہ بعد اگر یہ دیوان کہیں سے دستیاب بھی ہو گئے۔ تو برادر مکرم علامہ اخلاق دہلوی مرحوم (متوفی ۱۹۹۳ء) جو دہلی کی مشہور اور علمی شخصیت اور نامور مصنف گزرے ہیں۔ ان کے پاس موجود تھے۔ لیکن افسوس ۱۹۴۷ء میں جبکہ ان کا قیام ملتانی ڈھانڈہ۔ پہاڑ گنج میں تھا وہاں سینکڑوں کتابیں اور گھر کا تمام اثاثہ لٹ گیا تھا۔ اور خود گھر سے صرف تین کپڑوں میں گھر سے نکل کر آئے تھے۔ اور اپنی عمر بھر کی کمائی اس علمی اثاثہ کا تادم آخر ان کو قلق رہا۔ یہ وہ پے در پے بربادی کا نتیجہ ہے جو ہمارے ساتھ ہوتا آئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے حد وحساب انعام وکرم ہے کہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کی ہمت وقوت وبرداشت عطا فرمائی۔ اور عزت وآبرو کو ہر آفت وبلا سے اپنے فضل وکرم سے بچائے رکھنے میں غیبی نصرت ومدد سے حفاظت فرمائی۔ للہ الحمد والشکر۔

لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ عرصہ سرائے کی بربادی کے ایک طویل عرصہ بعد قدر دان سخن وشناسائے علم وادب محترم جناب جلیل احمد قدوائی صاحب سابق لیکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ کو بخوبی قسمت حضرت بیدارؔ دہلوی دونوں مخطوطہ دیوان اردو اور فارسی ایک کتب فروش نے لاکر پیش کئے تو پروفیسر موصوف نے خرید لئے۔ اور مطالعہ کے بعد نہایت جامع وبسوط مقدمہ تحریر فرما کر خصوصی توجہ کے ساتھ دیوان اردو بیدارؔ دہلوی کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۷ء میں شائع کرانے میں کامیابی حاصل فرمائی۔

بہر حال قدوائی صاحب موصوف کی مخلصانہ سعی مستحسن اور علمی قدر افزائی مستحق مبارکباد ولائق قدر افزائی ہے کہ موصوف نے حلقہ ارباب علم وادب وشائقین شعر وسخن وخوشہ چینان تحقیق کو ایک نادر ونایاب گنجینۂ علم سے نہ صرف روشناس ہونے بلکہ زبان وادب کے میدان میں استفادہ کی شاہراہ کشادہ فرما کر ناقابلِ فراموش خدمت انجام فرما کر احسان فرمایا ہے۔ اس پر جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بے لوث خدمت پر اجر عظیم عطا فرمائے۔ ؎ این دعا از من وجملہ جہان آمین آباد

کاش کہ محترم قدوائی صاحب بیدارؔ کا دیوان فارسی کلام بھی شائع فرما دیتے تو مزید موجب شکر گذاری ہوتا۔ مگر افسوس! کہ مدت ہوئی محترم قدوائی

صاحب موصوف ہندوستان سے ترک سکونت فرما کر چلے گئے اور اب کراچی پاکستان میں مقیم ہیں۔ دعا ہے کہ صحت و عافیت کے ساتھ درازی عمر عطا ہو اور اس معروضہ کو شرف باریابی کی کوئی سہل صورت اللہ تعالیٰ ظاہر فرمائے۔ آمین۔ کلام بیدارؔ دہلوی پر قدوائی صاحب موصوف کے مقدمہ اور موازنہ کلام کے اقتباسات و احساسات انشاء اللہ تعالیٰ بشرط صحت و زندگی و بتوفیق الٰہی آئندہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

شاعر مدحت رسول رحمت للعالمین محترم ابرار کرم تیموری ثم دہلوی کی ہدایت تاکیدی فرمائش پہ کلام حضرت بیدارؒ دہلوی سے چند منتخب اشعار جو استادان شعر و سخن نے اپنے تذکروں میں بھی نقل کئے ہیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔

بھرا نہ مثل نگیں زخم یہ میرے دل کا	کہ تا ہمیشہ رہے نام میرے قاتل کا
اہل کمال سے جو ہوا کام رہ گیا	تا حشر یادگار جہاں نام رہ گیا
صفا الماس و گوہر سے فزوں سے تیرے دنداں کو	کہا تجھ لب نے ہم رنگ خجالت لعل و مرجاں کو
دیکھ تجھ کاکل مشکیں کی ادائیں شانہ	دونوں ہاتھوں سے لیتا ہے بلائیں شانہ
بیدارؔ کیوں یہ آتش دل اشک سے بجھے	ظاہر کی آگ ہو تو اسے پانی بجھا سکے
ناتوانی سے مری دیکھو لے دست جنون	رہ گیا ہو نہ کوئی تار گریباں میں چھپا
تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار	گل جدا، سرو جدا، نرگس بیمار جدا
ہو گیا گرتے ہی تیری چشم سے دامن کے پار	اشک تھا بیدارؔ یا آگ کا پرکالہ تھا
کہاں ہے طالع بیدار کہ ایسا ہو	کہ سر دھرے میرے زانو پہ یار سوتا ہو
نہ پر و پرواز ہے بیدارؔ نہ فصل بہار	کس توقع پر قفس سے ہو وہیں اب آزاد ہم

عکس اُس کا پڑا جو دریا میں　　آب حیرت زدہ ہو بہہ نہ سکا
واہ واہ ادا دیکھ فہم یونہی چاہیئے　　ہم سے ہو نا آشنا غیروں سے ہو نا آشنا
بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی　　صحرا میں قیس دشت میں فرہاد رہ گیا

کلام فارسی سے دو شعر نقل ہیں :-

درانجمنے غیر من نیست　　گنجائش صرف ما و من نیست
آن کافر بدکیش چہ گویم بیدار　　آفتے بود کہ از دیدنش ایمانم رفت
دوستان مجمع یاران شما ارزانی　　واگذارید بمن گوشۂ تنہائی را

بقیہ : خبر مشہور کی تعریف و اہمیت

اسی طرح بہت سی طویل حدیثیں ایسی ہیں جو مشہور حدیثوں میں شمار ہوتی ہیں جیسے وہ حدیثیں جن میں ایمانی حکمتوں زکوٰۃ کی برکتوں، حج کے پاکیزہ مقاصد اور حضرت عائشہؓ پر تہمت وافک کا تذکرہ ہے یہ ایسی مشہور طویل حدیثیں ہیں جو صحیح سندوں کے ساتھ منقول نہیں ہوئی ہیں لیکن مشہور ہیں یا وہ مشہور حدیثیں جن میں پرندوں کے بارے میں تذکرہ پایا جاتا ہے یا وہ حدیثیں جن میں قبیلوں کے بارے میں تذکرہ ملتا ہے۔ یہی وہ حدیثیں ہیں جن کو مشہور جانا جاتا ہے اور جن کے بارے میں اہل علم واقفیت رکھتے ہیں اور یہ بھی پہلو ہے کہ کچھ مشہور حدیثیں ایسی ہیں جو اگرچہ اہل علم سے پوشیدہ ہیں لیکن پھر بھی مشہور مانی جاتی ہیں اور جن کی معرفت کے بارے میں خاص و عام واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن فقہاء کے نزدیک مشہور حدیثیں وہ ہوتی ہیں جنکو صحابی تابعی وغیرہ روایت کریں جیسے ابو مندل کی وہ حدیث جسکو انس بن مالک نے روایت کیا ہے۔

(باقی آئندہ)

بڑودہ میں موجود ایک قرآنی مخطوطہ

مقصود احمد ڈیپارٹمنٹ عربی فیکلٹی یونیورسٹی بڑودہ

خانقاہِ رفاعیہ، بڑودہ (گجرات) میں سید کمال الدین رفاعی کے زیرِ تحویل ایک قرآنی مخطوطہ موجود ہے۔ اس کے اوراق کی اصل تعداد ۴۴۷ تھی مگر موجودہ صورت میں اس کے صرف ۴۲۷ اصلی اوراق ہی دستیاب ہیں بقیہ ۲۰ اوراق الحاق شدہ ہیں اور یہ کسی دوسرے کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔ ملحقہ اوراق کی تفصیل اس طرح ہے۔ شروع کے ۱۴؍ اوراق پھر ۶؍ اصلی اوراق کے بعد ۴؍ اوراق اور ان کے علاوہ مزید ۲؍ اوراق۔ ملحقہ اوراق کے کاغذ، روشنائی اور کتابت وغیرہ مختلف ہیں اور ان میں فارسی ترجمہ اور فارسی تفسیر بھی مرقوم نہیں جبکہ اصل میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ملحقہ اوراق میں سے بھی پہلا یعنی سورۃ الفاتحہ پر مشتمل ورق غائب ہے۔ لہٰذا فی الحال اس کے کل ۴۴۶ اوراق ہی دستیاب ہیں جن میں سے ۴۲۷؍ اصل ہیں اور ۱۹؍ الحاق شدہ ہیں۔

سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیتوں پر مشتمل صفحے میں بشمولِ عنوانِ سورہ و سورہ بسم اللہ کل ۷؍ سطریں ہیں۔ بقیہ صفحات عموماً ۱۱؍ سطروں پر مشتمل ہیں۔ بعض میں ۷؍ سطریں بھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا طاق عدد کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔ ان کے ۵؍ صفحات میں ۱۰، ایک صفحے میں ۹؍ اور ۲؍ صفحوں میں ۱۲؍

سطریں ہیں۔ آخری صفحہ پر سورۃ الناس کے بعد حدیث " ای الاعمال افضل فقال: الحال المرتحل۔ فقیل: ما الحال المرتحل؟ فقال: الخاتم المفتح" اور اس کا فارسی ترجمہ درج ہے اور اس کی دوسری جانب دو دعائیں زیرِ عنوان " بعدِ تلاوتِ قرآن" و " بعد ختم القرآن" مندرج ہیں۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا نسخۂ ہٰذا کے اصل اوراق کے بین السطور میں فارسی ترجمہ اور حاشیے پر فارسی تفسیر درج ہے۔ ترجمہ سرخ روشنائی اور تفسیر سرخ وسیاہ دونوں روشنائی سے مرقوم ہے۔ اس کے اوراق کافی بوسیدہ ہیں۔ ان کی پیمائش تقریباً ۵،۱۱×۳،۷ انچ ہے۔ متن و ترجمہ پر مشتمل حصے کی لمبائی چوڑائی ۶،۷×۱،۴ انچ ہے۔

ترقیمے کی عدم موجودگی اور نسخے کے ناقص الاول ہونے کے سبب اس کی تاریخ کتابت اور کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ خانقاہِ رفاعیہ کے موجودہ سجادہ نشین، جناب سید کمال الدین صاحب کے مطابق نسخۂ مذکور ان کے جدِ امجد حضرت سید فخر الدین عرف امیر میاں رفاعیؒ کا تحریر کردہ ہے۔ سید فخر الدین صاحبؒ کا زمانہ ۱۱۹۹ھ تا ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۷۸۴ء تا ۱۸۴۵ء ہے۔ اگر کمال الدین صاحبؒ کا قول درست مان لیا جائے تو اس کی کتابت تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول اور عیسوی تقویم کے مطابق انیسویں صدی کے نصفِ اول میں ہوئی ہوگی۔

خدایا مرے دل کو ایسی نظر دے ‎ ‎ ‎ ‎ [illegible] مجھ کو جو پل پل خبر دے

نہیں شہر پر حکمرانی کی خواہش ‎ ‎ ‎ ‎ مجھے سر چھپانے کو چھوٹا سا گھر دے

مکمل نہ ہوگی کبھی زندگی میں ‎ ‎ ‎ ‎ کتابِ تمنا ذرا مختصر دے

بھٹکتے بھٹکتے بہت تھک چکا ہوں ‎ ‎ ‎ ‎ جو منزل پہ پہنچا دے وہ راہبر دے

صداقت کا سکہ تو چلتا نہیں اب ‎ ‎ ‎ ‎ کوئی جعل سازی کا مجھ کو ہنر دے

زمانے نے اس کو کہیں کا نہ رکھا ‎ ‎ ‎ ‎ ہے بیمار دنیا کوئی چارہ گر دے

ستاروں سے بھی مجھ کو جانا ہے آگے ‎ ‎ ‎ ‎ مرے حوصلوں کو نئے بال و پر دے

کڑی دھوپ نے مجھ کو جھلسا دیا ہے ‎ ‎ ‎ ‎ ذرا اپنی زلفوں کا سایا تو کر دے

زمانے سے محوِ دعا ہے خدایا
ضیا کی دعاؤں میں کچھ تو اثر دے

کلیم ضیا
شعبۂ اردو
اسمٰعیل یوسف کالج۔ جوگیشوری (مشرق)
بمبئی نمبر ۴۰۰۰۶۰

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

غزل

خدایا مرے دل کو ایسی نظر دے
زمانے کی مجھ کو جو پل پل خبر دے

نہیں شہر پر حکمرانی کی خواہش
مجھے سر چھپانے کو چھوٹا سا گھر دے

مکمل نہ ہوگی کبھی زندگی میں
کتابِ تمنّا ذرا مختصر دے

بھٹکتے بھٹکتے بہت تھک چکا ہوں
جو منزل پہ پہنچا دے وہ راہبر دے

صداقت کا سکّہ تو چلتا نہیں اب
کوئی جعل سازی کا مجھ کو ہنر دے

زمانے نے اس کو کہیں کا نہ رکھا
ہے بیمار دنیا کوئی چارہ گر دے

ستاروں سے بھی مجھ کو جانا ہے آگے
مرے حوصلوں کو نئے بال و پر دے

کڑی دھوپ نے مجھ کو جھلسا دیا ہے
ذرا اپنی زلفوں کا سایا تو کر دے

زمانے سے محوِ دعا ہے خدایا
ضیا کی دعاؤں میں کچھ تو اثر دے

کلیم ضیا
شعبۂ اردو
اسمٰعیل یوسف کالج۔ جوگیشوری (مشرق)
بمبئی ۴۰۰۰۶۰

جولائی۔ اگست ۱۹۹۷ء

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد ۱۲۱ شمارہ ۱-۲

اس شمارے میں

مجلس ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوھر قاضی

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس سال ہو گئے اور اس بار لال قلعہ پر ہندوستان کے وزیر اعظم آزادی کی پچاسویں سالگرہ مناتے ہوئے قوم سے خطاب فرمائیں گے وہ قوم سے کیا خطاب کریں گے۔ کیا کیا باتیں عوام سے کہیں گے اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا۔ لیکن اس وقت ہندوستان میں جو حالات پیش نظر ہیں ان کی موجودگی میں وہ عوام الناس سے جو بھی خطاب کریں گے وہ یقیناً ہندوستانی عوام کے لئے لمحہ فکریہ ہوں گے کیونکہ ہندوستان آزادی کی پچاسویں منزل میں جب قدم رکھ رہا ہے تو اس کے سامنے لاتعداد ایسے مسائل ہیں جو فکر و تشویش کا باعث ہی ہیں — مہنگائی کا مسئلہ تو سنگین سے سنگین تر ہو ہی گیا ہے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ تشویشناک بن گیا ہے۔ کون سا صوبہ ایسا ہے جہاں کسی نہ کسی انداز میں بے چینی نہیں پائی جاتی ہو۔ کوئی بھی تو صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ اگر یوپی میں مافیا طبقہ نے سر اٹھا رکھا ہے اور صوبائی سرکار اس کی بیخ کنی کے لئے مصروف عمل ہے تو دوسری طرف مہاراشٹر میں امبیڈکر کی مورتی پر جوتوں کا ہار پہنائے جانے کا واقعہ رونما ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں زبردست احتجاج لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے جسے قابو میں کرنے کے لئے پولیس کو گولی چلانی پڑ جاتی ہے جس سے تقریباً ۸، ۱۰ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بہار میں جناب لالو پرشاد یادو پر چارہ گھوٹالے کے سلسلے میں سی۔ بی۔ آئی عدالت میں چارج شیٹ داخل کرتی ہے تو تمام ہندوستان ان سے وزارت اعلیٰ سے دستبرداری کا مطالبہ کرتا ہے

تو اس کے جواب میں لالو پرشاد کی اکڑ فوں دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس پر سب کو غضب کی حیرت و تشویش لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح آسام میں الفادہشت پسندوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے ۔ پنجاب میں امن و امان ہو گیا تھا اور وہاں کسی قسم کی کوئی تشویش کی خبر آنا بند ہو گئی تھی جس سے ہندوستان کے عوام نے چین سکھ کا سانس لیا تھا کہ معاً وہاں ٹرینوں میں بم حادثہ کے واقعہ نے عوام کا چین سکھ جبراً چھین لیا۔ ایسے بم حادثوں میں بے گناہ مسافر مارے جاتے ہیں بھلا بتاؤ کہ آج دنیا میں ایسے وحشی انسان نما بھیڑیئے بھی پیدا ہیں جو معصوم و بے گناہ عورتوں، بچوں مردوں کو مرتا دیکھ کر اپنے مقاصد کے حصول کی آس لگائے رکھتے ہیں۔ لعنت ایسی ظالمانہ اس پر درندگی کی اس سے زیادہ بدترین مثال کیا ہوگی، قدرت کبھی ایسے وحشی و درندہ صفت ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جو بے گناہ معصوم انسانوں کی اپنی گندہ ذہنیت جان لیتے ہیں۔ پڑوسی ملک کی ظالم و جابر تنظیم آئی ایس آئی کی اس شرمناک حرکت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہی ہے اور جتنی بھی اس کی سخت سے سخت الفاظ میں نفرت کے ساتھ مذمت کی جائے تو وہ بھی کم ہی ہے ۔ اگر پڑوسی ملک یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس انسانیت سوز حرکت سے وہ اپنے کسی شیطانی مقصد میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہی ہے اس طرح کی ظالمانہ حرکتوں سے اس پر پوری دنیا میں لعنت و ملامت تو ہوگی ہی قدرت کی طرف سے بھی اسے انسانیت کی ہلاکت پر عبرت ناک سزا مل کر رہیگی ایسا ہمارا یقین ہے۔

کشمیر میں جب سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عنانِ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہاں کے حالات نارمل ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ انشاء اللہ مزید حالات ٹھیک ہو جائیں گے اس میں بڑا دخل کشمیری عوام کی روا داری اور سمجھداری کو

نظرات

ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس سال ہو گئے اور اس بار لال قلعہ پر ہندوستا
کے وزیر اعظم آزادی کی پچاسویں سالگرہ مناتے ہوئے قوم سے خطاب فرمائیں گے
قوم سے کیا خطاب کریں گے۔ کیا کیا باتیں عوام سے کہیں گے اس کا جواب تو آنے
والا وقت ہی دے گا۔ لیکن اس وقت ہندوستان میں جو حالات پیش نظر ہیں
ان کی موجودگی میں وہ عوام الناس سے جو بھی خطاب کریں گے وہ یقیناً ہندوستا
عوام کے لئے لمحۂ فکریہ ہوں گے کیونکہ ہندوستان آزادی کی پچاسویں منزل میں
جب قدم رکھ رہا ہے تو اس کے سامنے لاتعداد ایسے مسائل ہیں جو فکر و تشویش کا
ہی ہیں ــــ مہنگائی کا مسئلہ تو سنگین سے سنگین تر ہو ہی گیا ہے لا اینڈ آرڈر کا
اس سے بھی زیادہ تشویشناک بن گیا ہے۔ کون سا صوبہ ایسا ہے جہاں کسی نہ کسی
میں بے چینی نہیں پائی جاتی ہو۔ کوئی بھی تو صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں سب کچھ ٹھیک
ٹھاک چل رہا ہے۔ اگر یوپی میں مافیا طبقہ نے سر ابھار رکھا ہے اور صوبائی سرکار اس
بیخ کنی کے لئے مصروف عمل ہے تو دوسری طرف مہاراشٹر میں امبیڈکر کی مورتی پر
کا ہار پہنائے جانے کا واقعہ رونما ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں زبردست ا
لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے جسے قابو میں کرنے کے لئے پولیس کو گولی
پڑ جاتی ہے جس سے تقریباً ۸، ۱۰ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بہار میں جناب ا
پرشاد یادو پر چارہ گھوٹالے کے سلسلے میں سی۔ بی۔ آئی عدالت میں چارج
داخل کرتی ہے تو تمام ہندوستان ان سے وزارت اعلیٰ سے دستبرداری کا مطالبہ

تو اس کے جواب میں لالو پرشاد کی اکڑ فوں دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس پر سب کو غضب کی حیرت و تشویش لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح آسام میں الفا دہشت پسندوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پنجاب میں امن و امان ہو گیا تھا اور وہاں کسی قسم کی کوئی تشویش کی خبر آنا بند ہو گئی تھی جس سے ہندوستان کے عوام نے چین سکھ کا سانس لیا تھا کہ معاً وہاں ٹرین میں بم حادثہ کے واقعہ نے عوام کا چین سکھ جبراً چھین لیا۔ ایسے بم حادثوں میں بے گناہ مسافر مارے جاتے ہیں بھلا بتاؤ کہ آج دنیا میں ایسے وحشی انسان نما بھیڑئیے بھی پیدا ہیں جو معصوم و بے گناہ عورتوں، بچوں مردوں کو مرتا دیکھ کر اپنے مقاصد کے حصول کی آس لگائے رکھتے ہیں۔ لعنت ایسی ظالمانہ اس پر درندگی کی اس سے زیادہ بدترین مثال کیا ہوگی، قدرت کبھی ایسے وحشی و درندہ صفت ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جو بے گناہ معصوم انسانوں کی اپنی گندہ ذہنیت جان لیتے ہیں۔ پڑوسی ملک کی ظالم و جابر تنظیم آئی ایس آئی کی اس شرمناک حرکت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہی ہے اور جتنی بھی اس کی سخت سے سخت الفاظ میں نفرت کے ساتھ مذمت کی جائے تو وہ بھی کم ہی ہے۔ اگر پڑوسی ملک یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس انسانیت سوز حرکت سے وہ اپنے کسی شیطانی مقصد میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہی ہے اس طرح کی ظالمانہ حرکتوں سے اس پر پوری دنیا میں لعنت و ملامت تو ہو گی ہی قدرت کی طرف سے بھی اسے انسانیت کی ہلاکت پر عبرت ناک سزا مل کر رہیگی ایسا ہمارا یقین ہے۔

کشمیر میں جب سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عنانِ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہاں کے حالات نارمل ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ انشاء اللہ مزید حالات ٹھیک ہو جائیں گے اس میں بڑا دخل کشمیری عوام کی رواداری اور سمجھداری کو

نظرات

ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس سال ہو گئے اور اس بار لال قلعہ پر ہندوستان
کے وزیر اعظم آزادی کی پچاسویں سالگرہ مناتے ہوئے قوم سے خطاب فرمائیں گے وہ
قوم سے کیا خطاب کریں گے۔ کیا کیا باتیں عوام سے کہیں گے اس کا جواب تو آنے
والا وقت ہی دے گا۔ لیکن اس وقت ہندوستان میں جو حالات پیش نظر ہیں
ان کی موجودگی میں وہ عوام الناس سے جو بھی خطاب کریں گے وہ یقیناً ہندوستانی
عوام کے لئے لمحہ فکریہ ہوں گے کیونکہ ہندوستان آزادی کی پچاسویں منزل میں
جب قدم رکھ رہا ہے تو اس کے سامنے لاتعداد ایسے مسائل ہیں جو فکر و تشویش کا باعث
ہی ہیں ـــ مہنگائی کا مسئلہ تو سنگین سے سنگین تر ہو ہی گیا ہے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ
اس سے بھی زیادہ تشویشناک بن گیا ہے۔ کون سا صوبہ ایسا ہے جہاں کسی نہ کسی انداز
میں بے چینی نہیں پائی جاتی ہو۔ کوئی بھی تو صوبہ ایسا نہیں ہے جہاں سب کچھ ٹھیک
ٹھاک چل رہا ہے۔ اگر یوپی میں مافیا طبقہ نے سر ابھار رکھا ہے اور صوبائی سرکار اس کی
بیخ کنی کے لئے مصروف عمل ہے تو دوسری طرف مہاراشٹر میں امبیڈکر کی مورتی پر جوتوں
کا ہار پہنائے جانے کا واقعہ رونما ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں زبردست احتجاج
لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے جسے قابو میں کرنے کے لئے پولیس کو گولی چلانی
پڑ جاتی ہے جس سے تقریباً ۸، ۱۰ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بہار میں جناب لالو
پرشاد یادو پر چارہ گھوٹالے کے سلسلے میں سی۔ بی۔ آئی عدالت میں چارج شیٹ
داخل کرتی ہے تو تمام ہندوستان ان سے وزارت اعلیٰ سے دستبرداری کا مطالبہ کرتا ہے

تو اس کے جواب میں لالو پرشاد کی اکڑ فوں دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس پر سب کو غضب کی حیرت و تشویش لاحق ہو جاتی ہے اسی طرح آسام میں الفا دہشت پسندوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پنجاب میں امن و امان ہو گیا تھا اور وہاں کسی قسم کی کوئی تشویش کی خبر آنا بند ہو گئی تھی جس سے ہندوستان کے عوام نے چین سکھ کا سانس لیا تھا کہ معاً وہاں ٹرین میں بم حادثہ کے واقعہ نے عوام کا چین سکھ جبراً چھین لیا۔ ایسے بم حادثوں میں بے گناہ مسافر مارے جاتے ہیں بھلا بتاؤ کہ آج دنیا میں ایسے وحشی انسان نما بھیڑیئے بھی پیدا ہیں جو معصوم و بے گناہ عورتوں، بچوں مردوں کو مرتا دیکھ کر اپنے مقاصد کے حصول کی آس لگائے رکھتے ہیں۔ لعنت ایسی ظالمانہ اس پر درندگی کی اس سے زیادہ بدترین مثال کیا ہوگی، قدرت کبھی ایسے وحشی و درندہ صفت ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جو بے گناہ معصوم انسانوں کی اپنی گندہ ذہنیت جان لیتے ہیں۔ پڑوسی ملک کی ظالم و جابر تنظیم آئی ایس آئی کی اس شرمناک حرکت پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہی ہے اور جتنی بھی اس کی سخت سے سخت الفاظ میں نفرت کے ساتھ مذمت کی جائے تو وہ بھی کم ہی ہے۔ اگر پڑوسی ملک یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس انسانیت سوز حرکت سے وہ اپنے کسی شیطانی مقصد میں کامیاب ہو جائے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہی ہے اس طرح کی ظالمانہ حرکتوں سے اس پر پوری دنیا میں لعنت و ملامت تو ہو گی ہی قدرت کی طرف سے بھی اسے انسانیت کی ہلاکت پر عبرت ناک سزا مل کر رہے گی ایسا ہمارا یقین ہے۔

کشمیر میں جب سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے عنانِ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے وہاں کے حالات نارمل ہو رہے ہیں اور توقع ہے کہ انشاء اللہ مزید حالات ٹھیک ہو جائیں گے اس میں بڑا دخل کشمیری عوام کی رواداری اور سمجھداری کو

بھی ہے انھیں مفاد پرستوں نے انھیں مذہب کی آڑ میں گمراہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہوسکے بالآخر مفاد پرستوں کے ناپاک منصوبے خاک میں ملے اور کشمیری عوام نے صحیح راہ اختیار کی اسمیں دراصل کشمیری عوام کی بنیادی سوچ و سمجھ ہی کو کریڈٹ ملے گا کشمیری عوام کے خمیر میں سیکولر قدروں کی حفاظت و پاسداری کا جذبہ موجود ہے۔ سری نگر کشمیر کی ایک بڑی اہم و قابل لحاظ و قابل فخر ہستی حاجی احمد اللہ مرحوم و مغفور کی تعلیم و تربیت اور سلوک و عمل کشمیری عوام کے لئے مشعل راہ ہے۔ حاجی احمد اللہ مرحوم و مغفور کا عمل و کردار حضور اکرم حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ سے مزیّن تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ ہے ان کی اولاد نرینہ حاجی حشمت اللہ صاحب حاجی اکرام اللہ صاحب آج بھی دین اسلام اور خدمت خلق بندگان خدا کی مدد کے لئے پیش پیش ہیں۔ ایسے نیک و باعمل سچے مسلمانوں کی موجودگی میں مذہب دشمن انسانیت مغائر غلط حرکات کو پائیداری قطعاً نہیں مل سکتی ہے خدا کا شکر ہے لوگوں میں سمجھ آرہی ہے اور عنقریب ہی کشمیر میں امن و سکون بھائی چارہ اور سیکولر قدروں کا بول بالا ہوکر رہے گا۔ انشاءاللہ۔

ہمارے راہنماؤں نے خواب دیکھا تھا کہ آزادی کی فضاء میں ہندوستانی عوام پوری دنیا کے لئے سبق آموز ہوں گے نیکی و عمل کے لحاظ سے۔ انسانیت کی خدمت میں ان کا کردار مثالی ہوگا مگر ہمیں افسوس ہے اس بات کا ہمارے راہنماؤں نے جو خواب اس قسم کا دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ آج وہ راہنما تو موجود نہیں ہیں اگر وہ موجود ہوتے تو یقیناً وہ خود ہی ایسے ماحول سے

زندہ رہنے سے بہتر مرجانا بہتر سمجھتے ـــ چاروں طرف بدعنوانیوں نے پورے معاشرہ میں اپنے پیر پھیلا رکھے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہم ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہیں مذکورہ بالا حالات کس ملک میں نہیں ہیں ہر جگہ اس قسم کے واقعات نے اپنی جڑیں مضبوط کر رکھی ہیں۔ ہر ملک اس سے دکھی ہے اور انکے سامنے اس کے تدارک کا کوئی حل و راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی قدیم روایات و تہذیب و تمدن کے پیش نظر ہمیں امید ہے کہ یہ تشویشناک واقعات کی عمر زیادہ دیر تک کی نہیں ہے۔ صحیح راہنما کی ضرورت ہے اور جس دن ہندوستان میں قائدو راہنما صحیح و نیک عمل پیدا ہوگیا اس دن انشاء اللہ ہندوستان کی سرزمین سے یہ سب حالات یکدم ختم ہو جائیں گے! ایسا صحیح و نیک عمل رہنما کب ہندوستان کے نقشہ پر ابھرے گا یہ قدرت کے بس میں ہے۔ اب ہمیں قدرت ہی کی قدرت پر سب کچھ کا انحصار رکھنا ہوگا۔

ابھی دیوگوڑا ہندوستان کے وزیراعظم تھے کہ اب جناب آئی کے گجرال ہندوستان کے وزیراعظم ہوگئے۔ گذشتہ سال لال قلعہ سے شری دیوگوڑا نے ۱۵ اگست کو عوام سے خطاب کیا تھا اور اب جناب اندر کمار گجرال لال قلعہ سے خطاب کریں گے۔

ہندوستان کے سیاسی افق پر اس قدر تبدیلیاں حیرت انگیز تو ہے ہی ساتھ اس بات کی بھی فکر پیدا کر رہی ہے کہ ملک میں ترقی کے کام کس طرح انجام

پائیں گے۔ ایک وزیر اعظم ایک پالیسی بناتا ہے اس پر بھی و چار و گفتگو ہی ہو رہی ہے کہ معاً وزیر اعظم دوسرا بن جاتا ہے اب اس کی پالیسی ہی پر عمل ہوگا تو اس طرح ملک کا پہیہ کس طرح چلے گا یہ بات فکر و تشویش کی ہے پارلیمنٹ کے عام انتخابات کے نتیجہ میں کسی ایک پارٹی کو اتنی اکثریت نہیں مل پائی کہ جس سے حکومت میں استحکام پیدا ہوتا ۔ ہر وقت وسط مدتی انتخابات کا ڈر سر پہ سوار رہتا ہے ایسے ملک کی ترقی کا عمل کیسے جاری رہ سکتا ہے ۔ کاش ہندوستانی عوام میں اتنا شعور بیدار ہو جائے کہ وہ آئندہ پارلیمنٹری عام انتخاب میں کسی ایک پارٹی کو اس قدر اکثریت دلا دیں کہ حکومت پائیداری سے ۵ سال کی مدت تک چلتی رہے اور اس طرح ملک کی ترقی و فلاح کے کام انجام پاتے رہیں!

نئے صدر جمہوریہ کا انتخاب ہو چکا ہے اور ہندوستان کی سب سے اونچی کرسی جمہوریہ صدارت پر ایک ایسے شخص مسٹر کے آر نارائنن فائز ہوگئے ہیں۔ جو گاندھی جی کی خواہشات کے عین مطابق ہے ۔ اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر جیسا تھا گاندھی کا وہ خواب پورا ہو گیا ہے جو انہوں نے آزادی کی تحریک کے دوران دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مسٹر نارائنن کا صدر جمہوریہ کے لئے انتخاب ہندوستان کے تمام عوام خصوصاً دلت و اقلیتوں کے لئے خوشخبری کا پیغام ہے اور مستقبل میں ڈھیر ساری امیدوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر صدر جمہوریہ مسٹر کے آر نارائنن ہیں تو وزیر اعظم مسٹر اندر کمار گجرال ہیں جن کی سیکولرزم میں عقیدت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔

ہم دونوں ہی ان قابل احترام ہستیوں مسٹر کے آر نارائن کو ہندوستان کا صدر جمہوریہ اور جناب آئی کے گجرال کو ہندوستان کا وزیر اعظم منتخب ہونے پر دلی مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی شخصیات میں ہندوستان کے تابناک مستقبل کی جھلک دیکھتے ہیں۔

■■■

تعزیت

رُکن مجلسِ ادارت اعزازی ماہنامہ برہان ڈاکٹر جوہر قاضی کی والدہ محترمہ ۵ جولائی ۱۹۹۷ء کو شنبہ کی صبح مختصر علالت کے بعد دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر انتقال کر گئیں۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحومہ کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی۔ وہ ایک دین دار خاتون تھیں۔ ان کی وفات بلاشبہ ڈاکٹر جوہر قاضی، اہل خاندان اور ان کے رفیق سفر جناب حکیم قاضی محمد یٰسین عالم صاحب مدیر اعلیٰ ماہنامہ راحت وصحت کے لیے ایک عظیم صدمہ ہے۔ میں اپنی طرف سے اور کارکنانِ ادارہ کی طرف سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم جناب ڈاکٹر جوہر قاضی اور ان کے اہل خاندان کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ **مجھے بذاتِ خود اس سانحۂ ارتحال سے سخت جھٹکا لگا ہے۔**

عمید الرحمٰن عثمانی

پہلی قسط

چند پیچیدہ قطعاتِ تاریخ اور اُن کا حل

عبد الرؤف خاں ایم۔اے (تاریخ) اودی کلاں (راج) ۳۲۲۲۰۱

تاریخ گوئی اگرچہ بجائے خود کوئی صنفِ سخن نہیں کیونکہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح ہیئت کے اعتبار سے یہ اپنی کوئی شناخت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخیں بشکلِ قصیدہ، مرثیہ، مسدس، مستزاد، غزل، ریختی اور قطعہ کے روپ میں کہی جاتی رہی ہیں۔ لیکن بہ اعتبارِ فن، تاریخ گوئی اِن تمام اصنافِ سخن سے مشکل ترین فن ہے کیونکہ اِس میں الفاظ کے دوش بدوش اعداد کو بھی ملحوظِ نظر رکھنا پڑتا ہے چنانچہ یہ ایک شعوری فن ہے، اور اسلامی علوم و فنون میں یہ ایک اہم مقام رکھتی ہے ہندوستان میں عہدِ وسطیٰ اور اس کے بہت بعد تک یہ فن کافی مروج رہا۔ مغل عہدِ حکومت میں یہ فن بڑے عروج پر تھا۔ بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم اس عہد میں "بات بات پر قطعہ تاریخ کہا جاتا، ولادت، شادی بیاہ، وفات فتح، سفر، کسی کتاب کی تالیف کے موقع پر پھڑکتی ہوئی تاریخ کہہ کر ادبی دنیا میں برابر دادِ طلب کی جاتی رہی ہے[1]" لہٰذا اُس عہد میں اِس فن میں طرح طرح کے محاسن اور ایسی ایسی پیچیدہ صنعتیں ایجاد و اختراع کی گئیں کہ اُن کو حل کرنے میں بھی نہایت دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے لیکن اِن اختراعات و بدعات کے سبب اس فن کا دائرہ کار اور میدان بہت وسیع ہو گیا اگرچہ بظاہر ایک طرح کا گورکھ دھندا

[1] بزمِ تیموریہ ۱/۵۹۶ تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء اعظم گڑھ۔

معلوم ہوتی ہیں لیکن تاریخ گوئی سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ تاریخیں نہ صرف دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں بلکہ یک گونہ سکون و راحت بھی مہیا کرتی ہیں۔ ان مشکل قطعاتِ تاریخ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم اساتذہ تاریخ گو نے اس فن کو کتنی بلندی پر پہنچا دیا تھا، جسے آج ہم نے زوال کے گڑھے میں پہنچا دیا ہے دھکیل دیا ہے۔ فارسی شعرا کی تقلید میں ہمارے اردو شعرا نے بھی بعض مشکل و دشوار مگر بڑی خوبصورت تاریخیں کہی ہیں۔ اگرچہ پیچیدہ صنائع میں کہی گئی تاریخوں کو حل کرنے میں اچھی خاصی ذہنی مشقت کرنی پڑتی ہے لیکن غور و خوض کے بعد جب یہ حل ہو جاتی ہیں تو اُس سے حاصل ہونے والے ذہنی سرور و کیف کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ درج ذیل سطروں میں پیش ہیں ایسے اُلجھن بھرے چند قطعاتِ تاریخ اور اُن کا حل، جو راقم کے مطالعے میں آئے اور مشکل معلوم ہوئے ضروری نہیں کہ یہ ہر قاری کے لئے دشوار ہی محسوس ہوں۔

تفضل علی خاں نامی شخص نے گولہ گنج کے چوراہے پر ۱۲۵۰ھ میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی، جس میں گیارہ مساجد کا نقشہ تھا۔ میر محمد شائق سے، جنہیں تاریخ گوئی میں ملکۂ راسخ حاصل تھا، سالِ تعمیر کی فرمائش کی گئی اور یہ شرط عائد کی کہ تاریخ کا مادہ "خانۂ خدا" ہونا چاہیئے۔ میر شائق نے حسبِ فرمائش و قید درج ذیل قطعۂ تاریخ کہا:

گر بگیری حروفِ منقوطہ ہست در "خانۂ خدا" تاریخ ۱۲۵۰ھ

حرف باقی کہ غیر منقوط اند یافت دیگر از ضیا تاریخ

اوسطِ اعدادِ یازدہ مسجد شائق این گفت بے بہا تاریخ[1]

حل:- بیت اول کے بموجب مادہ "خانۂ خدا" کے منقوط حروف خ+ن+خ ہیں

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا مؤلفہ سعادت خان ناصر ص ۵۲۱ مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی اسمعا پریس لکھنؤ ۱۹۷۰

جن کے اعداد کا میزان بحسابِ جمل ۱۲۵۰ ہوتا ہے جو مطلوبہ ہجری سنہ ہے اور اس میں کسی طرح کی تعقید نہیں۔ لیکن تاریخ گو دوسرے بیت میں کہتا ہے کہ حروف غیر منقوط سے، جو باقی حرف ہیں یعنی "ا، ہ، د، ا"، "تاریخ" نے پھر سے ضیا پائی مطلب یہ کہ "تاریخ"، جس کے عدد (۱۲۱۱) ہوتے ہیں + حروفِ غیر منقوط "خانۂ خدا" ا + ہ + د + ا = ۱۱ (جو اشارہ ہے گیارہ مساجد کے نقشے کی طرف) لیکن "اوسط اعدادِ یازدہ مسجد" کی رو سے تاریخ گو "یازدہ مسجد" کے حروف "ا، و، م، ج" کے ۴۸ عدد شامل "تاریخ" کے ۴۸ عدد شامل "تاریخ" کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا (۱۲۱۱ + ۱۱ + ۴۸) = ۱۲۷۰ اس میں سے پھر "بے بہا" کے (۲۰) عدد کا تخرجہ از روئے مصرعۂ آخر کیا گیا تو (۱۲۷۰-۲۰) = ۱۲۵۰ باقی رہے۔ یہاں "بے بہا" کا تعمیہ محلِ نظر ہے تعمیے کی اس صورت میں صرف "بہا" کے اعداد کم کیے جانے چاہئیں۔ مگر ایسی تاریخیں بھی نظر سے گزری ہیں جن میں تاریخ گو نے "بے" کا عدد بھی شمار کیا ہے۔ لیکن ایک دوسرا حل بھی پیش ہے جس میں صرف "بہا" (۸) کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۷۰ - ۸ = ۱۲۶۲ حاصل ہوگا جو سنہ ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی محمدی سنہ ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں حل بعید از قیاس اور دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہوں، اور حروفِ عاطل سے صرف گیارہ مساجد کے نقشے کی طرف ہی اشارہ ہو۔ اس طرح تاریخ گو کے ذہن رسا نے مادہ کا کوئی حرف بیکار نہیں جانے دیا۔

میرزا محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی (م ۱۲۸۲ھ) نے حکیم یعقوب صاحب کے امام باڑہ کی تعمیر (۱۲۶۴ھ) پر یہ خوبصورت قطعہ کہا، جو ممکن ہے امام باڑہ کے کتبے کے لئے کہا ہو:

سرِ عدد بہ تراش و نویس آنچہ بماند　　دو نیم کن دلِ آں را کہ سخت سنگین است

چوں نصف گشت بکن، باز نصفِ نصفش را
امام باڑہ بنا گشت سالِ او این است[1]

قطعۂ تاریخ میں مادّہ "عدو" ہے۔ پہلے مصرعے کے بموجب اِس (عدو) کا سر (ع) تراشں (کاٹ) دیا، باقی حرف رہے دال اور واو (د ۴ و ۶) ان دونوں حرفوں کے اعداد کو اکائی اور دہائی کے مرتبے پر رکھا تو "۶۴" حاصل ہوئے۔ اب دوسرے مصرعے کی رُو سے "عدو" کے دِل یعنی "د" (۴) کو دو نیم کیا تو ۴ ÷ ۲ = ۲ حاصل ہوئے یہ سیکڑہ کے مرتبہ پر آیا۔ بعد ازاں تیسرے کے مطابق "بکن باز نصفِ نصفش را" یعنی اس (۲) کے نصف کو پھر نصف کیا، ۲ ÷ ۲ = ۱، اسے (۱) ہزار کے مرتبے پر رکھا۔ اب حاصل شدہ اعداد کو دائیں سے بائیں رکھا تو ۱۲۶۴ پیدا ہوا جو تعمیر امام باڑہ کا ہجری سنہ ہے۔ اِس نوعیت کے قطعات کو صنعتِ تخرجہ اور تنصیف کے زمرہ میں رکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہمارے یہ شعرا جس طرح چاہتے، تاریخ برآمد کرسکتے تھے۔ منشی امیر احمد مینائی امیرؔ نے سید حسن لطافت لکھنوی کی وفات (۱۳۰۱ھ) پر درج ذیل قطعۂ تاریخ کہا، جس میں تعمیۂ تخرجہ منفرد نوعیت کا حامل ہے :۔

خرد چوں وفاتِ لطافت شنید   پئے سالِ رحلت بہر سو دوید
گزشت از شمارِ حروف و نقاط   ہم از مصرعِ سال اضافت کشید
پس آنگہ بگفتا کہ بشنو امیرؔ
"لطافت بحدِّ لطافت رسید"[2] ۱۳۲۸-۲۷=۱۳۰۱ھ

---

[1] دیوان دفترِ شگرف از نسیمؔ دہلوی ص ۲۴۵ مطبوعہ ۱۲۸۵ھ
[2] ریاضِ لطافت از سید حسن لطافت ص ۳۰۷ مطبع شوکت جعفری لکھنؤ ۱۳۰۶ھ

مصرعِ مادہ کی کل عددی قیمت ۱۳۲۸ ہوتی ہے لیکن مطلوب ۱۳۰۱ تھا اس لیے شاعر نے دوسرے شعر کی رُو سے مصرعِ سال "لطافت بحدِ لطافت رسید" کے کل حروف جو (۱۷) ہیں اور نقطے جنکی تعداد (۹) ہے نیز ایک (۱) اضافت کو کشید یعنی کھینچ لیا۔ ان سب کا میزان ۱۷ + ۹ + ۱ = ۲۷ ہوتا ہے۔ اس طرح بڑے خوبصورت طریقے اور فنکارانہ انداز میں ۱۳۲۸ میں سے ۲۷ عدد ساقط کر دیئے۔ تاریخ گوئی کی تاریخ میں اس قسم کا ہنرمندانہ تعمیہ شاید ہی ملے۔

امیر علی خاں ہلال لکھنوی کے ارتحال (۱۲۷۸ھ) پر شاہ غلام حیدر صغیر لکھنوی نے اپنی ندرتِ فکر سے "امیر علی" کے نام کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے لفظی تخرجہ سے یہ قطعۂ تاریخ موزوں کیا:

افسوس ہلال ازیں جہاں رفت　　دل در غم او پُراضطراب است
شیریں سخن بشاعراں بود　　دیواں کہ از وست خوش کتاب است
جُستیم چوں صغیر تاریخ　　دل گفت حیات چوں حباب است
بنویس دو حرف از سروپا　　باقی زحباب غرقِ آب است

اعدادِ حروف چوں نوشتم
یک یک کم شد ہمیں حساب است[1]

شعر ۴ کے مطابق "امیر علی" (دونوں الفاظ) کے "سروپا" حرف "ا ر اور ع ی" اخذ کئے۔ اس کے بعد آخری شعر کے پہلے مصرع کے بموجب تاریخ گو نے جب ان حروف کے اعداد کو لکھا تو الف (ہزار) کو ہزار "رے" کو سیکڑے اور "عین" و "یے" کو دہائی کے مرتبے پر رکھا یعنی:

---

[1] تاریخِ لطیف ص ۶۰

ا ــــــــــــ ۱۰۰۰
ر ــــــــــــ ۲۰۰
ع ــــــــــــ ۷۰
ی ــــــــــــ ۱۰
۱۲۸۰ = مجموعہ ۱۲۸۰

اب مصرعِ آخر کی رُو سے اس میزان میں سے "یک یک" (۱+۱=۲) یعنی دوؔ عدد کا اسقاط کر دیا جائے (۱۲۸۰ ــ ۲ = ۱۲۷۸) باقی بچے، جو سنہ ہجری ہے اور یہی مقصود تھا۔

مناجان رئیس قصبہ چھاؤنی نے ۱۲۸۴ھ میں ایک مقدمہ جیتا۔ اس واقعہ کی تاریخ سید آلِ محمد مارہروی نے لفظِ "فتح" سے برآمد کی۔ تاریخ گوئی میں موصوف بے مثل تھے، جنھوں نے دیوان تواریخ اس فن میں یادگار چھوڑا ہے۔ مذکورہ واقعہ کی تاریخ ملاحظہ ہو:

رئیسِ چھاؤنی خوش طالعِ عہد ۔۔۔ کہ مستغنی ست از تعریف و توصیف
زلفظِ "فتح" شد تاریخ فتحش
بہ اثبات بتثلیث بتنصیف[1]

اِس تاریخ میں جیسا کہ عرض کیا مادّہ لفظ "فتح" ہے جس کے تینوں حروف کے اعداد بحساب ابجد (۸۰، ۴۰۰ اور ۸) ہوتے ہیں۔ مصرعِ آخر کی رُو سے حرف "فا" کے (۸۰) عدد کو ثابت رہنے دیا جائے، اور حرف تا سے قرشت کی تثلیث کی جائے۔ اگرچہ تثلیث کے معنیٰ ایک تہائی کرنے کے ہیں، مگر یہاں تاریخ گو کا مدعا تین گنا کرنا ہے لہٰذا (۴۰۰ × ۳ = ۱۲۰۰) نیز حرفِ حطی کی تنصیف کرنے کو کہا گیا ہے یعنی (۸ ÷ ۲ = ۴) اب حاصل شدہ اعداد کا میزان کیا (۸۰+۱۲۰۰+۴ = ۱۲۸۴)

---

[1] دیوانِ تواریخ از سید آلِ محمدؐ مارہروی ص ۸۸، مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ ۱۲۹۹ھ

۱۲۸۴ھ برآمد ہوئے جو شاعر کو مقصود تھا۔

حضرت شاہ محمد علی حبیب نصر پھلواروی کا وصال ۱۲۸۵ھ فصلی (۱۲۹۵ھ) میں ہوا۔ وکیل مولوی احمد کبیر حیرت پھلواروی نے ہنرمندانہ قطعہ ذیل کہہ کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

شد از وفاتِ شاہ محمد علی حبیب　　غم بے حساب در ہمہ اشیا چو طاق و زوج

خوردند ضرب در غم او چوں بنفسہٖ　　یکبار قلبِ زہد و سرِ وجد و پائے اوج

حیرت ز جمع حاصل خویش سنِ وصال

فصلی شدہ بہ بحر سخن جوش زن چو موج[1]　　۱۲۸۵ف

مصرع رابع کے بموجب مادے کے حروف قلب زہد، سر وجد اور پائے اوج یعنی "ہ و ج" ہیں۔ ان کے اعداد (۵، ۶، ۳) کو اکائی، دہائی اور سیکڑہ تسلیم کیا جائے ازاں بعد مصرعِ ثالث کی رُو سے اِن اعداد کو اِن ہی سے ضرب دے کر اس طرح لکھا جائے:

۵×۵	=	۲۵	(اکائی، دہائی)
۶×۶	=	۳۶	(دہائی، سیکڑہ)
۳×۳	=	۹	(سیکڑہ)
		۱۲۸۵	

میزان حاصل ضرب ۱۲۸۵ ہوتا ہے اور یہی برآمد کرنا تاریخ گو کا مدعا تھا۔

میر نواب مونس کے انتقال (۱۲۹۲ھ) کی تاریخ سید حسن لطافت صاحب نے میر نواب کے تخلص "مونس" سے ہی بڑی ہنرمندی کے ساتھ برآمد کی ہے:

---

[1] تاریخ کملا (دختر حیرت) از مولوی احمد کبیر حیرت ۱۲، ۲۳۹ یونین پریس پٹنہ ۱۳۰۲ھ

مرد مداح و زائر مرثیہ گوئے حسینؓ	فخر سحبان، رشک حسان، صاحب فکر بلند
در فصاحت بے عدیل و در بلاغت بے نظیر	طبع رنگین و کلامش بود مطبوع دلپسند
در سہ شوال کرد از درد دل فوراً وفات	در شب جمعہ دل احباب گشتہ درد زند
آہ قبل از جمعہ از نسبت ثانی عشر از ماہ بود	کاں زباں دانِ جہاں راشد زبان یکبار بند
مومنین احباب اعزا دست بر سر تو حہ خواں	سامعین در مجلس شد ماتم او میکنند
سالِ تاریخ وفاتش اے لطافت خواستم	یک بیک ہاتف ز طرز تازہ در خاطر فگند

بہر سال اعدادِ مونس را بغیر صفر گیر
"واو کن مقلوب میم و نون بہم سین را دو چندؔ" ۱۲۹۲ھ

شعر نمبر ۳، ۴ میں وفات کا سبب عارضۂ قلب، یوم پنج شنبہ، تاریخ ۱۲، ماہ شوال کی وضاحت کردی گئی ہے، اور آخری مصرع کے بموجب لفظ "مونس" کے حروف سے سال اس طرح برآمد کیا ہے کہ حرف "واو" کے عدد (۶) کو مقلوب یعنی الٹا کیا جائے تو وہ (۲) کے ہندسہ میں تبدیل ہو جائے گا جو اکائی کے مرتبہ پر آئے گا۔ اس کے بعد "میم و نون" کے اعداد کو بغیر صفر باہم (جمع) کرنے پر (۴ + ۵ =) ۹ حاصل ہوگا جو دہائی کا عدد ہوگا۔ اب "مونس" کے آخری حرف "سین" کے عدد (۶۰) کو دو چند (۲×۶۰) کیا تو (۱۲۰) حاصل ہوئے صفر کو ترک کرنے پر (۱۲) باقی رہے۔ انہیں سیکڑے اور ہزار کے مرتبہ پر رکھا جائے گا۔ اس ترتیب سے ۱۲۹۲ پیدا ہوگا جو مطلوبہ ہجری سنہ ہے۔ اس تاریخ میں تین حرف مکتوبی اور ایک ملفوظی ہے۔

۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں کسی نے غالب کے انتقال کی افواہ اڑا دی۔ جب یہ افواہ حیدرآباد پہنچی تو محمد حبیب اللہ ذکا حیدرآبادی نے، جو غالب کے شاگرد تھے۔ اس موقع پر دیباچہ

ؔ ریاض لطافت ص ۳۶۴۔

ذیل بہترین دعائیہ قطعہ تاریخ کہا۔

گزشت از جہاں آں جہانِ سخن ‏ ‏ ‏ ‏ کہ می گفتش عرفی و طالب است

خرد گفت سالش "ریاضِ جناں"

کراں تا کراں مسکن "غالب" است

ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری اپنے ایک تحقیقی مضمون بعنوان "غالب، ذکا اور رسالہ جنگ" مشمولہ ماہنامہ "آج کل" نئی دہلی بابت دسمبر ۱۹۹۱ء میں (ص ۱۴) لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یہ قطعۂ تاریخ جناب ضیاء الدین احمد شکیب نے اپنی کتاب "ذکا اور غالب" ص ۱۲۱ میں درج کیا ہے۔ مجھے اس میں ۱۲۸۲ھ کی کوئی تاریخ نظر نہیں آتی۔ اس لئے غالب شناسوں کے لیے یہاں یہ قطعہ نقل کیا گیا"۔

غالباً ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب نے اپنی توجہ صرف "خرد گفت سالش ریاضِ جناں" پر مبذول رکھتے مادہ "ریاضِ جناں" خیال فرمایا۔ جس کے اعداد کا میزان (۱۱۱۵) ہوتا ہے۔ اگر وہ آخری مصرع "کراں تا کراں ۔ ۔ ۔" کو بہ نظر غائر ملاحظہ فرما لیتے تو مطلوبہ تاریخ نظر آنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ تاریخ گو آخری شعر میں واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ "ریاضِ جناں" کے ایک کنارے (ر = ۲۰۰) سے دوسرے کنارے (ن = ۵۰) تک "غالب" کا مسکن ہے یعنی "ر + غالب + ن" = ۱۲۸۲ھ

اس تاریخ میں تعمیہ تدخلہ کا استادانہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اصل مادہ "ریاضِ جناں" نہ ہوکر "غالب" رہے۔ گمان غالب ہے کہ ذکا صاحب کے پیش نظر میر عبدالجلیل بلگرامی (م ۱۱۳۸) کا درج ذیل قطعۂ تاریخ رہا ہوگا جو انہوں نے فتح ستارہ گڑھ (۱۱۱۱ھ) کے موقع پر کہا تھا۔

جشن تبہ بارہ گیر بفتح ستارہ گڑھ　　نظارہ کن جوانب اطراف بوستان

ایں بیت را بتعمیہ گیرد گرکسے

تاریخ بانقط شود از لفظِ او عیاں[1]

یہ تاریخ صنعتِ ضرب، بطور لہ اور تعمیہ تدخلیہ میں ہے۔ مادہ "جشن" ہے اسے تین دفعہ لکھا جائے، یعنی "جشن + جشن + جشن" ان کے اعداد کا مجموعہ بحساب ابجد ۱۰۵۹ ہوگا۔ حاصل جمع یا ضرب میں اطراف "بوستاں" کے بائے موحدہ اور "نون" کے اعداد (۲ + ۵۰ = ۵۲) داخل کر دیئے جائیں (۱۰۵۹ + ۵۲ = ۱۱۱۱ھ) تو فتح ستارہ گڑھ کا سال برآمد ہو جائے گا۔

شیخ امداد علی بحر لکھنوی کے سانحۂ ارتحال پر شیخ محمد جان شاد لکھنوی نے صنعتِ حسابیہ اور مہملہ میں بزبانِ اردو بڑا عمدہ قطعۂ تاریخ کہا جس کا مادہ بحر ہی کے ایک مصرع کو بنایا ہے:

مہملے کے حرفِ مصرعِ بحر　　بحر کے یوں سنیں، شاد لکھو

چھ دہائی سے جو بڑھیں آحاد　　ضرب وہ سات، پانچ میں کر لو

ہو چکیں ضرب جب وہ سات اعداد　　سیکڑے پھر سے چند کیجیے، تو

رحلتِ بحر کی یہ ہو تاریخ

"آشنا تھا غریقِ رحمت ہو" ۱۲۹۵ھ[2]

---

[1] مفتاح التواریخ از طامس ولیم بیل ص ۲۹۱ نیز واقعاتِ دارالحکومت دہلی ۱: ۵۲۸ مگر ملہم تاریخ ص ۶۸ پر تیسرے مصرع کی قرأت "ایں بیت را بتعمیہ گر دارسی بغور" ہے۔

[2] تاریخ لطیف ص ۲۹ -

پہلے شعر کے مصرعۂ اولیٰ کے مطابق "آشنا تھا غریقِ رحمت ہو" مادہ ہے۔ اس کے حروفِ مہملہ کے اعداد اخذ کئے جائیں، جو یہ ہیں: آ + ا + ھ + ا + ر + ر + ح + م + و + ہ
۱ + ۱ + ۵ + ۱ + ۲۰۰ + ۲۰۰ + ۸ + ۴۰ + ۶ + ۵ = ۴۶۷ میزان۔ اب دوسرے شعر کے پہلے مصرع کے بموجب چھ دہائی یعنی ساٹھ کے پہلے (۷) اکائی کے مرتبہ پر ہے، اسے مصرعۂ ثانی کی رو سے پانچ میں ضرب دیا تو (۵×۷ = ۳۵) حاصل ہوا۔ اب چھٹے مصرعے کے بموجب سیکڑے یعنی چار سو کو ۳ سے چند کیا جائے (۳×۴۰۰ = ۱۲۰۰) تو (۱۲۰۰) حاصل ہوگا۔ دونوں حاصل ضرب (۳۵ + ۱۲۰۰) کا میزان ۱۲۳۵ ہوا۔ لیکن مادہ کے حروفِ مہملہ کے اعداد میں سے ساٹھ (۶۰) ابھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ان کو ۱۲۳۵ میں جمع کیا تو (۱۲۳۵ + ۶۰) ۱۲۹۵ برآمد ہوئے جو مطلوب سنہ ہجری ہے۔

نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ بریلوی نے منشی مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی کے انتقال (۱۲۹۹ھ) پر بڑی ندرتِ فکر کے ساتھ "صنعتِ انامل" میں درج ذیل قطعۂ تاریخ کہا:

اسیرؔ خوش سیر، خوش وضع، خوش فکر　　　ہوئے راہی سوئے دارالبقا جب
تو ہاتف نے برائے سالِ رحلت　　　سوائے نر اٹھا دیں انگلیاں سب
مگر گِن گِن کے دو انگلی کے پورے　　　کہا لکھ لے انھیں اے ہوشؔ نواب
رہیں باقی جو دو، ان کا سر کبر
جھکا دینا کہ ہو جائے مؤدب[۱]

یعنی چوتھے مصرع کے مطابق نر انگشت (انگوٹھے) کو چھوڑ کر باقی چار انگلیاں اٹھا دی جائیں۔ پھر ان میں سے دو انگلیوں کے پوروں کو دوبار گنا جائے

---

[۱] تاریخِ لطیف ص ۲۵۔

کیونکہ ہاتف نے تاریخ گو سے صرف دو انگلیوں کے پوروں کو "گن گن کے اب" لکھنے کو کہا۔ یہ محض اشارہ ہے، ورنہ اصل عدد پوروں کو دو بار گننے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ ایک انگلی کے تین پورے ہوتے ہیں لہٰذا دو انگلیوں کے چھ ہوئے اور دوبار (گن گن) گننے پر بارہ (۱۲)۔ اس طرح ہزار اور سیکڑے کے اعداد حاصل ہو گئے باقی دو انگلیوں کے (جو تاحال کھڑی ہوئی ہیں) سرکے یعنی اوپری پورے کو جھکا دیں، دونوں "۹۹" کی شکل بن جائیں گی جو دہائی اور اکائی کے عدد ہیں۔ اس ترکیب سے ۱۲۹۹ حاصل ہوئے، اور یہی اسیر کے انتقال کا ہجری سنہ ہے۔

میر عبدالجلیل بلگرامی نے فتح ستارہ گڑھ کا سال بھی اسی صنعت میں نکالا ہے :-

زانگشتاں شہ بر مد ابہام　　برابر چار الف کردم نظارہ[1]　۱۱۱۱ھ

یعنی جب بادشاہ (اورنگ زیب) نے چھنگلیا پر انگوٹھے سے مد بنایا (یعنی انگوٹھے کو چھنگلیا کے پہلے پورے پر لائے) تو میں نے برابر چار الف (انگلیوں) کا نظارہ کیا یعنی چاروں انگلیاں برابر کھڑی کر دی جائیں تو وہ ۱۱۱۱ کی شکل بنائیں گی جو فتح ستارہ کا سال ہے۔ مولوی احمد کبیر حیرت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کا سال (۱۱ھ) بھی اسی طریقے سے برآمد کیا ہے :

چوں ز حیرت سن نقلش جستم　　ہر دو انگشت شہادت برداشت[2]　۱۱ھ نبوی

یعنی دونوں انگشت شہادت برابر سے کھڑی کر دی جائیں۔ گیارہ کی شکل میں ہو جائیں گے۔

---

[1] سرو آزاد ۲ : ۲۸۴

[2] تاریخ کملا (دختر حیرت) ۱ : ۳ -

سید حسن لطافت صاحب لطافت نے میر ببر علی انیس کی رحلت (۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) پر اردو زبان میں صنعتِ زُبر و بینہ اور صنعتِ ضرب میں لفظی تاریخ کے ساتھ جو قطعہ تاریخ کہا، اس میں تاریخ، وقتِ وفات، یوم اور ماہ کی صراحت بھی معمائی انداز میں کردی گئی ہے، قطعہ مبسوط ہے، جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

جو میر ببر علی تھے انیس ذاکرِ شاہ	وحیدِ دہر، سب اہل زباں کے اُس ہو رئیس
فصیحِ کامل و حسانِ وقت و دعبلِ عصر	جناں میں جا کے ہوئے ساتھ حور عیں کے جلیس
قریب شام ہوئے وہ مہِ کمال تمام	اخیر چاند تھا گذرے تھے آہ دن انتیس
سنا یہ واقعہ جانکاہ جب کہی تاریخ	کہ جس میں لفظ ہیں آئے مناسب اور سلیس
بیان مصرعِ آخر کے اب صنائع ہوں	بہ فکر سمجھیں لطافت جسے حساب نویس
"شروعِ مصرعِ تاریخ جو کہ ہیں دو حرف	مہینہ ایک ہے اور دوسرا ہے روزِ خمیس
سنین بھی ہیں عیاں اوس سے عیسوی، ہجری	جو بینات زبر ہوں رقم بہ طور نفیس"
وہ مرثیہ، نہ وہ پڑھنا، نہ وہ بڑے مجمع	اور اس مجلسِ ماتم ہے سامعیں دس بیس

عجیب مصرعِ تاریخ ہے ملایکتا
"یہ پنجتن کا ہے نوحہ انیس ہائے انیس"[1]

قطعہ کے شعر نمبر ۶، ۷ کی رُو سے مصرعِ مادہ "یہ پنجتن کا ہے نوحہ۔۔۔ الخ" ہے اس کا پہلا لفظ (شروعِ مصرع) حرف "یہ" ہے جو دو حرفی ہے۔ اس کا پہلا حرف "ی" جس کی عددی قدر (۱۰) ہے جو ماہ شوال کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسرا حرف ہائے ہوز (ہ) ہے جس کی ابجدی قیمت پانچ (۵) ہے جو یومِ وفات چہارشنبہ (بدھ) کو واضح کر رہا ہے۔ وقتِ وفات اور انتیس تاریخ کا اظہار تیسرے شعر میں کر دیا گیا ہے۔

---

[1] ریاضِ لطافت ص: ۳۶۳۔

عیسوی سنہ حاصل کرنے کا طریقہ صنعتِ زبر و بینات کے ذریعہ شعر میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ مادّہ کے تمام حروف کے اعداد یہ ہوں گے۔

یا ہا (۱۷) + یا نون جا تا نون (۶۶۹) + کاف الف (۱۲۲) + ہا یا (۱۷) + نون واو حا ہا (۱۳۴) + الف نون یا سین (۳۴۸) + ہا الف یا (۱۲۸) + الف نون یا سین (۳۴۸) = ۱۸۷۳۔

لیکن ہجری سنہ صنعتِ ضرب سے برآمد ہوگا، جیساکہ "پنجتن" (۵) اور "انیس ہائے انیس" (۲۵۸) سے واضح ہے یعنی ۵ X ۲۵۸ = ۱۲۹۰، جس کی وضاحت کی تاریخ گو کو ضرورت نہ تھی۔ ان دونوں اعداد۔ ۱۸۷۳ء نیز ۱۲۹۰ میں "عجیب مصرعِ تاریخ ہے ملا یکتا" کے مطابق یکتا (ایک) کا تدخلہ کرنے کا نہایت لطیف قرینہ موجود ہے چنانچہ ۱۸۷۳+۱ = ۱۸۷۴ء اور ۱۲۹۰+۱ = ۱۲۹۱ھ برآمد کئے گئے جو انیس کی وفات کے مطلوبہ سنین ہیں۔ رئیس، جلیس، نفیس وغیرہ انیس کے بیٹے پوتوں کے نام بھی ہیں۔

سید محمد علی جویا مرادآبادی ثم جے پوری کی فنِ تاریخ گوئی کے اصول و مبادیات اور اقسام و صنائع تاریخ گوئی پر اردو زبان میں پہلی اور مشہور تصنیف "خیابانِ تاریخ" (سرودِ غیبی) کے اشاعت کا ایک قطعۂ تاریخ لالہ گنگا سرن جیسوری نے بھی لکھا تھا:۔

نسخۂ تاریخ بے مثل و نظیر — حضرت جویا نے کیا اچھا لکھا

صنعتِ اعداد در اعداد میں

"نسخۃ التاریخ" سال اس کا لکھا[1] — ۱۲۷۲ھ (کذا ۱۸۷۲ء)

---

[1] سرودِ غیبی ص ص ۳۴-۱۳۳۔

سرن کے اس قطعہ کا مادہ "نسخۃ التاریخ" ہے جو "صنعتِ اعداد در اعداد" (صنعتِ مادہ) میں ہے۔ اس صنعت میں اولاً حروفِ مادہ کے اعداد کو لفظوں کو لکھا جاتا ہے، پھر ان ملفوظی اعداد کے حروف کی عددی قیمت بحسابِ ابجد نکالی جاتی ہے۔ ملفوظی اعداد عموماً فارسی میں لکھے جاتے ہیں مثلاً یک، سہ، شش وغیرہ لیکن سرن صاحب نے ملفوظی اعداد اردو میں اخذ کیے ہیں، چنانچہ حل یہ ہوگا؛ "نسخۃ التاریخ"۔

حروف مادہ: ن س خ ۃ (درنج میں) ال ت ا، ر، ی، خ۔

صنعتِ اعداد در اعداد
اعدادِ ملفوظی: پچاس، ساٹھ، چھ سو، چار سو، اِک، تیس، چار سو، اک، دو سو، دس، چھ سو۔
اعداد نمبری:- ۶۶+۶۶۴+۷۴+۲۷۰+۲۱۱+۴۷۰+۳۷+۲۱+۶۹+۶۴+۶۴+۴۴

=۱۸۷۲ء[1] یہاں اشکال وارد ہو سکتا ہے کہ "الف" کا ملفوظی عدد "ایک" کے بجائے "اک" اخذ کیا ہے لیکن "ایک" لینے پر مطلوبہ تاریخ سے (۲۰) عدد زائد ہو جاتے۔ تاریخ کہنے اور اُسے حل کرنے میں اعداد کی مجبوری ہر حال میں بنی رہتی ہے۔

صاحبزادہ محمد مستحسن فاروقی کا ارتحال ۱۴۰۰ھ میں ہوا۔ اُن کے مزار کے کتبہ پر مندرجہ ذیل دو تاریخی فقرے ہیں:-

"خدا کے سایۂ رحمت میں،، ۱
+
"تربتِ فاروقی"[2] ۱۳۹۹ = ۱۴۰۰ھ۔

---

[1] جو یا نے بھی اس کی اشاعت کا سال "اٹھارہ سے بہتر" ہے اس کا سال "سے وری ومعنوی ۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ سنین نکالے ہیں۔ ص ۴۳

[2] الواح الصنادید ۲: ۱۲۴ مولفہ مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی ۱۹۹۱ء، دہلی۔

پہلا فقرہ صنعتِ تکسیر میں ہے۔ اس کے حروف کا میزان (۱۴۵۹) ہوتا ہے۔ ان اعداد کی تکسیر کرنے پر ۹ + ۵ + ۴ + ۱ = ۱۹ حاصل ہوگا۔ دوبارہ تکسیر کرنے پر ۹ + ۱ = ۱۰ برآمد ہوا۔ چونکہ اس صنعت میں صفر ترک کر دی جاتی ہے لہٰذا ایک (۱) باقی رہا جو اس فقرہ کا اصل عدد ہے۔ اسے "تربتِ فاروقی" کے اعداد میں داخل کرنے پر سالِ مطلوب حاصل کر لیا گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس تاریخ گو کے ذہن رسا کا نتیجۂ فکر ہے۔

آخر میں کلیاتِ منیرؔ کے سالِ اشاعت کا قطعۂ تاریخ بزبان ہندی پیش ہے جو مالکِ مطبع ثمرِ ہند پنڈت بیجناتھ کی طبعِ رسا کا نتیجہ ہے۔ واضح ہو کہ قطعہ سے پانچ سنین حاصل کیے ہیں:۔

" دِگ کلیات منیرؔ شر" رہت شتر من ہار " ۱۸۰۱ شاکا
۱۲۸۵ ف
"یت سررس گن گرہ ششن" رس، نواب شت دہار
۱۸۷۹ء
سن فصل سلکے بہرت، سردوا دشں جگت "
ہوت عیسوی انت میں، ہجری پانچوں اکت[1]

یعنی چہار طرف دنیا میں کلام منیرؔ تیر کی مانند پہنچ گیا۔ اور اس سے تمام دشمنوں کا دل چھوٹ گیا اور وہ اپنا من ہار گئے۔ یہ واقعہ سمت ۱۹۳۶ بکرمی، ۱۲۹۶ ہجری نبوی، ۱۲۸۵ فصلی، ۱۸۰۱ شاکا اور ۱۸۷۹ عیسوی کا ہے۔ حل ملاحظہ ہو:۔

(۱) " دِگ کلیاتِ منیرؔ شر" کے اعداد کا میزان بحسابِ جمل (۲۴ + ۴۶۱ + ۳۰۰ + ۵۰۰) = ۱۲۸۵ ہوتا ہے جو سالِ طبع کا فصلی سنہ ہے۔

---

[1] غرائب الجمل ص ۲۰۸ نیز ملہم تاریخ ص ۵۸۔

(۲) "رہت شش من ہائے کے جملہ اعداد سمت
۱۸۰۱ ہوئے اور یہی شک سمت مطلوب تھا۔

(۳) " بت سر رس گن گرہ ششن " کی قیمت (۴۰۲ + ۲۶۰ + ۷ + ۲۲۵ + ۵۰...
۱۸۶۷ ہوتی ہے۔ اس میں "دوادش" یعنی ۱۲ کا لفظی ادخال کرتے ہوئے ۱۸۶۷
نکالا ہے۔ واضح ہو کہ یہ بھی ابجدی اعتبار سے ہی ہے۔ باقی بکری سمت اور
سنہ ہجری سنسکرت اور ہندی تاریخ گوئی کے اس طریقے سے نکالے ہیں
جس میں حرفوں کے بجائے الفاظ کے اعداد[1] شخص و مختص ہوتے ہیں، جنہیں
شبد انک (...) اور اس طریق تاریخ گوئی کو "بھوت سنکھیا" ... کہتے ہیں۔ مثلاً: ۔ آکاش: صفر، رس (ذائقہ): چھ، گرہ (سیارے)[2]: نو وغیرہ
چنانچہ سمت بکرما اور ہجری سنہ "شبد انک" کے ذریعہ ہی حاصل کئے گئے ہیں:

(۴) تیسرے مصرعے کے الفاظ رس، گن گرہ ششن (چاند)

۶ ۳ ۹ ۱ = ۱۹۳۶ بکرما۔

(۵) رس نو اگرہ) رب (...سورج)

۶ ۹ ۱۲ = ۱۲۹۶ ہجری۔

مذکورہ بالا قطعات وہ ہیں جو راقم الحروف کے دوران مطالعہ سامنے آئے۔

---

[1] غالب نے بھی دو تاریخیں اسی صنعت میں کہی ہیں: ز سالِ واقعہ میر رامیتا بیگ
مانت راست شمارہ الم امجاد۔
صحیفہ ہائے سماوی ہیں از عشرات حدیقہ ہائے بہشتی شخص از آحاد ۱۲۴۰ (کلیات فارسی ص ۴۵۶)

[2] برائے تفصیلات ملاحظہ ہو "بھارتیہ پراچین لپ مالا" ص ۱۱۹-۱۲۱ مصنفہ گوری شنکر ہیرا چند
اوجھا ۱۹۹۴ء

[illegible] دماغ سوزی اور دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر قاری کو اس نوعیت کے قطعاتِ تاریخ کو حل کرتے ہوئے ذہنی کسرت ہی کرنی پڑے۔ اگرچہ کچھ اور قطعاتِ تاریخ بھی راقم نے نوٹ کر رکھے ہیں جنکو حل کرنے میں کافی حد تک جگر سوزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن مضمون کی طوالت دامنگیر ہے۔ ۱۲

(۲) "رہت شتر من ہار" کے جملہ اعداد بحساب ابجد (۶۰۵ + ۹۰۰ + ۹۰ + ۲۰۶ =)
۱۸۰۱ ہوئے اور یہی شک سمت مطلوب تھا۔

(۳) "بت سر رس گن گرہ ششن" کی قیمت (۴۰۲ + ۲۶۰ + ۷۰ + ۲۲۵ + ۶۵۰ =)
۱۸۶۷ ہوتی ہے۔ اس میں "دوادش" یعنی ۱۲ کا لفظی ادخال کرتے ہوئے ۱۸۷۹ء نکالا ہے۔ واضح ہو کہ یہ بھی ابجدی اعتبار سے ہی ہے۔ باقی بکرمی سمت اور سنہ ہجری سنسکرت اور ہندی تاریخ گوئی کے اُس طریقے سے نکالے ہیں، جس میں حرفوں کے بجائے الفاظ کے اعداد[۱] مشخص و مختص ہوتے ہیں، جنہیں شبد انک ( ) اور اس طریقِ تاریخ گوئی کو "بھوت سنکھیا (شمار موجودات)" کہتے ہیں۔ شلاً:- آکاش: صفر، رس (ذائقے): چھ، گرہ (سیارے): نو وغیرہ[۲]
چنانچہ سمت بکرما اور ہجری سنہ "شبد انک" کے ذریعہ ہی حاصل کئے گئے ہیں:

(۴) تیسرے مصرعے کے الفاظ رس، گن گرہ ششن (چاند)
۶ ۳ ۹ ۱ = ۱۹۳۶ بکرما۔

(۵) رس نو (گرہ) رب (۱۲ سورج)
۶ ۹ ۱۲ = ۱۲۹۶ ہجری۔

مذکورہ بالا قطعات وہ ہیں جو راقم الحروف کے دورانِ مطالعہ سامنے آئے۔

---

[۱] غالب نے بھی دو تاریخیں اسی صنعت میں کہی ہیں ز سالِ واقعہ میرزا میتا بیگ
مات راست شمارۂ ائمہ امجاد۔
صحیفہ ہائے سماوی بیں از عشرات حدیقہ ہائے بہشتی شخص از آحاد ۱۲۴۸ (کلیاتِ فارسی ص ۲۴۶)

[۲] برائے تفصیلات ملاحظہ ہو "بھارتیہ پراچین لپ مالا" ص ۱۲۱-۱۱۹ مصنفہ گوری شنکر ہیرا چند اوجھا ۱۹۹۴ء

جن کے حل کرنے میں تاریخ گو شعراء کے بجائے مجھے دماغ سوزی اور دقت کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر قاری کو اس نوعیت کے قطعاتِ تاریخ کو حل کرتے ہوئے ذہنی کسرت ہی کرنی پڑے۔ اگرچہ کچھ اور قطعاتِ تاریخ بھی راقم نے نوٹ کر رکھے ہیں جنکو حل کرنے میں کافی حد تک جگر سوزی سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن مضمون کی طوالت دامنگیر ہے۔ ۱۲

محدثین اور اصولیین کے نزدیک

خبر مشہور کی

کیا تعریف و اہمیت ہے؟

مولانا اشتیاق اختر اصلاحی، ای۔۲۹ قدم کا باغ حیدر گنج لشکر گوالیار

دوسری اور آخری قسط

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قنت بعد الرکوع یدعوا علی رعل وذکوان" (رواہ الحاکم، معرفۃ علوم الحدیث ص/۱۲ المطبوعہ دار الکتب المصریہ مصر عام ۱۹۳۷ء)

ترجمہ: بے شک آنحضورؐ نے رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھی اس دعاء قنوت کو رعل اور ذکوان کی فضیلت کے موقع پر پڑھتے تھے)

ابن الصلاح نے اپنی تصنیف (مقدمہ ابن الصلاح؛ ص: ۱۳۴-۱۳۵) میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ ابن الصلاح کی رائے اس سلسلہ میں دوسری ہے یعنی نہ تو مشہور حدیثوں کے بارے میں واقفیت کو ضروری ٹھہراتے ہیں اور نہ ہی اس کے لئے ضروری شرطیں رکھتے ہیں اس سلسلہ میں ان کی رائے اس طرح ہے (شہرت کا مفہوم خود جانا پہچانا ہوتی ہے اور یہ شہرت اس طرح معلوم ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آنحضور کا یہ قول درست ہے۔ (انما الاعمال بالنیات) یا اسی طرح کے دوسرے ایسے اقوال جو درست اور صحیح ہوتے ہیں یا وہ احادیث جو غیر صحیح کہلاتی ہیں جیسے (طلب العلم

فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ) یا جس طرح امام احمد بن حنبلؒ نے ایسی چار مشہور حدیثوں کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضورؐ سے بازاروں کی باب میں منقول ہیں لیکن اس سلسلہ میں مشہور سند نہیں ہے جیسے:

(۱) من بشرنی بخروج آذار بشرتہ بالجنۃ (جو مجھ کو دوزخ سے نکلنے کی خوشخبری دے میں اس کو جنت کی خوشخبری دوں گا)۔

۲ - ومن آذیٰ ذمیا فانا خصیمہ یوم القیامۃ (اور جو کسی ذمی کو تکلیف دے میں قیامت کے دن ان کا دشمن ہوں گا)

۳ - یوم نحرکم یوم صومکم (تمہاری قربانی کا دن تمہارے روزہ کا دن ہے)۔

۴ - وللسائل حق وان جاء علی فرس (سوال کرنے والے کا حق ہوتا ہے چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

اور دوسرے پہلو سے مشہور حدیث اس کو کہتے ہیں جو اہل حدیث اور دوسرے اہل علم میں مشہور ہو جیسے آنحضور کی یہ حدیث: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں)۔

اور اسی طرح کی متعدد حدیثیں ہیں جو اہل حدیث کے نزدیک مخصوص طور پر مشہور ہیں لیکن دوسرے اہل علم کے نزدیک یہ مشہور نہیں جیسے: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قنت شہرا بعد الرکوع یدعو علی رعل و ذکوان) (بلاشبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینہ تک متواتر رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھتے رہے اس دعائے قنوت میں قبیلہ رعل اور ذکوان کی تباہی کے باب

میں دعا کرتے تھے)۔

ابن الصلاح مزید اس طرح تذکرہ کرتے ہیں اور امام النووی بھی اس سے متفق ہیں کہ خبر متواتر خبر مشہور ہی کی ایک قسم ہے خبر متواتر مستقل بالذات کوئی قسم نہیں ہے وہ تحریر فرماتے ہیں "مشہور متواتر ان حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن کو فقہاء اور اصولیین تذکرہ کرتے ہیں لیکن حدیث کے ماہرین اس کو مخصوص نام سے موسوم نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی انکو متواتر کے نام سے یاد کرتے ہیں" مزید براں ابن الصلاح خبر مشہور کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) خبر مشہور جو صحیح اور درست ہو (۲) خبر مشہور جو صحیح اور درست نہ ہو۔ (۳) خبر مشہور جو متواتر میں شمار ہوتی ہو۔ ملاحظہ ہو" مقدمہ ابن الصلاح" ص ۱۳۴، ۱۳۵ المطبوعہ ملتان عام ۱۳۵۷ھ ہجری)

(علامہ جلال الدین السیوطیؒ (تدریب الراوی شرح تقریب النووی ج ۲ ص ۱۷۵، ۱۷۶)

خبر مشہور کو تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(۱) وہ خبر مشہور جو سند کے پہلو سے حسن ہو (۲) وہ خبر مشہور جو سند کے پہلو سے کمزور ہو۔ (۳) وہ خبر مشہور جو سند کے پہلو سے بالکل غلط اور بے بنیاد ہو (ملاحظہ ہو تدریب الراوی شرح تقریب النووی للعلامہ جلال الدین السیوطی ج ۲ ص ۱۷۵، ۱۷۶)

اس سلسلہ میں ابن کثیر کی دوسری رائے ہے وہ اپنی تصنیف (الباعث الحثیث ص ۱۶۰ المطبوعۃ دار التراث القاہرۃ العام ۱۳۹۸ھ م) میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں (شہرت کا پہلو نسبی اور خاندانی سے بھی شہرت کا پہلو کبھی کبھی

محدثین کے نزدیک شہرت پا جاتا ہے یا تواتر کے اس درجہ کو پہنچ جاتا جس کے بارے میں ان کے علاوہ دوسروں کو بھی معلومات نہیں ہوتی ہے لیکن پھر بھی اس تواتر کے سبب یہ مشہور خبر متواتر میں مستفیض کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اور اس کے نقل کرنے والے بھی زیادہ ہوجاتے ہیں جیسے سابقہ میں تین حدیثیں پیش کی گئی ہیں اور کبھی کبھی یہ مشہور حدیثیں درست اور صحیح ہوجاتی ہیں جیسے:
(الاعمال بالنیات) اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے لوگوں میں ایسی حدیثیں مشہور ہوتی ہیں جن کی کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔ یا کلی طور پر گھڑی ہوئی ہوتی ہیں اور ایسا اکثر ہوتا ہے اور امام احمدؒ سے جو چار حدیثیں نقل ہوئی ہیں اور جو لوگوں میں بے حد مشہور ہوگئی ہیں ان کی کوئی سند نہیں ہے) (بحوالہ الباعث الحثیث علامہ ابن کثیر ص ۱۴۰ المطبعہ دار التراث القاہرہ عام ۱۳۹۸ھ)

سابقہ تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور حدیثوں کی مزید تین قسمیں ہوتی ہیں
(۱) المشہور المتواتر المستفیض: وہ متواتر مشہور خبر جو تینوں سے منقول ہو۔
(۲) المشہور الصحیح: وہ خبر جو مشہور ہو اور سند بھی درست ہو۔
(۳) المشہور الموضوع: ایسی مشہور خبر جو بے بنیاد اور گھڑی ہوئی ہو۔

۲: متاخرین محدثین کے نزدیک خبر مشہور کی تعریف؛

آٹھویں صدی کے بعد کے محدثین کی خبر مشہور کے بارے میں یہ رائے ہے کہ وہ خبر مشہور کی تعریف کا تعیین دوسرے ذرائع سے کرتے ہیں اور اس کے لیے متعدد شرائط مقرر کرتے ہیں اور اس کی ایک ہی تقسیم کرتے ہیں ان محدثین میں سے علامہ ابن حجر العسقلانیؒ ہیں وہ اس سلسلہ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

(خبر مشہور کے بارے میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اس خبر آحاد کی بھی قسم کہلاتی ہے جس میں بیان کرنے والے راویوں کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہوتی محدثین متاخرین کے نزدیک اسی وضاحت کے ساتھ اس کو خبر مشہور کہا جاتا ہے پھر مشہور خبر مطلق مانی جاتی ہے اور جس کی شہرت مختلف زبانوں کی بنیاد پر ہوتی ہے اس طرح خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جس کی سند ایک سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ ایسی خبروں کی اصل میں کوئی سند نہیں ہوتی) ملاحظہ ہو (شرح نخبۃ الفکر) العلامۃ ابن حجر العسقلانی ص ۱۷ المطبوعۃ ملتان) اس طرح خبر مشہور دو قسموں میں تقسیم ہوتی ہے۔

(۱) اصطلاحی مشہور خبر (۲) غیر اصطلاحی مشہور خبر

مشہور محدث علامہ عبدالحق الدہلویؒ نے مشہور خبر کی اصطلاحی تعریف اس طرح بیان کی ہے جس کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے (صحیح حدیث اس کو کہتے ہیں جس میں راویوں کی تعداد اگر دو سے زیادہ ہو تو اس کو مشہور اور مستفیض کہا جاتا ہے) "مقدمہ فی اصول الحدیث" للعلامہ الشیخ عبدالحق ص ۷۷ المطبوعۃ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ڈاکٹر محمود الرحمان خبر مشہور کی توضیح بھی اس طریقہ پر کرتے ہیں جس طریقہ پر علامہ ابن حجر نے کی ہے خبر مشہور کی دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) اصطلاحی خبر مشہور (۲) غیر اصطلاحی خبر مشہور

اصطلاحی مشہور خبر سنت کی زبان میں اس خبر کو کہتے ہیں جس کی شہرت ہو اور جسکو اعلانیہ طور پر بیان کیا جائے اور اسکو ظاہر کیا جاوے سنت میں المشہور (شهرت الامر اذا اعلنته والخبرته) کا اسم مفعول ہے

اور اس اظہار اور اعلان کے سبب اس کو مشہور کہا جاتا ہے اور جس میں راویوں کی تعداد تین یا تین سے زیادہ ہوتی ہے لیکن یہ تعداد حد تواتر تک نہیں پہونچتی۔

۲ - غیر اصطلاحی زبان میں خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جس کی شہرت بہت سی زبانوں پر عام ہو اور جن میں شرطیں نہ پائی جاتی ہوں اور یہ خبر مشہور ایسے پہلوؤں پر مشتمل ہیں جن کی کوئی بھی ایک سند نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی ایک سے زیادہ ان کی سند ہوتی ہے۔ اور جس کی سند کی کوئی بھی بنیاد نہیں ہے۔ پھر غیر اصطلاحی زبان میں خبر مشہور کی درج ذیل چھ قسمیں ہیں۔

(۱) خبر مشہور اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کو اہل حدیث کے یہاں شہرت ہوتی ہے۔ جیسے یہ حدیث ہے "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قنت شہراً بعد الرکوع یدعو علی رعل و ذکوان" (متفق علیہ)

(۲) خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جو اہل حدیث علماء اور عوام کے درمیان زیادہ مشہور ہوتی ہے جیسے "المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ" (متفق علیہ)

(۳) خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جو فقہاء کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے جیسے حدیث: "ابغض الحلال الی اللہ الطلاق" (صححہ الحاکم فی المستدرک)

(۴) خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جو اصولیین کے نزدیک مسلم ہوتی ہے جیسے یہ حدیث "رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ" (صححہ ابن حبان والحاکم) میری امت سے بھول اور چوک اٹھائی گئی ہے اور جس کو ناپسند کرتے ہوں۔

۵۔ خبرِ مشہور اس کو کہا جاتا ہے جو اہل نحو کے نزدیک قابل تسلیم ہوتا ہے جیسے یہ حدیث: "نعم العبد صہیب لو لم یخف اللہ لم یعصہ" جس کا کوئی بنیاد (ترجمہ: بہترین بندہ صہیب ہے اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو وہ اسکو نہیں کرتا)

(۶) خبرِ مشہور اس کو کہا جاتا ہے جو عام لوگوں میں ناپسند ہو جیسے یہ حدیث (العجلة من الشیطان) (اخرجه الترمذی وحسنه) (تفسیر مصطلح الحدیث لمحمود الرحمان ص، ۳۳-۳۴) (جلد بازی شیطان کی عادت ہے۔

اس قسم کے بارے میں علامہ جلال الدین السیوطیؒ نے (تدریب الراوی) جلد ۲ میں تفصیلی بحث کی ہے اور علامہ الزرکشیؒ نے اپنی تصنیف (التذکرة فی الاحادیث المشتہرة ص۱۰۳) میں خبرِ مشہور کے بارے میں ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں جو کتاب مرتب کی ہے اس کو حروف معجم سے مرتب کیا ہے اور خبرِ مشہور اسکو مانا ہے جس کو زیادہ لوگ مانتے ہوں۔

سابقہ تعریفوں سے یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ محدثین مشہور خبر کے بارے میں کافی مختلف مسالک رکھتے ہیں اور مشہور حدیث کی متعینہ تعریف کے بارے میں متفق الخیال نہیں ہیں اس باب میں متقدمین اور متاخرین کا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے مختصر یہ کہ انھوں نے خبرِ مشہور کو دو مشہور قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) (المشہور الاصطلاحی) وہ خبر جو اصطلاحی طور سے زیادہ مشہور ہو (۲) المشہور غیر اصطلاحی) وہ خبر جو اصطلاحی پہلو سے زیادہ مشہور نہ ہو۔

(۱) اصطلاحی پہلو سے جو خبر زیادہ مشہور ہو اس کو کہا جاتا ہے جس کو روایت کرنے والے دو یا دو سے زیادہ افراد ہوں لیکن یہ تعداد تواتر کی حد کو نہ پہونچے

بحوالہ علامہ ابن الحجر العسقلانی (تدریب الراوی ص/۱۷) اس مشہور خبر کو خبر واحد میں شمار کیا جاتا ہے اگرچہ یہ خبر مشہور کی قسموں میں نہیں ہوتی: بحوالہ (مقدمہ ابن الصلاح) علامۃ بن الصلاح ص/۱۳۵

لیکن اصطلاحی پہلو سے خبر مشہور اس کو کہا جاتا ہے جس کی صحیح تعریف تو بیان نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی غیر صحیح طریقہ پر اسکو تقسیم کیا جا سکتا ہے اس میں سے صحیح بھی ہوتی ہے، حسن بھی، ضعیف اور موضوع بھی ہوتی ہے۔ اگر اصطلاحی پہلو سے خبر مشہور صحیح ہوتی ہے تو اس کی یہ ممیزہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کو نہ تو غیر اصطلاحی خبر مشہور پر ترجیح دی جاتی ہے۔ بحوالہ تیسیر المصطلح الحدیث لمحمود الرحمٰن صفحہ ۲۳-۲۴۔

متواتر خبر سے جڑی ہوئی ہونے کے سبب خبر مشہور کو غریب حدیث کے برابر کا درجہ حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس کے مباحث اور حقائق کا دار و مدار زیادہ تر اسناد پر ہوتا ہے لیکن خبر متواتر میں اسناد کا خیال نہیں کیا جاتا ہے اسی طرح راویوں کی تعداد بھی خبر مشہور میں خبر آحاد کے برابر نہیں ہوتی اور نہ ہی متواتر کی تعداد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اول اور آخر میں خبر مشہور غریب حدیث سے زیادہ مشابہ ہوتی بحوالہ " علوم الحدیث " ص/۲۴، صبحی صالح۔

اصطلاحی پہلو سے محدثین کے نزدیک مشہور کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) صحیح (۲) غیر صحیح (۳) حسن (۴) ضعیف (۵) باطل۔

محدثین کے نزدیک غیر اصطلاحی پہلو سے خبر مشہور کی کیا تعریف کی جاتی ہے!

وہ حدیثیں جو علماء اور عالم لوگوں کی زبانوں پر شہرت کی کثرت کے سبب

مجتہدین صدیوں میں زیادہ پھیل ہوئی تھیں اوران میں کسی طرح کی شرط کا ہونا ضروری نہیں ہوتا تھا۔ اس خبر کو مشہور غیر اصطلاحی کہا جاتا تھا اور یہ حسب ذیل امور سے جڑی ہوتی تھیں ۔ (۱) جس کے لئے ایک سند کی بھی ضرورت نہ تھی (۲) جس کے لئے زیادہ سندوں کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

یہ ہی حدیثیں ایسی ہوتی تھیں جو مختلف علوم کے علماء کے اور عوام کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے اور جن کی کوئی سند نہیں ہوتی ہے۔

عوام اور خواص کے درمیان ان حدیثوں کی شہرت کے سبب محدثین نے یہ ہی قسم وضع کی اور اس کو غیر اصطلاحی خبر مشہور نام دیا گیا ایسی حدیثیں اہل حدیث علماء اور عوام کے درمیان میں زیادہ شہرت پاتی تھیں مخصوص طور پر ان کے درمیان جو حدیث، فقہ، اصول اور نحو کے قواعد کی زیادہ مہارت رکھتے تھے سابقہ تجزیہ میں ان حدیثوں کا تذکرہ آچکا ہے - پھر غیر اصطلاحی خبر مشہور کی توضیح کیا جاتا ہے اور نہ ہی غیر صحیح بلکہ صحیح غیر صحیح، حسن، ضعیف اور باطل حدیثوں کی آمیزش ہوتی ہے جیسا کہ علامہ سیوطیؒ نے اپنی تصنیف (تدریب الراوی جلد ۲ ص/ ۱۷۳-۱۷۵) میں متعدد حدیث صحیح حدیث حسن اور حدیث باطل بیان کی ہیں مشہور حدیث کی مثال یہ صحیح حدیث ہے

" ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعہ من الناس الی آخرہ "۔

ترجمہ: بلاشبہ علم کو اس وقت تک نہیں اٹھا لیتا ہے جبتک کہ لوگوں میں سیکھنے کا جذبہ ہو اور لوگ ایک دوسرے سے اس کو نہ چھین لیں۔

اس طرح مشہور حدیث کی مثال یہ حسن حدیث ہے " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" (علم کا طلب کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر فرض ہے

اس طرح مشہور حدیث کی مثال یہ ضعیف حدیث ہے (جبلت القلوب علی حب من احسن الیہا) ترجمہ: انسانی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے جیسا ان سے برتا جاتا ہے۔

مشہور حدیث کی مثالیں متعدد ایسی باطل حدیثیں ہیں جو بکثرت ہیں اور جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا یہ مرفوع حدیثوں میں بھی ہیں۔ موقوف اور موضوع حدیثوں میں بھی شامل ہیں زیادہ تر ایسی حدیثیں وہ ہوتی ہیں جو لوگوں کے زبانوں پر رائج ہوتی ہیں جیسے یہ حدیثیں ہیں (من عرف نفسہ فقد عرف ربہ) جس نے اپنے آپکو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا (یوم صومکم یوم نحرکم) تمہارے روزے کا دن قربانی کے دن جیسا ہے یا (کنت کنزا لا اعرف) میں ایسا خزانہ ہوں جو پہچانا نہیں جا سکتا۔ بطور نمونہ کے بہت سی کتب حدیث ہیں جن میں ایسی حدیثوں کا تذکرہ ملتا ہے حافظ نے اس سلسلہ میں ایک کتاب لکھی ہے اور اس کا نام رکھا ہے المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الاستند) اسی طرح شیخ عبدالرحمٰن بن الربیع الزبیدی (صاحب الوصول فی کتاب) نے اس سلسلہ میں جو کتاب لکھی ہے اس کا (تمییز الطیب من یدور علی السنۃ الناس من الحدیث) اس باب میں بطور تبصرہ و تنقید شیخ البیرونی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام رکھا ہے (اسنی المطالب فی احادیث مختلفۃ المراتب) اور عجلونی نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ (کشف الخفاء ومزیل الالباس عما اشتہرون الاحادیث علی السنۃ الناس)

یہ تمام کتابیں چھپ چکی ہیں اور ان تمام کتابوں میں خبر مشہور کی بھی تعریف بیان ہوئی ہے اور بھی قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اس باب میں اصولیین اور محدثین کا کسی قدر باہمی اختلاف رہا ہے بحوالہ الباعث الحثیث لابن کثیر ص ۱۴۰

IN A NUT SHELL

All India Persian Teachers Association in collaboration with the office of the Cultural Counsellor , Embassy of I.R.Iran organises All India Persian Refresher Course for persian teachers of Indian Universities , colleges and Institutions every year. The main object of organising such a cultural get-together is to keep the Indian persian teachers in touch with the latest changes and development in moden Persian language and litrature as well as its colloquial and spoken forms. For this purpose some of the prominent Indian scholars have been invited to cooperate whth their Indian counterparts.

This year too, the reorientation pragramme for the Persian teachers was held at the Hamdard University from 7th to 19th June 1997 in which 250 delegates from India has participated . The inaugral session which started on 7th June was attended by H.E. Ali Reza Sheikh Attar the Ambassador of Iran , janab Hakim Abdul Hameed, Chancellor Jamia Hamdard University and Mr Mohsin Miri the Cultural Counsellor of Islamic Republic of Iran , besides many other prominent personalities of Delhi.

The Valedictory address was given by the Director of Promotion of Languages Govt. of India on 19th June 1997.Prof. A. W. Azhar, Prof Abedi and eminent persian Professors also addressed this august gathering.(Report: Mr. Hamidullah Bhatt - chief guest Valedictory function)

★★★★★

I have been participating in almost all the important functions of Iran culturel house, New Delhi for the last about 10 - 12 years.

For the last three years, since Mr.Syed Mohsin Meri assumed the office of the counsellor, I have been observing that new and important changes have emerged and new developments are taking place. The strengthening of Indo-Iran relations is really a good step. Efforts have also been made to promote seminars and Persian teachers annual programmes for which Counsellor Syed Mohsin Meri, made a lot of contribution for this cause. And he has done a lot to move further on important matters as also for the benifits of the people of India and Iran. I give high regards to him and very much appreciate his sincere efforts in strengthening the ties between the two countries in all the fields. No body can deny his ability and competency. His predecessor also done commandable work but his contribution is no doubt of remarkable value, especially in the prevailing circumstances as both the countries are passing through a difficult time. Hence I give special importance to his work and contribution.

(Excerpts from a letter to Iranian Cultural Counsellor by Mufti Amidur Rehman Usmani, Director Nadwatul Musannefien, Delhi)

Christoph Wolf of the German Chamber of Commerce has predicted that the current row will be nothing more than a temporary irritation in German - Iranian trade relations otherwise the Germans would have never dared to go so impudent that it could jeopardize all the interests in the Persian Gulf region and the whole Islamic World and deprive themselves of a big market. As far as the court ruling is concerned it commands no legal value simply because the accused party was given no chance to defend itself and ironically those who testified in the case as witness were known terrorist with a long criminal record are being wanted by Iranian courts.

The Australian Trade Minister said that the government would not cut off trade with Iran over a German court's finding .

Japan refused to support the US law enacted last year requiring sanctions against the companies that invest $40 million or more in any project in Iran and stopped short of emulating the European Union countries which have recalled their Ambassadors from Tehran.

The Iranian Foreign Minister, Mr. Ali Akbar Velayati, described as biased and illegal the German court ruling implicating the Iranian Government in terrorism. The accusation is more like a political manifesto than a legal document. It has no judicial value.

The judgement violated the jurisdictional immunities of states. Domestic courts in any country are incompetent to hear claims against any sovereign state.

a criminal sought here for hijacking a plane to flee the country in the early 1980's. The ruling is unfair , expartc , biased and illegal because the witnesses were hostile and themselves have terrorist criminal pasts. It is only a political tool to be exploited to distort Iran's image. Anxious at what sees as European indecisiveness the US has jumped into the fray with the demand that the EU take punitive steps against Iran. A high powered deligation from Washington is doing the rounds of various European capitals trying to build up momentum for economic sanctions. In order to lend more weight to the as yet unproven allegation that Iran is a sponsor of terrorism, the US has repeated its accusation of Iranian complicity in the bombing of an American military base in Saudi Arabia last year The blast near Deharan lead to the death of 22 US soldiers but all attempts to establish an Iranian connection have so far come to nought. Intellectuals have condemned the Berlin court ruling implicating Iranian leaders in the murder of four Kurdish opponents as politically motivated and said that it commandec no legal value. President Akbar hashemi Rafsanjani said the Berlin court verdict was a historical disgrace to the German judiciary system. He said it is interesting to note that the political ruling of the German court was timed with the admission the US State Department that the so called Middle East peace process had reached a dead end. When the European Ambassadors were withdrawn in protest at the the late Imam Khomeini's Fathwa against the apotate author Salman Rushdie in 1989, Iran's treasury and its ware-houses were almost empty and production had nearly been stopped due to the Iraqi Imposed war, still the European Ambassadors returned defeated. Today Iran is much stronger and every day a new page is being turned, thanks to the the reconstruction. The whole German affair is as a fleeting thunder storm in the wake of which the sky becomes clear. The ruling court is unfounded and influenced by a political propaganda campaign led by the United States.

The European Union has suspended its five year critical dialogue with Iran and has called on all the member states to recall their ambassadors from Tehran, but dispatches quoting diplomats reported from Brussels that the EU was unlikely to break off diplomatic relations with Tehran or impose any form of sanctions.

Greace mean while broke with its EU partners by saying that it had no plans to recall its ambassadors. This decision will only serve to further isolate Iran rather than helping her to rejoin the International Community, said a Greek Foreign Ministry Official.

France ruled out imposing trade sanctions against Iran despite the EU decision to suspend dialogue with Tehran. It is not without reason that

Berlin Verdict

A POLITICAL MANIFESTO

by Dr. S. Quayam Hussain
Ex. General Secretary Political Science Cultural Society,
Ex. fellow of IIPA (New Delhi). Member of Forum of Friends of ICCR NewDelhi

A surprise ruling by a Berlin court implicating Iranian leaders in the murder in 1992 of Iranian Kurdish dissidents in Berlin has apart from condemnations and approvals, prompted different speculations on what Germany to take a confrontational tone against Iran and that whether this crisis will develope into a full fledged diplomatic confrontation between Tehran and Bonn. The provocative German move, staged by the judge of the Berlin court, has prompted some observers to believe that there is going to be the worst situation including a rupture in the diplomatic relations and retaliations. The reason: Iran simply cannot tolerate this degree of impudence from Germany seeing that its top leaders are accused, even in a politically motivated court ruling, of ordering the assassination.

There are also observers who make a different arguments: Bonn had received hints from some circles that the court decision, irrespective of its outcome, would not cause a permanent crisis in the relation between the two countries.

The alleged hints convinced the Germans that in the worst situation, there will merely be anti Germany public demonstration and that the authorities would bring such protests under control.

The prosecution never demonstrated any evidence to backup its irresponsible allegations and none of the witnesses were in a position to produce reliable testimony. Testimony by the exiled ex-Iranian President Mr. Abul Hasan Bani Sadar and an alleged former Iranian intelligence official were the main basis for the charges by the prosecution against Tehran. Iran has argued that Mr. Sadar himself is

سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید

چانسلر

جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

ستمبر ۹۷ء

برہان

جلد ۱۲۱ شمارہ ۳

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

جو ملک ابھی کچھ عرصہ تک دنیا کے بہت بڑے حصے پر حکمراں تھا اور جس ملک کے باشندوں کو اپنے ملک کی تہذیب اور انسانیت پر بڑا فخر و ناز تھا اس ملک کی ملکہ ڈائنا اپنے خاوند شہزادہ پرنس چارلس کی اپنے سے بے وفائی اور دوسری بے نکاحی عورتوں کے ساتھ معاشقے سے پریشان ہوکر اس سے علیحدگی و طلاق حاصل کرنے پر بالآخر مجبور ہوئی اور پھر جب اس نے اپنی طلاق کے بعد شہزادی ملکہ نے کسی دوسرے مرد سے عشق کی پینگیں بڑھائیں تو وہ کسی کار حادثہ کا شکار ہوکر ملک الموت کے آغوش میں جا پہنچی۔ یہ ہے مہذب ملک . . . . کے لوگوں کا کردار . . . . دوسرے لفظوں میں ماڈرن انسانوں کے کنگ میکرس . . . . مغربی ملکوں کے اخلاق و انسانیت کا حال و خاکہ۔ جہاں مرد کے لئے کوئی قید ہے کہ وہ کسی سے بھی کوئی تعلق قائم کرے چاہے کسی بھی قسم کا اور نہ ہی عورت کے لئے کوئی پابندی ہے کہ وہ کسی ضابطہ میں مقید ہونے کی تکلیف گوارہ کرے۔ پرنس چارلس اور شہزادی ڈائنا کی شادی ۱۹۸۱ء میں انگلینڈ کے دارالحکومت لندن میں ہوئی تھی اور جس کے نتیجے میں دونوں کے یہاں دو بیٹے ولیم اور ہینری پیدا ہوئے جو اب جوانی کی دہلیز پر چڑھنے والے ہیں۔ کہتے ہیں کہ پرنس چارلس ایک خاتون کومیلا پارکر کے عشق میں مبتلا ہوگئے ان کی رنگ رلیوں کی خبریں جب شہزادی ڈائنا کے کانوں میں پڑیں تو پہلے انھیں ان خبروں پر یقین ہی نہیں آیا مگر جب آئے دن یہ خبریں باوثوق ذرائع سے شہزادی ڈائنا کے کانوں میں چھید ڈالتی رہیں تو پھر اس نے بھی اپنے معاشقے شروع کردیئے اور موت سے

اس بارہ دن پہلے ہی شہزادی ڈائنا کے محبت میں پھنسے ایک مصری مسلمان ارب پتی مسٹر ڈوڈی الفہد تھے جن کے والد کا مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہوٹلس وغیرہ کا کاروبار ہے جن کے یہاں رات بھی دن کی روشنی کے مانند ہے اور جن کا ہر دن وہر رات عشق کی رنگینیوں ہی میں گذرتا۔

ڈائنا الفہد کے عشق میں کیسے مبتلاء ہوئی یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے محض ۱۹ سال کی عمر میں اس کی پرنس چارلس سے شادی ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ ماں بن گئی ۳۲ سال کی عمر میں اس کا اپنے خاوند پرنس چارلس سے اختلاف ہو گیا جو تقریباً دس سال چلا دس سال کوئی کم نہیں ہوتے اس درمیان میں ڈائنا اپنی جوانی کی ایک حد پار کرکے پختگی کی عمر کے قریب پہنچ گئی۔ ۳۳ سال کی عمر میں وہ مطلقہ شہزادی بن گئی اور اس کے بعد اس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سنائی دینے لگی۔ پاکستان آئی تو یہاں اس کے کسی مسلمان ڈاکٹر سے تعلقات کے قصے چرچا میں ہونے لگے۔ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے رہن سہن اور طرز معاشرت کی تعریف کرنی شروع کر دی اسلام سے اس کے لگاؤ کے واقعات کئی کئی بار سننے کو ملے اور آخر میں جب اس کی موت ہوئی تو وہ اپنے ایک مسلمان منگیتر ہی کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے محبوب و عاشق اور منگیتر ڈوڈی الفہد پیرس کے اپنے ایک ہوٹل میں کھانا کھا کر کار سے کہیں جا رہے تھے کہ کار حادثہ کا شکار ہوئی ڈائنا اور اس کے عاشق و محبوب الفہد دونوں ہی موت کے منہ میں جا پھنسے۔ الفہد نے ڈائنا کو بیش قیمت قیمتی تحفے تحائف دیئے اور اسی میں ہیرے کی ایک انتہائی قیمتی انگوٹھی بھی اپنی محبت کی نشانی کے طور پر اسے پیش کی اسی طرح شہزادی ڈائنا نے بھی بیش قیمت تحفے دیکر الفہد سے اپنی محبت کا اظہار

کیا ایک تحفہ پر یہ الفاظ کندہ کرائے "شہزادی ڈائنا کی طرف سے محبت کے ساتھ"
بہر حال یہ دونوں ہی جواں دل محبت کے اتھاہ نشے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
تھے دونوں طرف بیقراری تھی محبت کی آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی دونوں ہی
کے دل مچل رہے تھے جلد از جلد محبت کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لئے
لیکن موت نے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی۔

اکتالیس سالہ مصری ڈوڈی الفہد کی تو اس کے والد الفیض نے ٹیک لینڈرس
لندن کے قبرستان میں حادثہ کے کچھ گھنٹوں بعد ہی تجہیز و تکفین کردی۔ لیکن تمام
دنیا میں سوگواروں کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے موت کے ۶ دن بعد یعنی ۶ ستمبر کو
ایک جھیل میں بنے ٹاپو پر دفنا دیا گیا جس میں دنیا بھر کے عظیم سیاستداں حکمراں
رہنما شریک ہوئے بی بی سی نے تقریباً ۴۴ زبانوں میں اس کے آخری سفر کا
آنکھوں دیکھا حال نشر کیا۔ پورے برطانیہ کے عوام نے آنسوؤں کے ساتھ
اسکو رخصت کیا میلوں دور تک اس کے جنازہ کو عوام نے کندھا دیا تقریباً ۶۰
لاکھ انسانوں کا جم غفیر اس کے آخری سفر کے وقت دیدار کے لئے موجود تھا
کہتے ہیں کہ آج تک اس قدر عوام کا ہجوم کسی جنازہ میں نہیں دیکھا گیا۔ برطانیہ
کے عوام کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ وہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ تک پر ڈائنا کی
موت کی ذمہ داری کا شک کرنے لگے اور اس کے لئے ان پر نکتہ چینی کی بوچھار
کردی۔ اور ہمارے لئے یہی پہلو قابل غور ہے اب بقیہ گفتگو اس پہلو کے
پیش نظر ہم کرنا چاہیں گے۔

مغربی ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس طرح لیڈران، اخبارات اور

دیگر ذرائع ابلاغ سے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اس کے پیش نظر تمام مغربی ممالک میں جس واقعہ میں بھی کسی بھی طرح اسلام یا مسلمان کا کسی طرح نام آ جائے تو وہاں کے عوام میں نفرت وغصہ کا لاوا پھوٹ پڑنا چاہیئے نہ کہ وہاں برعکس اس کے دوسرا ہی منظر دیکھنے کو ملے۔ جیسے ہمدردی ورحم کے جذبات صاف دکھائی دے رہے ہوں۔ شہزادی ڈائنا کی موت نے ہمیں کچھ اس طرح کا احساس کرایا ہے اور اسی طرح کی مغربی دنیا میں تصویر پیش کی ہے شہزادی ڈائنا برطانوی عیسائی شہری شہزادہ پرنس چارلس سے طلاق لینے کے بعد ایک مسلمان کے عشق میں مبتلا رہوئی سیاستدانوں اور کلیسا کے پادریوں نے اسے کیسی ہی بُری نظر سے کیوں نہ دیکھا ہو مگر عوام نے اپنے سیاستدانوں و حکمرانوں اور مذہبی راہنماؤں کے خیالات کے خلاف ہی اپنے خیالات ظاہر کئے مرجیس ڈائنا اور اس کے محبوب الفہد کے ساتھ ہمدردی بھری ہوئی تھی یہ ایک پہلو ہے جسے مبلغین اسلام اپنے دماغ میں محفوظ رکھیں اس پر اظہار خیال ابھی ذرا ٹھہر کر۔

یہ بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ جس دن تمام دنیا کے اخبارات نے یہ خبر شائع کی کہ شہزادی ڈائنا ڈوڈی الفہد کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو رہی ہے اس خبر کو پڑھتے ہی ہمارے دماغ میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کیا عیسائی دنیا اور برطانوی حکمراں اس بات کو برداشت کریں گے کہ برطانوی تخت پر مستقبل قریب میں جو بادشاہ بیٹھنے والا ہے اس کی ماں کا خاوند ایک مسلمان ہے۔ الفہد سے شادی کے بعد ڈائنا کے اولاد ہوئی تو برطانوی بادشاہ کا تیسرا بھائی یا بہن مسلمان ہے۔ ہمارا دماغ ان ہی سوالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈائنا اور الفہد کی کار حادثہ میں موت کی خبر آ گئی اور اس کے دوسرے دن ہی لیبیا کے

کرنل قذافی اور معر کے ایک مبصر کا یہ تبصرہ بھی نظر سے گذرا کہ شہزادی ڈائنا اور اس کے محبوب الفہد کی موت میں کوئی سازش ہے اور برطانوی حکمرانوں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت ہوتی کہ برطانوی تخت کے وارث کی ماں یا بھائی وبہن مسلمان بھی ہے۔ اس میں کہاں تک صداقت کا پہلو ہے اس پر واقعات خود ہی آسانی سے روشنی ڈال رہے ہیں اور ڈالیں گے، ہم اور آپ کیوں اس پر مغز پچی کریں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کلیساؤں کا سارا زور مذہب اسلام کی کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے اور وہ عیسائیت کا بول بالا کرنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتے ہیں اور اس میں چاہے امریکہ ہو یا فرانس یا برطانیہ اسی نظریہ سے اس نے اپنے سب سے بڑے مذہبی دشمن یہود سے ہاتھ ملایا ہوا ہے اور اسرائیل کو جس طرح آگے بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں وہ بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

اب ذرا ہم پھر آرہے ہیں اسی ایک پہلے والے پہلو کی طرف کہ اس قدر ترکیبیں سازشیں، کوششیں اسلام مخالف ہونے کے باوجود کلیسا اپنے ان ناپاک خفیہ منصوبوں میں کامیاب نہیں ہو پا رہا ہے۔ انہیں نہ تو شرک و بدعت اور مورتی پوجا سے کوئی لینا دینا ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ دور حاضر میں سائنسی ماحول کے انسان کے لئے سب سے زیادہ اپیل کرنے والا مذہب اسلام ہی ہے اور یہ بات بھلا عیسائیت کے مبلغین کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کی ہر کوشش اسلام مغائر رہی ہے ہر توڑ اسلام پر ہے لیکن جب وہ اس قدر کوششوں کے بعد نہ کامیاب ہوں تو ان کا جھنجھلاہٹ قابل فہم ہی ہے۔ اس موقع پر ہمیں اس بات پر اطمینان ہے کہ تمام دنیا اسلام

کی حقانیت کی اندر ہی اندر قائل نظر آ رہی ہے انہیں کلیساؤں کے اختیارات اور رویئے سے بے انتہا شکایات بھی ہیں۔ اس لئے اب ان کے دل و دماغ میں اسلام یا مسلمانوں سے متعلق کوئی نفرت قطعاً نہیں ہے جب ہی تو جن جن جگہوں پر پہلے اسلام اور مسلمانوں کا عروج تھا اور عیسائیوں نے اپنے صلیبی جنگوں کے طفیل اور دیگر سازشوں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کو وہاں سے ختم کر کے عیسائیت کا پوری طرح سے تسلط قائم کر دیا تھا۔ وہاں بھی اب مسلمانوں کے حالات بحال ہو رہے ہیں مسجدیں اور مکتب قائم ہونے شروع ہو گئے ہیں اور اسلامی معاشرہ کی چہل پہل دکھائی دینے لگی ہے نفرت کی جگہ ہمدردی اور تعلقات استوار کرنے بنانے کے جذبہ نے لے لی ہے شہزادی ڈائنا کی موت کے بعد اس سے پیدا ہوئی عیسائی عوام کی بے پناہ ہمدردی اس کا سب سے بڑا خوش آئند نظارہ ہے جس کو مبلغین اسلام اپنے لئے نیک شگون سمجھتے ہوئے عیسائیت و چرچ اور پادریوں سے بیزار عوام الناس کی طرف پورے ساز و سامان کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز کر دینے چاہیئے اسی میں ملت اسلامیہ کے لئے روشن مستقبل کا خوشخبری پنہاں ہے اہل نظر کی نظریں صاف طور پر دیکھ رہی ہیں۔

مدر ٹریسا بھی ۵ ستمبر ۱۹۹۷ء بروز جمعہ کو انتقال کر گئیں۔ ان کے انتقال سے عیسائی دنیا کو بڑا گہرا دھچکا لگا ہے کہنے کو وہ ایک ہمدرد غمگسار انسانیت تھیں لیکن ان کی تمام خدمات بباطن عیسائیت کی تبلیغ و نشر و اشاعت کی معین تھیں اسی وجہ سے انہیں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا اور نوبل انعام

انھیں کیوں نہ ملتا جبکہ اس کے دینے والے عیسائی مذہب کے پیرو کار ہیں یہاں
ہم مسلمانوں کے لئے ان کی شخصیت میں جو دیکھنے کی بات ہے وہ ہے ایسا مزاج کا
شرافت جذبۂ خدمتِ خلق، قربانی، ایثار ہے اپنے مذہب کی تبلیغ انھوں
نے اسی جذبہ وایثار اور قربانی کے ساتھ خدمت خلق کے راستے سے کی جو ایک
سچ میں شامل ہے۔ اپنا بچپن، اپنی جوانی، اپنی رشتہ داری عزیز داری
سب کچھ اس ایثار کی تئیں خاتون نے اپنے مذہب کے لئے نچھاور کردیا ۱۹۱۰ء
میں پیدا ہوئی یہ خاتون ۱۹۲۸ء میں مکمل طور پر اپنے کو خدمت خلق وانسانیت
کے راستے سے اپنے مذہب کے سپرد کرچکی تھی اپنی تمام خواہشات اپنی تمام
تمنائیں اس نیک خاتون نے اپنے مذہب کو دیدی ہیں۔ یہ بہت بڑا مجاہدہ
ہے اس خاتون کا، اپنے مذہب پر سچے دل سے قربانی نے انھیں ہماری طرف
سے خراج عقیدت کا مستحق بنا رہا ہے۔

---

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد گرانے والے بڑے لوگوں کا انجام کار قانون
کی گرفت میں لانے کا انتظام شروع ہوگیا ہے دیر سے ہی سہی لیکن رسمی
طور پر ۴۹ لوگوں کے خلاف مقدمات سی بی آئی کے ذریعہ خصوصی عدالت
میں دائر ہوگئے ہیں۔ عدالت نے ۷ اکتوبر ۱۹۹۶ء کی تاریخ مقرر کی ہے
مزید سنوائی کے لئے اس سے جہاں ایک طرف یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے
کہ ہندوستانی قانون میں انصاف ہے اور یہاں کے عوام میں سیکولر
نظریات کے حامیوں کی اکثریت ہے اور وہ کسی بھی مذہب کے خلاف کسی
بھی شخص کے اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور کانگریس

کے ترجمان جناب ڈی این گیڈگل نے بالکل صحیح اور دو ٹوک بات یہ کہی ہے کہ اس صدی کے سب سے بڑے گناہ کے خلاف کارروائی سے ہندوستانیوں کا سر اونچا ہو جائے گا۔ اس کارروائی سے ایک بات اور سامنے آئی ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا مغرور متکبر بڑبولا بال ٹھاکرے تک سہما ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا بیان آیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ بات ثابت کر دے کہ بابری مسجد توڑنے کے لئے میں نے اکسایا تو جو سزا دینا چاہو دیدینا۔ جب وہ اپنے منہ سے یہ بات کہہ رہا ہے کہ بابری مسجد کو توڑنے کے لئے اس نے بالکل کسی کوشش نہیں دی تو پھر ہمیں اسے یہ بات یاد دلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد بال ٹھاکرے نے سب سے پہلے کہا تھا کہ "میں نے غلامی کے نشان کو مٹوا دیا ختم کرا دیا ہے اور ہے کوئی جو مجھ سے باز پرس کی جرأت کرے" ہم تو خیر جب بھی اسے گیدڑ ہی سمجھتے تھے لیکن اب تو اسکو گیدڑ سمجھنے میں کسی کو کوئی تردد ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارا یقین ہے کہ فرقہ پرست فطرتاً بزدل ہوتا ہے کیونکہ اس کی ساری بنیاد بے ایمانی مفاد پرستی پر ٹکی ہوئی ہوتی ہے لیکن ہندوستان کے ان فرقہ پرستوں کی پیٹھ پر کوئی سرکاری طاقت تھی جس کی وجہ سے یہ دندنا رہے تھے اسکے بعد کے بہت سے واقعات نے سچ ثابت کر ڈالا ہے۔ حکومت کی ایک ہی سختی نے ان کے تمام کس بل نکال دیئے ہیں۔ ان کی لن ترانیاں سب کافور ہو چکی ہیں اور اب یہ اپنے لئے کوئی حفاظت کا پہلو تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بابری مسجد کے انہدام سے یہ بات بھی آشکارہ ہو گئی ہے کہ سرکاری ایڈمنسٹریشن میں بھی فرقہ پرستوں کی در پردہ مدد کرنے میں کچھ لوگ ہیں جو اپنے عہدوں سے حلف لینے کے بعد حلف کی خلاف

ورزی کرتے ہیں یعنی ملک سے غداری کے مرتکب ہیں اور وہ سرکاری عہدہ پر متمکن
میں بیٹھ کر سیاسی جماعت کو فائدہ پہنچا کر سرکاری عہدہ سے سبکدوش ہوکر کسی سیاسی
پارٹی میں کھلم کھلا شمولیت کر کے اس کے ذریعہ پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کی ممبری
حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں مذکورہ بالا صورتحال کے پیش نظر کوئی
ایسا ضابطہ عمل لانے کی ضرورت ہے کہ کوئی بھی سرکاری عہدیدار اپنے سرکاری
عہدہ سے ریٹائرمنٹ سے پہلے استعفیٰ دے کر کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل
نہ ہو۔ اس سے ایڈمنسٹریشن سے عوام کا اعتماد بحال رہے گا اور کوئی بھی
بددیانت فرقہ پرست سرکاری عہدہ کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہمت و کوشش
سے باز رہے گا۔ بہر حال بابری مسجد کے انہدام کے ملزمین کے خلاف
سی بی آئی کے اس اقدام کا ہم تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ انشاء اللہ
یہ ملزمین ضرور اس صدی کے سب سے بڑے گناہ کی پاداش میں کیفر کردار
کو جلد پہونچیں گے۔

برہان

برہان کا بدلِ اشتراک (چندہ) ۷۲ روپے سالانہ ہے فی شمارہ چھ روپے۔ نمونہ برہان منگانے
کے لئے سات روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں۔ پاکستان ایک سو ساٹھ روپے، بنگلہ دیش
ونیپال وغیرہ ایک سو روپے۔
عرب ممالک بحری ڈاک سے دو سو روپے یا (بارہ امریکی ڈالر)
" " ہوائی ڈاک سے تین سو روپے یا (پندرہ امریکی ڈالر)
امریکہ، ساؤتھ افریقہ وغیرہ بحری ڈاک سے ڈھائی سو روپے یا (چودہ امریکی ڈالر)
" " ہوائی ڈاک سے ساڑھے تین سو روپے یا (اٹھارہ امریکی ڈالر)
جوابی امور کے لئے لفافہ یا پوسٹ کارڈ ضرور ارسال کریں۔
منیجر

اسلامی دار الافتاء اور منصب مفتی

ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز (کراچی یونیورسٹی)

ظہور اسلام سے اہل اسلام اپنے مذہب کی تعلیمات نسل در نسل حاصل کرتے رہے ہیں۔ سابقون الاولون نے تعلیم دین براہ راست جناب سرور کائنات خاتم الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حاصل کی اور نبی اکرم نے امت کو تعلیم دین اس فریضہ کی ادائیگی کے طور پر فرمائی جس کے لئے آپ مبعوث کئے گئے تھے اور اس حکم کی تعمیل فرمائی جو آپ کو آپ کے رب نے ان الفاظ میں دیا تھا۔

"یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک، وان لم تفعل فما بلغت رسالته" (المائدۃ: ۶۷)

صحابہ کے بعد کے لوگوں نے تعلیم دین ان لوگوں سے پائی جو "ورثہ رسول" اور حاملین دین متین قرار پائے امت کے اس گروہ نے تبلیغ دین کا فریضہ اس حکم ربانی کے پیش نظر انجام دیا: "لتبیننه للناس ولا تکتمونه" (آل عمران: ۱۸۷) نیز ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولٰئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللٰعنون (البقرۃ: ۱۵۹)

چونکہ ان اہل علم کے نزدیک (حسب حکم الٰہی) کتمان دین موجب لعنت تھا اس لئے انہوں نے تبلیغ دین میں کوئی کسر نہیں رہنے دی۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے دیگر اوصاف کے علاوہ سابقون الاولون کے ان سوالات کو بھی محفوظ رکھا ہے جو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم دین کے سلسلہ میں کیا کرتے تھے۔ ان سوالات کی حفاظت اس لئے بھی ممکن ہوئی کہ یہ نزول وحی کا زمانہ تھا اور احکام شرعیہ کے بارے میں استفسارات یا بیان شدہ احکامات کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں سوالات کے جوابات بذریعہ وحی دیئے جاتے تھے۔ اکثر وبیشتر اس قسم کے استفسارات کے لئے جو صیغہ قرآن نے استعمال کیا ہے وہ "سوال" کا ہے اور بسا اوقات لفظ "استفسار" استعمال ہوا ہے جس کے معنی "طلب فتویٰ" ہیں۔ اس قسم کے بعض سوالات سورۃ بقرہ میں ہیں جن کی تعداد سات ہے (۱) ایک سوال سورۃ مائدہ ایک سورۃ انفال اور دو سورۃ النساء میں ہیں۔ (۲، ۳، ۴) مثلاً

ویسألونک عن المحیض قل ھو اذی ۔۔۔۔ الخ

ویستفتونک فی النساء قل اللہ یفتیکم فیھن ۔۔۔۔ الخ

یہ تو سوالات و استفسارات کی وہ قسم ہے جو اہل ایمان کی طرف سے کئے گئے یا تعلیم واخذ دین کی خاطر تھے اور جن کے پیچھے جذبہ مثبتہ (Positive Thinking) کارفرما تھا۔ جبکہ استفسارات کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق اعداء اسلام سے ہے ایسے استفسارات ہمارا موضوع بحث نہیں کیونکہ ان کا مقصد حقائق دین جاننا ہرگز نہ تھا بلکہ غرض دین میں جدال و فساد اور خواہ مخواہ کی بحث و تکرار پیدا کرنا تھا تاکہ لوگوں بالخصوص نومسلموں کے ذہن کو پراگندہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کیا جا سکے۔ ایسے استفسارات کی مثال :

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (۵) ہے۔
جہاں قرآن کریم نے دینی نوعیت کے ایسے استفسارات جو صیغہ سوال سے شروع ہوتے ہیں انہیں محفوظ کیا وہیں سنت رسولؐ نے ایسے متعدد استفسارات کی حفاظت کا بندوبست کر دیا جن میں صیغہ استفتار یا افتار کا استعمال زبان رسالت یا کلام صحابہ و تابعین سے ثابت ہے۔ اس قسم کے استفسارات کے کتب صحاح وسنن مسانید کا ذخیرہ مملو ہے۔ چنانچہ اسی نہج پر چلتے ہوئے سلف صالحین کی اتباع میں مسلمانوں کے ہاں استفتار و افتار کی سنت جاری ہوئی اور اس کے لئے لفظ فتویٰ کا استعمال عام ہوا۔ اب ہر دینی معاملہ و شرعی استفسار استفتار یا فتویٰ کہلاتا ہے۔

لفظ فتویٰ کا اشتقاق اور فقہاء کے ہاں اسکے اصطلاحی معنی

لغت کی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ "الفتویٰ" اشتقاقی لحاظ سے لفظ "الفتار" سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور الفتار کے معنی نو عمری کے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے فتو، یفتو، فتاء، وفتی، یفتی، فتی، فہو فتی السن یعنی نو عمر۔
علامہ ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں اور ان کی متابعت میں ابو حیان نے اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ (ویستفتونک فی النساء) کے (۶) ضمن میں لکھا ہے "الفتیا تبیین المشکل من الاحکام" یعنی فتیا کے معنی احکام میں مشکل امور کی وضاحت، اور اسکی اصل "الفتی" ہے جس کے معنی ایسا نوجوان جو پروان چڑھ رہا ہو اور توانا ہو گویا مفتی وہ ہے جو ایسے امور کی وضاحت کرکے انہیں جاندار بنا دے جن کا سمجھنا ویسے دشوار ہو۔
امام رازی نے (افتونی فی امری) کے معنی میں لکھا ہے ای افتونی، اجیبونی فی الامر الفتی۔ یعنی اس مشکل امر میں مجھے مشورہ دو، جواب دو۔ اور فتویٰ کے معنی کسی مسئلہ

میں نیا جواب ہیں ۔ گویا یہ لفظ " حدیث السن " یا نو عمری کے لئے استعمال ہونے والے صیغہ فتی سے استعارہ لیا گیا ہے ۔ (۷) شافیہ کا کہنا ہے کہ فتوی کے معنی کسی نئے پیش آمدہ مسئلہ کا نیا جواب ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ پیش آمدہ مسئلہ یا تو فی نفسہ بالکل نیا ہوگا یا پھر اس سے ملتے جلتے مخصوص مسائل کے اعتبار سے وہ نیا ہوگا ۔ (۸)

اصطلاح فقہاء میں فتویٰ کے معنی کسی شرعی مسئلہ میں مستفتی کو اس پر عمل کا پابند کئے بغیر حکم شرعی کو بیان کر دینا ہے اور استفتاء کا جواب مفتی کی جانب سے زبانی ہوگا الا یہ کہ سائل تحریری سوال کرے اور اس کا تحریری جواب چاہے ۔

چونکہ دینی امور میں فتوی دینے کی ذمہ داری انتہائی اہم ہے اور مسلمانوں کی زندگی پر فتوی کے مثبت یا منفی اثرات بھی یقینی ہیں ۔ اس لئے مختلف مذاہب فقہ کے علماء نے فتویٰ نویسی یا " افتاء " کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اس کے لئے باقاعدہ قواعد وضوابط مقرر کئے ہیں جن کا لحاظ رکھنا اور ان سے غفلت نہ برتنا مفتی کے لئے انتہائی ضروری ہے تاکہ اس شعبہ کو بازیچہ اطفال نہ بنا لیا جائے ۔ ایسے لوگ جو اس منصب کے اہل نہ ہوں انہیں اس منصب کے وقار کی پامالی کا باعث نہ بننا چاہیئے اور اہل ہوا و ہوس کو اسے اپنی خواہشات کا تختہ مشق نہ بنانا چاہیئے تاکہ " افتاء " مذاق بن کر نہ رہ جائے ۔

اس کا صحیح علاج ابو القاسم الصمیری محمد بن اسحاق نے (م ۲۷۵ھ) ابوبکر خطیب بغدادی نے، ابو عمرو عثمان بن اصلاح نے، امام نووی نے شہاب الدین احمد بن ادریس القرافی نے، شمس الدین ... ابن قیم جوزیہ نے اور برہان الدین ابن فرحون نے تجویز کیا ہے اسی طرح گیارہویں صدی ہجری کے بعض مشائخ ۔ جیسے ابراہیم اللقانی، منصور بن یونس البہوتی اور تیرہویں صدی کے بعض علماء جیسے محمد بن علی السنوسی نے اس کا حل تجویز کیا ہے ۔ اسی طرح مختصر خلیل کے بعض شارحین

جیسے الخطاب اور تحفہ ابن عاصم کے بعض شارحین جیسے التسولی وغیرہ نے بھی اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ فتوی کے غلط استعمال و اصدار کے نتائج بہر حال خطرناک ہو سکتے ہیں۔ لہذا اس منصب پر ایسے ہی شخص کو فائز ہونا چاہیئے جس کی علمی ثقاہت، فکری نزاہت نیز دین سے پختہ تعلق مسلم ہو۔

کارِ افتار کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے؟

امام مالک کہتے ہیں کسی عالم کو اس وقت تک فتویٰ دینے کا اختیار نہیں جب تک لوگ (اہل علم) اسے اس لائق قرار نہ دیں۔ یعنی اس کی اہلیت پر علمار صاد کریں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہو (۹) امام دارالہجرۃ امام مالک خود اپنے بارے میں کہتے ہیں میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک ستر (۷۰) جید علمار نے اس بات کی توثیق نہیں کی کہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ (۱۰)

المازری کہتے ہیں: "قاضی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی کو مفتی مقرر کرے بلکہ فقہار ہی کسی کو یہ منصب سونپ سکتے ہیں۔ (۱۱)

خطیب بغدادی کہتے ہیں امام (حاکم) کو چاہیئے کہ وہ مفتیوں کے ذاتی کردار کی اور علمی حیثیت کی چھان بین کرے پھر جسے اس قابل پائے اس کا تقرر کرے اور جس میں یہ صلاحیت نہ پائے اسے معزول کردے بلکہ اس کو ڈرا بھی دے کہ بلا اہلیت وہ اس منصب تک دوبارہ پہنچا تو اسے سزا دی جائے گی رہا مسئلہ یہ کہ امام (حاکم) کس طرح صحیح مفتی کا انتخاب کرے تو اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ ہم عصر علمار سے دریافت کرے اور ان میں سے ثقہ علمار کی رائے کو اختیار کرے۔" (۱۲)

ابوالفرج ابن جوزی کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو فتویٰ دینے کے اہل نہ ہوں مگر

مفتی بن بیٹھیں ان کے ساتھ وہی کرنا چاہیئے جو بنوامیہ نے کیا کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خود تو راستہ معلوم نہیں مگر سواروں کو راستہ و منزل بتلاتے ہیں یا ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جنہیں طب کی ابجد تک معلوم نہیں مگر معالج بنے بیٹھے ہیں۔ بلکہ خود ساختہ مفتی توان تمام قسم کے لوگوں سے بدتر ہے اور جب ایک ایسے شخص کو علاج کرنے کی حکومت اجازت نہیں دیتی جو ماہر طبیب نہ ہو بلکہ صرف عطائی ہو تو پھر کسی ایسے شخص کو "افتار" کی اجازت دینا جو کتاب وسنت کا عالم اور فقیہ نہ ہو سراسر ظلم و زیادتی ہے۔

اس موقف کی تائید اس حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں کہ۔ اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں اٹھائے گا کہ علم ہی اچک لیا جائے بلکہ علم اس طرح اٹھایا جائے گا کہ کوئی عالم نہ رہے گا اور لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنانے لگیں گے جو بغیر علم کے لوگوں کے استفسارات پر فتویٰ جاری کرنے لگیں گے چنانچہ یہ جو خود گمراہ ہیں اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ افتار میں حقیقتاً سرداری ہے اور اس حدیث سے انہوں نے جاہل مفتیوں کی مذمت پر استدلال کیا ہے بعض مشائخ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جاہل قسم کے مفتیوں پر سخت برہم ہوتے یہاں تک کہ کسی نے ابن قیم سے ازراہ تمسخر کہہ دیا کہ آپ مفتیوں کے محتسب ہیں؟ اس پر انہوں نے کہا، کیوں نہیں؟ اگر روٹی پکانے والوں اور باورچیوں پر محتسب مقرر ہو سکتا ہے تو مفتیوں پر محتسب کیوں نہیں ہو سکتا (۱۳)

تحفہ ابن عاصم کے شارح شیخ التسولی کے زمانہ (۱۲۴۳ھ) میں "المغرب" میں احتیاطی تدابیر کے طور پر امام (حاکم) کو مفتیوں کی نگرانی و سرزنش کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ نظام قضار پر جاہل مفتیوں کے فتاویٰ کے منفی اثرات کے

پیش نظر افتار عام پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ التسولی نے اس پابندی پر تنقید کی اور کہا کہ افتار قضار کی طرح فرض کفایہ ہے (۱۴) (جاری)

الحواشی

(۱) آیات ۱۸۹-۲۱۵-۲۱۷- ۲۱۹-۲۲۰-۲۲۲-سورۃ البقرہ

(۲) المائدہ : آیت : ۴

(۳) سورۃ الانفال : آیت : ۱

(۴) سورۃ النسار آیت نمبر ۱۲۷-۱۷۶

(۵) ابن العربی، احکام القرآن جلد ۱ صہ ۵۰۳

(۶) ابوحیان۔ تفسیر ابی حیان جلد ۲ صہ ۳۵۹

(۷) فخرالدین رازی، تفسیر کبیر۔ جلد ۶ صہ ۳۰۸

(۸) ابراہیم اللقانی۔ اصول الفتوی صہ ۴۳-۴۴۔ (غیر مطبوعہ)

(۹) القرافی۔ الفروق۔ جلد ۲۔ صہ ۱۱۰

(۱۰) النووی، المجموع جلد ۱۔ صہ ۴۱

(۱۱) التسولی۔ جلد ۱ صہ ۴۵

(۱۲) ادب الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۵۲

(۱۳) ابن قیم۔ اعلام الموقعین۔ج ۴۔ص ۱۸۹

(۱۴) التسولی علی التحفہ، ج ۱ ص ۴۵

❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋❋

امام بخش صہبائی اور انکی فارسی شاعری

محمد ذاکر حسین ندوی

ہندوستان کی چند ممتاز ترین اور مایہ ناز فارسی شناسوں میں امام بخش صہبائی کا شمار ہوتا ہے۔ یہ برصغیر ہند و پاک کی عظیم ہستیاں ہیں، جن کا اعتراف خود اہل زبان نے بھی کیا ہے۔ ہماری مراد امیر خسرو، عبدالقادر بیدل، امام بخش صہبائی، مرزا اسداللہ خاں غالب اور علامہ اقبال جیسے نابغۂ روزگار اور یگانۂ دہر سے ہے۔ جنھوں نے اپنی فطری قابلیت اور خداداد صلاحیت سے فارسی ادبیات کو ایک نئی سمت سے روشناس کرایا اور اس کے اندر ایک نئی روح پھونکی۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے لکھا ہے کہ:

"ہندوستان کی فارسی شاعری کی عمارت چار عظیم ستونوں پر قائم ہے۔ یہ ہیں خسرو، بیدل، غالب اور اقبال"

اس میں ایک ستون (صہبائی) کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ اضافہ مناسب ہوگا۔ کیونکہ فارسی ادبیات پر فاضلانہ قدرت اور ماہرانہ قابلیت کا ثبوت جہاں صہبائی کی نثر نگاری، انشاء پردازی، مکتوب نگاری، شرح نویسی اور تنقید نگاری ہے وہیں ان کی شعر گوئی ہے اور انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ جس طرح نثر نگاری، انشاء پردازی، شرح نویسی اور تنقید نگاری کے بے تاج بادشاہ ہیں، اسی شاعری بھی ان کے آنگن کی خادمہ ہے۔ چنانچہ وہ کہتے

میں بالکل حق بجانب ہیں ؎

بہ بین درشعر من وزچشم انصاف تماشا کن ؛ کہ بکیک بیت من باشد براجلد دیوان را
من ارچہ از ہندم اما گر بہ بینی طرز شعرم را ؛ بزرگ از خاک ہندوستان بگیری خاک ایران را[۲]

اسی طرح ایک دوسرے شعر میں شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو قرینہ افتخار خاقانی کی وجہ سے "شروان" کو ہاتھ آیا تھا، وہی گوہر اب "دہلی" کو میرے دم سے حاصل ہوا ہے ؎

زر دی نسبتم دہلی بہ بخت خویش می نازد
بدان نازی کہ از پیوند خاقانی ست شروان را[۳]

پھر آگے چل کر سلمان ساوجی اور حسن دہلوی کے مقابلہ میں اپنی برتری کا دعوی کیا ہے؎

بود گو فارسی اما تو ہم بنگر کہ در معنی ؛ نباشد نسبتی با اہل ہیتم شعر سلمان را
حسن از دہلی و من ہم ز دہلی لیکن ایں بنگر ؛ کہ قطرہ ہم نم وہم در بود یک ابر نیسان را[۴]

لیکن سچی بات یہ ہے کہ صہبائی کی شاعری میں کوئی چونکا دینے والی بات نظر نہیں آتی ہے اور نہ وہ خصوصیت پائی جاتی ہے جس سے شاعری آفاقیت اور ہمہ گیریت سے ہمکنار ہوتی ہے اور یہ اصلیت بھی اپنی جگہ برقرار ہے کہ انہوں نے جدت سے زیادہ روایت اور اجتہاد سے زیادہ تقلید کو اختیار کیا ہے اور نئی راہ نکالنے کے بجائے مروجہ روش شاعری ہی کو اپنا مخصوص رنگ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی نظروں کے سامنے رہے کہ جس دور میں صہبائی نے اپنی علمی وادبی آنکھیں اس دور میں غالب، صہبائی اور مومن کے علاوہ کوئی چوتھا شخص ان جیسی استادانہ اور عالمانہ مہارت اور صلاحیت کا مالک نہ تھا۔ باعتبار مجموعی نہ سہی لیکن بعض معاملوں میں انہوں نے انفرادیت دکھائی ہے اور یہی اہم بات ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ شاعری صہبائی کے لئے نہ تو لازمہ حیات تھی اور نہ فخر و مباہات کا ذریعہ بلکہ وہ تفنن طبع اور مشاعرہ میں شرکت کی خاطر طرحی اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔

امام بخش صہبائی ایام طفولت ہی سے فکر سخن کرنے لگے تھے اور جب حضرت علوی کے زیر تربیت آئے تو ان کی اسر، صلاحیت میں اور جلا اور نکھار پیدا ہوئی۔ اکثر حضرات نے انکی شاعری کی تعریف کیا ہے۔ اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی لکھتے ہیں :۔

"حضرت علوی کی شعر و شاعری کا اثر صہبائی پر پڑے بغیر نہ رہا۔ یہ کم عمری سے فارسی میں فکر سخن کرنے لگے تھے۔ فارسی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس میں ہی شعر گوئی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ باکمال استاد نے وہ گر سکھائے کہ نوعمری میں مرزا قتیل فرید آبادی کے ہم پایا استاد سمجھے جانے لگے اور ہم چشموں میں عزت و قدر سے دیکھے جاتے تھے" [5]

غالب جیسے بت شکن اور بت گر نے بھی ان کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں اپنے معاصرین سے متعلق جو اچھی رائے دی ہے۔ ان میں صہبائی بھی ایک ہیں ؎

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود :: باد در خلوت شنان مشک فشانی ز دم شان

مومن و نیر و صہبائی و علوی انگاہ :: حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان [6]

اسی طرح کی تعریف غالب کے مکتوبات میں بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے ایک مکتوب میں مصطفیٰ خاں شیفتہ کو ایک مشاعرہ کی روداد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعر دلنشیں تھے" [7]

کسی غزل کے دو تین اشعار ہی جاندار اور پُر لطف ہوتے ہیں اور غالب کا صہبائی کے دو تین اشعار کا دل نشیں کہنا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاعری پر صہبائی کو عالمانہ اور ماہرانہ قدرت تھی۔ لیکن ان کو شعر و شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا بلکہ ضرورت کے تحت ہی اس صنف کا سہارا لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار تعداد میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ کلیات میں جو دیوان شامل ہے صرف ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ردیف وار ۱۶ غزلیں، ۶ قصائد ۴ فردیات، ۲۱ رباعیات اور ایک مخمس شوکت بخاری کی غزل پر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے اشعار ان کی دوسری تصنیفات اور ان کے معاصروں اور شاگردوں کی تالیفات میں بکھرے پڑے ہیں۔ مثلاً محمد حسین خان تحسین کے مرتب کردہ کتاب خمسہ ھای غزل قدسی جو ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس میں بھی صہبائی کا کہا ہوا خمسہ شامل ہے۔

ہر زبان کا ادب زمانے اور ماحول پروردہ ہوتا ہے اور ہر ملکے و ہر رسمے" کے پیش نظر ہر علاقہ کے کچھ خاص حالات، خاص خیالات اور مخصوص نظریات ہوتے ہیں۔ چنانچہ " مغلوں کی سرپرستی میں جو سرمایۂ نثر و نظم وجود میں آیا۔ اس کا اسلوب و انداز ایرانی اسلوب و انداز سے قدرے مختلف تھا اور یہ نہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ شرم کی۔ کیونکہ ہر ملکے و ہر رسمے کے پیش نظر یہاں کے حالات، خیالات اور نظریات کچھ اور تھے۔ اس کے علاوہ صدیوں کی خدمت زبان کے استحقاق کی بناپر اگر ہندی ادیبوں نے اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی تو کیا غضب ہوا" ؎

اسی "الگ راہ" کو "سبک ہندی" کا نام دیا گیا۔ اور اس کو بلندی تک پہنچانے

والے ظہوری اور بیدل ہیں اور" جس شیوہ کی ان حضرات نے تکمیل کی، اس کا بانی فغانی ہے اور اس شیوہ کی خصوصیت میں خیالہائے نازک اور معانی بلند جس سے قالب شعر میں جان پڑتی ہے"۔ ۹

صہبائی کے دور میں عام طور پر بیدل کا طرز اختیار کرنا شاعری کی معراج تصور کی جاتی تھی اور ان کی روش فکر وفن کو اپنانا باعث افتخار وعظمت تھا۔ غالب جیسے بت شکن اپنے آپ کو اس اثر سے نہ بچا سکے اور کہنے پر مجبور ہوگئے ؎

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

اور جب ان سے طرز بیدل نہ نبھ سکا تو یہ کہنے پر مجبور ہوئے ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

انھوں نے اگرچہ بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔۔ مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی ۱۰ اس کے برعکس صہبائی نے طرز بیدل ہی کو اختیار کیا اور اپنی تمام علمی وادبی صلاحیتیں ان کی پیروی میں صرف کیں اور یہ کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے کیونکہ اس وقت بیدل کی طرز اور ان کے فکر کا نفوذ پورے ماحول پر چھایا ہوا تھا۔

اس تمہید سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صہبائی کی شعری شخصیت کی تعمیر اور تشکیل میں طرز بیدل کا عمل دخل رچا بسا ہوا ہے۔ گرچہ ان کے اشعار میں طرز بیدل کے اثرات واضح اور صریح طور پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ساتھ صہبائی کی انفرادیت بھی برقرار نظر آتی ہے۔

کلیات صہبائی کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ صہبائی نے غزل، قصیدہ رباعی، فرد، مثنوی، مخمس اور قطعہ جیسے اصناف پر طبع آزمائی ہے۔ لیکن انکے بیشتر اشعار غزل کے ہیں اور انہوں نے اس صنف کو پورے اہتمام کے ساتھ اپنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست و روانی، مضمون کی عمدگی، زبان کی خوبی اور بندش کی چستی، سوز و گداز و نشتریت، شوخی و ظرافت، حکمت و معرفت عقل و عشق کی کشمکش، مسئلہ جبر و اختیار، تجاہل عارفانہ، معاملہ بندی، تمثیل و محاورہ واردات محبت، دشنام محبوب کی شیرینی، واعظ کی نصیحت کی تلخی، محبوب کی ستم شعاری کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ چند مثالوں سے یہ واضح ہو جائے گا

یارب آں کن بجنون دل دیوانۂ ما　　کہ شود بال پری نالۂ مستانہ ما [11]

جلوہ برخود غلط نظر باز غیور　　شمع داغ ست زخود داری پروانہ ما [12]

شکوۂ تلخی دشنام تو می کرد شبی　　دل ندانستہ مگر قدر شکر خائی تو [13]

تم کہ چو از من بمرگ راضی نیست　　بزندگانی دشمن چگونہ خرسند ست [14]

چونکہ صہبائی کا علم بہت گہرا اور عمیق تھا اور تاریخ و ادب پر گہری نظر تھی اس لئے ان کے اشعار میں تلمیحات و اشارات بھی کافی استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

صہبائی نے اساتذہ کی زمین میں بھی اشعار کہے ہیں۔ اگرچہ مجموعی اعتبار سے

انکی شاعری کیف و اثر سے خالی ہے۔ لیکن بعض مقام پر ان کی انفرادیت بھی برقرار نظر آتی ہے۔ وہ اساتذہ سے کوئی مضمون اخذ کرتے ہیں تو انداز بیان کے ساتھ مضمون کو بھی ترقی دیتے ہیں اور جہاں بھی ان کا یہ انداز باقی رہا ہے وہ شعر کافی بلند ہو گیا ہے۔ البتہ صنعتوں کے بھرپور التزام سے ان کے کلام میں سادگی کی بجائے پرکاری زیادہ ہے جس سے اثر خاصا کم ہو گیا ہے۔ بقول ضیاء احمد بدایونی۔

" غزل میں عموماً تصنع، آورد، دوراز کار خیالات ملتے ہیں، جن کو پڑھ کر جذبات میں انتعاش یا فکر میں جلا نہیں ہوتی۔ صرف ویسی خوشی ہوتی ہے جیسے کسی ریاضی کے سوال کے حل کرنے کے بعد۔ ان کی عشقیہ شاعری اثر سے خالی ہے"

ضیاء احمد بدایونی کا خیال بہت حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ البتہ جہاں بھی انہوں نے فن کا پورا پورا التزام کیا ہے اور جدت ادا سے اپنی بات کو سجایا ہے اور اپنی انفرادیت برقرار رکھا ہے ان کی شاعری کا لہجہ بلند و برتر ہو گیا ہے۔

صہبائی نے اپنے مختلف کرم فرماؤں کی شان میں قصیدے بھی کہے ہیں چنانچہ دیوان میں ۶، قصائد بھی ملتے ہیں۔ جو سر سید، آزردہ، بہادر شاہ ظفر اور مسٹر طامسن کی مدح میں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قصیدہ مرزا فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کی شان میں ہے، جو کلیات کے صفحہ ۶۲۸ پر ملتا ہے۔

ان قصائد سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کافی مبالغہ اور تصنع ہے۔ شوکت الفاظ کے ساتھ معنی آفرینی بھی ہے۔ ان سات قصیدوں میں وہ قصیدے زور دار ہیں، جو سر سید اور آزردہ کی تعریف میں ہیں۔ بقیہ قصائد میں صرف رسم کی تکمیل کی گئی ہے۔

صہبائی کو سرسید سے گہری عقیدت تھی اور قلبی لگاؤ تھا۔ چنانچہ انہوں نے سرسید کو نہایت عقیدت اور بے پناہ محبت سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے جہاں بھی اس طرح کا خیال ادا کیا ہے۔ اس میں شعریت کا عنصر غالب ہے اور اظہار عشق میں تخیل کی لطافت اور معنی آفرینی کی نزاکت پائی جاتی ہے خاص طور سے یہ شعر ؎

دریں وحشت اگر جاں می دہم خاکم بجاں آرد
برنگ گردباد از ہرزہ گردی ہا بیابان را

اس شعر میں بیدل کا رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے۔

دیوان میں ۱۲ رباعیات ہیں، جن میں بادشاہ کی تعریف، زمانے کی شکایت بسنت، ہولی، راکھی کا ذکر اور عید کی خوشی و شراب نوشی کی تلقین کے مضامین ہیں۔ ان رباعیات میں کوئی خاص وصف نہیں ہے۔ سب بھرتی کے اشعار ہیں۔

اس کے علاوہ دیوان میں ایک مخمس بھی ملتا ہے جس میں کل ۶ بند ہیں اور یہ شوکت بخاری کی غزل پر ہے ایک اور خمسہ کلیات صہبائی جلد ۲ حصہ دوم میں درج ہے۔ اس میں کل نو بند ہیں۔ صہبائی کا یہ خمسہ محمد جان قدسی کی نعت کی تضمین ہے

دیوان میں کوئی مثنوی شامل نہیں ہے اور نہ کوئی الگ سے دستیاب ہے البتہ تقریظوں اور رسالوں کے آغاز اور اختتام میں ان کی مثنویاں پائی جاتی ہیں۔ "ریزۂ جواہر" میں جو مثنوی شامل ہے۔ وہ متن کا جزو ہے۔ اس میں مثنوی کے ۱۵۲ اشعار ہیں۔ ایک اور مثنوی "رسالہ گنجینہ رموز" میں درج ہے، جس میں ۳۸ اشعار ہیں۔ ان مثنویوں میں مختلف مضامین کو ادا کیا گیا ہے۔ وہ مضامین ہیں: حمد، نعت، مناجات، مدح، ساقی نامہ، تعلی اور سبب تالیف وغیرہ

صہبائی کی ان مثنویوں میں انداز بیان کی برجستگی تسلسل کے ساتھ برقرار ہے بندشیں چست، تراکیب مانوس اور معنی خیز ہیں۔ رعایت لفظی و معنوی کے مناسب استعمال سے کلام کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ "مثنوی، دمع الباکل" کے نام سے تذکرہ میں ایک مثنوی کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن اب وہ ناپید ہے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سے قبل یہ افواہ اڑی تھی کہ بہادر شاہ ظفر شیعہ ہو گئے ہیں۔ اس کی تصدیق و تردید میں بہت ساری مثنویاں لکھی گئیں انہیں میں صہبائی کی مثنوی ہے، جو میر دوست علی خلیل کے جواب میں ہے۔ "حکایت فاضل" میں مفتی سید محمد عباس شوستری نے صہبائی کا جواب ہے۔ چنانچہ اس میں صہبائی کے اشعار ملتے ہیں۔

صہبائی کی فارسی شاعری نہ تو بالکل پست ہے اور نہ بلند البتہ دونوں طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ جہاں بھی انہوں نے فن کا پورا پورا التزام کیا ہے، جدت ادا اور ندرت اسلوب کو اپنایا ہے اور سلاست و روانی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہاں ان کی شاعری کا لہجہ بلند ہو گیا ہے اور جہاں کمی واقع ہو گئی ہے، وہاں پست ہو گیا ہے۔

حواشی

۱؎ نورالحسن انصاری	:	فارسی ادب بعہد اورنگ زیب	ص ۲۳
۲؎ امام بخش صہبائی	:	دیوان صہبائی	ص ۴۷
۳؎ "	:	"	ص ۴۶
۴؎ "	:	"	ص ۴۶

۵ مفتی انتظام اللہ شہابی : غدر کے چند علماء ص ۲۰۶

۶ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم : شرح غزلیات غالب

۷ غلام رسول مہر : غالب ص ۳۹۸

۸ ضیاء احمد بدایونی : مسالک و منازل ص ۳۳۳

۹ غالب : عود ہندی ص ۱۲۵

۱۰ خواجہ الطاف حسین حالی : یادگار غالب ص ۲۳۴

۱۱ امام بخش صہبائی : دیوان صہبائی ص ۲

۱۲ " : " ص ۲

۱۳ " : " ص ۴۰

۱۴ " : " ص ۱۷

۱۵ ضیاء احمد بدایونی : مسالک و منازل ص ۲۵۹

حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندرؒ

ڈاکٹر عمر کمال الدین، ۱۲ چودھری محلہ جنوبی کاکوری، لکھنؤ

ولادت:- آپ کی ولادت ۱۷ رجب المرجب ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء کو کاکوری میں ہوئی[1] آپ حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندرؒ کے چھوٹے صاحبزادے تھے اور برادر اکبر حضرت مولانا شاہ حیدر علی قلندرؒ سے تقریباً آٹھ برس چھوٹے تھے۔

تعلیم وتربیت:- ابتدائی تعلیم عم محترم حضرت مولانا شاہ حمایت علی قلندرؒ سے، مختصرات برادر اکبر شاہ حیدر علی قلندرؒ سے اور متوسطات و اواخر میں مولانا محمد مستعان کاکوروی (م ۱۲۳۷ھ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور تمام کتب و "دلائل الخیرات" کی اجازت بھی ان سے حاصل کی[2]، صحاح ستہ اور اسانید معتبرہ کی تکمیل حاجی امین الدین محدث کاکوروی (م ۲۲ محرم الحرام ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) سے کی اور اجازت سے سرفراز ہوئے[3]۔ صرف کتاب "صدرا شرح ہدایت الحکمت" ملا محمد عظیم اصفہانی سے پڑھی جو اس زمانے میں شیخ محمد حیات کے مکان پر عرصہ تک مقیم رہے تھے[4]

مولانا محمد مستعان کے یہاں درس کا طریقہ یہ تھا کہ سبق کا کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا سوائے اس صورت میں کہ طالب علم کے یہاں کوئی مرجاوے یا خود ان کے یہاں کوئی حادثہ پیش آجاوے شاہ علی حیدر قلندرؒ کی روایت کے مطابق ان کا سبق کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ وہ دیگر

---

[1] حوض الکوثر ص ۱۰۹، مواہب القلندر ص ۱۲، اذکار الابرار ص ۲۴۳، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۸۸، تذکرہ گلشن کرم ص ۶۸

[2] مولانا محمد مستعانؒ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو "چشمہ فیض قلمی" تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۴۳-۴۲ مواہب القلندر ص ۱۱

[3] حاجی امین الدین محدثؒ کاکوروی کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو "چشمہ فیض قلمی" تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۵۶-۵۵ مواہب القلندر ص ۱۱

[4] بروایت اذکار الابرار ص ۲۴۳ نیز مواہب القلندر ص ۱۱-۱۰

شاگردوں کے مقابلہ میں ان کی ذہانت و مطانت اور فہم دلیاقت کی وجہ سے ان پر بہت مشفق و مہربان تھے اور بجائے نقی کے تقا کہہ کر پکارتے تھے"۔ لہ

حلیہ:- آپ کے شاگرد رشید و نبیرہ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر آپ کے حلیہ کے متعلق مستطیر ہیں۔

"آں حضرت علیہ الرحمۃ ملیح ابیض و بودند قوی الجثہ بلند و بالا بزرگ چشم و سیاہ ترین مردمک وکشادہ پیشانی مقرون حاجبین احسن وجہ و بزرگ سر کہ دلیل است بر درد فور عقل و جودت فکر بہ جہت قوت دماغ وکثرت آں کہ حاصل جوہر عقل است و عریض الصدر و عریض اللحیہ صاحب آواز بلند وجہور و بودند فصیح اللسان و بدیع البیان و غرائب حکم آں قدر محاسب فکر و اندیشہ گرد حصرا و حصائی او نہ تواند گشت" ۲ہ

نکاح و اولاد و احفاد:- آپ کا نکاح شاہ بہرام علی قلندر ر داماد اکبر شاہ محمد کاظم قلندر رح کی بیٹی سے ہوا جن سے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ بڑی بیٹی ناکتخدا انتقال کر گئیں۔ چھوٹی بیٹی کا نکاح حافظ ذاکر علی سے ہوا۳ہ

بیٹوں میں بڑے صاحبزادے مولوی عابد علی تقریباً ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علوم والد محترم سے کی اور جد محترم مولانا شاہ تراب علی قلندر رح کے مرید ہوئے۔ ۴ر صفر ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء بروز یکشنبہ انتقال ہوا ۴ہ

منجھلے صاحبزادے شاہ واجد علی قلندر رح تقریباً ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ تکمیل درس والد محترم سے کی اور سلسلہ درس و تدریس بھی عرصہ تک جاری رکھا۔ مولانا شاہ تراب علی قلندر رح کے مرید تھے۔ اذکار و اشغال کی تعلیم عم محترم شاہ حیدر علی قلندر رح اور والد محترم

لہ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص۲۷۱　　۲ہ حوض الکوثر ص۲۰۸

۳ہ نفحات النسیم ص۱۱۸

۴ہ ایضاً

سے تھی، اجازت وخلافت شاہ علی اکبر قلندرؒ کاکوروی، مولوی شاہ رکن الدین قلندرؒ لاہر پوری وشاہ علی اکبر قلندرؒ باسطی سے تھی۔ آپ کے خلفاء بھی ہوئے، آپ کا انتقال بہ عارضۂ تپ دسرسام ۴ جمادی الاول ۱۳۱۲ھ بروز سہ شنبہ ہوا۔[1]

شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے مولانا حامد علی تقریباً ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے، کتب درسیہ والد محترم سے پڑھیں اور فراغت کے بعد درس وتدریس کا مشغلہ بھی رکھا۔ شاہ تراب علی قلندرؒ کے مرید تھے اور ان کی خدمت میں بہت مقبول تھے۔ ۳۴ برس کے سن میں پنجشنبہ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۶ء کو بہ عارضہ تپ دسرسام انتقال ہوا۔[2]

بیعت اجازت وخلافت:- آپ سلسلہ قادریہ میں ۴ شعبان المعظم ۱۲۲۶ھ بروز جمعہ شاہ تراب علی قلندرؒ کے مرید ہوئے[3] اور سلاسلِ ثمانیہ نیز اوراد واشغال کی تعلیم شاہ انشاء اللہ قلندر (خلیفہ شاہ محمد کاظم قلندرؒ) سے حاصل کی اور والد محترم کے چہلم کے دن برادر محترم مولانا شاہ حیدر علی قلندرؒ سے تجدید بیعت کی۔[4]

درس وتدریس:- تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد والد محترم کے حسب ارشاد واجازت آپ نے عم محترم مولانا شاہ حمایت علی قلندرؒ (م ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء) کی مسندِ تدریس کو زینت بخشی اور تقریباً ساٹھ برس تک مجلسِ علم وفضل گرم رکھی۔ آپ کے درس کی شان نرالی تھی، علاقتِ لسانی کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدقیق کا بھی غایت درجہ اہتمام تھا، پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی اس طرح فرماتے کہ سامع کے منہ سے بے اختیار واہ وا! نکل جاتا، کثرتِ مطالعہ، تبحر علمی اور وسعت نظر نے اسے اور جلا بخشی۔ شاہ تراب علی قلندرؒ "کشف المتواری" میں تحریر کرتے ہیں

"ہر دو فرزندانِ فقیر بہ عنایتِ الٰہی صاحب علم وصلاحیت اند شب وروز در تعلیم وتدریس اوقات می گزارند واز باعث ایشاں در کاکوری

---

[1] نفحات النسیم ص ۱۱۸ نیز اذکار الابرار ص ۴۶۵ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۴۶۹-۴۷۰ [2] مشاہیر کاکوری ص ۱۰۸-۱۰۹

[3] نفحات النسیم ص ۱۱۸ [4] مشاہیر کاکوری ص ۸۹ واذکار الابرار ص ۴۶۵

تذکرۂ علم عربی است کہ طالب علماں آمدہ سبق می گیرند از صبح تا شام ہنگامہ درس گرم می باشد۔“ [1]

آپ کے طریقۂ درس کے بارے میں آپ کے تلمیذ رشید مولانا امجد علی بلیغ یوں مرقوم ہیں۔

”شانے خاص بوقت درس وافہام مطالب غامضہ در ذات مجمع الصفات ایشاں دیدم از علمائے دیگر نیافتم۔“ [3]

دوسری جگہ فرماتے ہیں ”میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں اکثر علماء کے درس میں حاضر ہوا مگر کسی کے یہاں یہ تحقیق وتدقیق اور طرز درس نہیں پایا جیسا کہ اپنے حضرت استاد کے یہاں پایا۔“ [4]

آپ کے شاگرد خاص وجانشین حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندرؒ کے مطابق

”..... وتکلم می فرمودند بکلام مبین ومفصل ودر مقام احتیاط ومحلِ ایہام واشتباہ ادائے کلمات بہ ادائے می نمودند کہ سامع را دقتے در فہم نمی ماند ...... بلیغ البیان بحدیکہ اکثر بریک سخن جلسۂ طویلہ بہ اختتام می رسانیدند وتقریر مسائل غامضہ بہ نہجے می فرمودند کہ کسے را اصلاً مجالِ تکرار ومحل انکار نمی ماند .....“ الخ [5]

علمی مقام ومرتبہ: شاہ صاحب ایک بلند پایہ عالم دین تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ تھی۔ آپ کے معاصرین مولانا تراب علی لکھنوی مفتی سعد اللہ رامپوری، مولانا حکیم لطف اللہ لکھنوی اور مفتی عنایت احمد کاکوروی وغیرہ کا قول تھا کہ

”اگر حضرت مولانا بگوشہ خمول وانزوا متردی نبودے وبمقامے مشہو

---

[1] کشف المتواری ص۱۸۶ [2] حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ مشاہیر کاکوری ص۵۰-۴۵ ونسب نامہ مولوی ذوالفقار علی حامد (قلمی)، [3] مواہب التعلندر ص۱۵، [4] اذکار الابرار ص۲۲۲-۲۲۳ وتذکرہ مشاہیر کاکوری ص۸۸

(حاشیہ ۵ صفحہ آئندہ پر)

بودے در علم و عمل از شاہ عبد العزیز دہلوی کم شہرت نیافتے کہ در امرے از امور علمیہ کمی ندارد۔" [1]

اذکار الابرار کی روایت ہے "مفتی عنایت احمد کہا کرتے تھے کہ میں نے علم و فضل میں اب تک کسی کو مولانا تقی علی کا ہم پلہ نہیں پایا۔" [2]

حافظ شاہ علی انور قلندر مستطیر ہیں۔

"طریقۂ افہام مطالب غامضہ و مآرب عویصہ وحلِ اشکالات آں بود کہ ہم در تقریر عبارت اعتراض خود شبہ مستفسر حل می شد۔" [3]

اخلاق وعادات:- شاہ تقی علی قلندرؒ نہ صرف ایک بلند پایہ عالم دین وجیہ صوفی تھے بلکہ وہ اخلاق کے اعلیٰ مراتب پر بھی فائز تھے جس کی شاہد عدل مندرجہ ذیل سطور ہیں۔

"در عقل کامل واصابت رائے چناں بودند کہ وابستگان دامنِ دولت وارادت ہمہ مشورت وصلاح ظاہریہ در مہمات خود میگرفتند وبہ عمل بدان فائز بمقاصد دلی می شدند .... بایں جلالت قدر وعلو مرتبت وسموِ منزلت ہمیشہ بافقراء می نشستند وتوقیر کبیر وترحم بر صغیر می نمودند واز مساوی ایشاں در می گذشتند وبحامل نیک فرود می آوردند وہمہ را بچشم شفقت تام ورافت تمام می نگریستند وہموارہ بہ کشادہ پیشانی وہیبت تمام باہر کس بسری بردند وغیبت کسے روا نمی داشتند .... ومباسطت وملاطفت ومخالطت ومحادثت می نمودند بامخصوصاں ومزاحِ مسنون باایشاں کہ مقصود از اں دلجوئی وخوشنوئی بود .... وتمامتر اوقات شبانہ روزی بہ طور سنت صرف می نمودند ودر احکام شرعیہ وارکان آں مبالغہ تمام می داشتند ونمازہائے پنجگانہ باجماعت میگذارند ....

(۵ صفحہ گذشتہ) حوض الکوثر ص۸

[1] مواہب القلندر ص۱۲ [2] اذکار الابرار ص۲۴۴ [3] حوض الکوثر ص۹

ودر ترک وتوکل پایہ بلند داشتند کہ از ارباب دنیا جز بقدر حاجت آنہا نمی پرداختند ...... واگر چیزے تحفہ از جائے می آمد تو دکمتر نوش می کردند وبہ ارباب ارادت ووابستگان دامن دولت تقسیم می نمودند ودر خادم ومخدوم فرق نمی کردند وعشق ومحبت بحضور پیر ومرشد خود آں چناں می داشتند کہ ہر گاہ نام شریف می گرفتند یا کسے ذکر مبارک حضرت غوث ملت می نمود بیتاب می شدند .... در اظہار معارف سر مو از جادۂ شریعت میلے نہ فرمودند ...... تعظیم علماء وشیوخ حسب مرتبہ وفضل می کردند وعمل تسخیر امراء و سلاطین وجن وشیاطین ہرگز نمی کردند ...... صاحب وقار واعتبار وکشادہ دشت وتجمل ظاہر وتحمل باطن وتبسم بسیار وخندہ کم وسحر بیان بودند اگر بہ اقتضائے وقت بر کسے غضب می آمدند ہمانی دم بہ عفو ش می شناختند۔[1]

ارشاد وتلقین:- آپ کو ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء میں شاہ تراب علی قلندرؒ سے اجازت و خلافت حاصل ہوئی۔[2] اس کے علاوہ برادرِ اکبر شاہ حیدر علی قلندرؒ سے بھی اجازت وخلافت پائی اور درس وتدریس کے ساتھ ارشاد وتلقین کا کام بھی انجام دیا۔

تلامذہ:- آپ کے تلامذہ کثیر تعداد میں ہوئے۔ چونکہ آپ نے تقریباً ساٹھ برس تک درس دیا اس لئے اس طویل مدت میں شاگردوں کی کل تعداد کا پتہ نہیں چل سکا لیکن جن شاگردوں نے سند فراغت حاصل کی ان کے نام "حوض الکوثر" اور اذکار الابرارؒ میں درج ہیں۔[3]

انتقال:- آپ کا انتقال بہ عارضہ بخار بہ عمر ۸۶ سال ۷ ار رجب المرجب ۱۲۹۰ھ بروز چہار شنبہ ڈیڑھ بجے دن میں ہوا اور شب پنجشنبہ بعد نماز عشاء والدِ محترم

---

[1] حوض الکوثر تتمہ روض الازہر ص ۷۱۵-۷۰۹ [2] اذکار الابرار ص ۴۵

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حوض الکوثر ص ۲۰ نیز اذکار الابرار ص ۴۵-۴۹

و پیر و مرشد مولانا شاہ تراب علی قلندرؒ کے روضے کے بائیں مشرق جانب مدفون ہوئے[1]۔

قطعہ تاریخ وفات از غلام امام شہید امیٹھوی۔

جنید زماں شبلیٔ عہد خویش	تقی علی مرشد اھل دیں
بہار گلستان ازو مستفیض[2]	گل از خرمن فیض او خوشہ چیں
دم فکر سال وصالش زغیب	رسید ایں ندا کاے شہید حزیں
سزد گر بگوئی بتاریخ او	جنید آمدہ در بہشت بریں[3]

۱۲۹۰ ہجری

خلفاء:۔ آپ کے خلفاء مندرجہ ذیل حضرات ہوئے۔

(۱) حضرت مولانا شاہ علی اکبر قلندرؒ برادر زادہ[4] (۲) حضرت شاہ مولوی رکن اللہ قلندرؒ لاہرپوری[5] (۳) حضرت شاہ علی احمد معروف بہ شاہ حبیب انور قلندرؒ خیرآبادی[6] (۴) حضرت قاضی شاہ خواجہ ملکاپوریؒ[7] (۵) حضرت مولانا حافظ شاہ علی انور قلندرؒ[8]

ارشادات واقوال: آپ کے ارشادات واقوال مختصراً مندرجہ ذیل ہیں۔

"می فرمودند کہ تصوف را بسیار معنی نوشتہ اند اما جامع مانع ہمہ ایں یکے است یعنی صدق توجہ بسوئے خدا"[9]

"می فرمودند اصول درویشی سہ چیز است کم خوردن وکم خفتن وکم باخلق آمیختن وفوائد کم خوری بسیار اند کہ مرد اصح حس واجود حفظ واذکے فہم واجلے قلب واقل نوم واخف نفس واسلم طبیعت واکرم قلق می گردد"[10]

---

[1] اذکار الابرار ص۲۵۵ [2] حوض الکوثر ص۲۶۲ میں مصرع اس طرح ہے ع بہار از گلستانِ او مستفیض
[3] اذکار الابرار ص۲۵۵ [4] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو فصل آئندہ [5] حوض الکوثر ص۲۶۲، اذکار الابرار ص۲۶۴ تا ۲۶۳ [6] اذکار الابرار ص۲۵۶ و حوض الکوثر ص۲۶۲
[7] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو اذکار الابرار ص۶۳-۲۶۲ [8] فصل آئندہ ملاحظہ ہو
[9] حوض الکوثر ص۲۶۲ [10] ایضاً ص۱۸۱

"روزے در صدق ارادت ارشاد رفتہ کہ نشان صدق ارادت آنست کہ از ہمہ اعراض کنی و ہیچک از دنیا و دیں پیرامون خاطرت نہ گردد و عرفا گفتہ اند کہ حقیقت طلب آں ست کہ اگر عقلا ہمہ گویند کہ مطلوب محال است میسّر شدنی نیست از جستجو باز میا ایں طلب است ورنہ ہوسے است۔" [۱]

خرق عادات وکرامات:۔ آپ کے خرق وعادات وکرامات کے بہ کثرت واقعات مشہور ہیں یہاں صرف ایک کرامت نقل کی جاتی ہے۔ تفصیل کے لئے "حوض الکوثر" و "اذکار الابرار" ملاحظہ کریں۔

"محمد احمد خاں تعلقدار بن فقیر محمد خاں کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ان کو زمانۂ قدیم سے آپ سے عقیدت تھی اسی لئے چلہ نہلانے کے بعد آپ کی خدمت میں لائے اور قدموں میں ڈال دیا آپ نے ازراہِ شفقت تسبیح اس کے منہ کے سامنے کرکے فرمایا "پٹھان کہو اللہ" اس بچے نے ایک دو بار اللہ کہا۔ لڑکے کے والد اور حضّارِ مجلس متعجب ہوئے کہ آپ کی کرامت ہے ورنہ اتنا سا بچہ کیسے کہہ پاتا۔ کچھ دنوں بعد وہ لڑکا مرگیا۔ والد کو بہت صدمہ ہوا اور تین روز اس کو دفن نہیں ہونے دیا بعد میں اس کو دفن کیا اور آپ سے اسے زندہ کرنے کو کہا۔ آپ نے صبر جمیل کی تلقین کی اور نعم البدل کی دعا کی۔ آپ کی دعا سے ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے بشیر احمد نام رکھا۔" [۲]

آپ کی تصنیفات میں دو کتابیں یادگار ہیں۔

(۱) روض الازہر فی مآثر القلندر (۲) رسالۂ خصائل عشرہ فطرۃ

---

[۱] حوض الکوثر ص ۲۸۔

[۲] اذکار الابرار ص ۲۵۷ و حوض الکوثر ص ۷۶-۷۷ پر یہ کرامت بہ تفصیل مذکور ہے اور یہ بشیر احمد خاں بشیر شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے والد محترم تھے۔

۱۔ روض الازہر فی مآثر القلندر

سیر و سوانح و ملفوظات پر مشتمل یہ کتاب اصلاً مولانا شاہ تراب علی قلندر کا ملفوظ ہے جو ایک مقدمہ دس لطائف اور خاتمہ پر مشتمل ہے لیکن لطیفہ نہم "در ذکر سماع غنا" میں شیخ عیسیٰ بن عبدالرحیم کے رسالہ سماع کا اقتباس نقل کرنے کے بعد مصنف کا انتقال ہوگیا [۱] اور اس کی تکمیل آپ کے شاگرد خاص و نبیرہ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر نے "حوض الکوثر تکملہ روض الازہر" کے نام سے کی۔ "روض الازہر" میں ۴۲۹ صفحات ہیں، جن میں بیشتر صفحات ۲۷ سطری اور کچھ صفحات ۲۲ سطری ہیں۔ کل صفحات بڑی تقطیع پر ہیں۔

"روض الازہر" کے مآخذات کی فہرست بہت طویل ہے، علم تفسیر و اصول تفسیر علم حدیث و اصول حدیث، علم فقہ و اصول فقہ، سیر و سوانح، اسماء الرجال، تصوف و اخلاق، تاریخ، ملفوظات مشائخ و دواوین شعراء کی بلا مبالغہ سیکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملفوظات ضمن میں بلا کثرت مباحث علمیہ پر بھی سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے جس کا مطالعہ نفع سے خالی نہیں ہے دوران تصنیف اکثر فرماتے تھے "کہ اس کتاب کے لکھتے وقت میرے قلب پر مضامین کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ اگر نہ لکھوں تو شاید قلب شق ہو جائے" [۱]

سرورق

روض الازہر فی مآثر القلندر

مولفہ علامہ اکبر فہامہ اشہر استاد اساتذہ زماں معدن عشق و ہیمان وحید عصر فرید دہر سیدی مولانا شاہ تقی علی قلندر نور اللہ مرقدہ الاطہر

---

[۱] اذکار الابرار ص ۴۴۹

حسب فرمائش

شایانِ ستائش محب الفقرا، جناب منشی حسن رضا صاحب وکیل حیدرآباد
در مطبع سرکاری ریاست رام پور واصح المطابع واقع لکھنؤ مطبوع گردید

مقدمہ تین فصلوں پر منقسم ہے جس میں علی الترتیب فضیلت علم و علماء، تقسیم سالکان وتعریف اہلِ سلوک کو بیان کیا گیا ہے

لطیفہ اوّل دو وصلوں پر منقسم ہے اور وصل اوّل تین فصلوں پر منقسم ہے جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کے والدین کے ایمان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ وصل دوم بھی تین فصلوں پر منقسم ہے اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ اور حضرت حسنینؓ کے فضائل، حضرت ابو طالب کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت، حضرت ابوطالب سمیت دیگر اعمام کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فضائلِ عامہ پر روشنی ڈالی ہے۔

لطیفہ دوم:۔ دو وصلوں پر منقسم ہے۔ وصل اوّل میں لفظ قلندر اور اس کی تعریف نیز اس سلسلے کے لوگوں کے اجمالی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ وصل دوم میں سرخیل سلسلہ قلندریہ شیخ عبدالعزیز مکیؒ کے حالات بالتفصیل مذکور ہیں، اس کے علاوہ چھ مختصر فصلوں میں مختلف علمی اور تحقیقی مباحث ہیں۔

لطیفہ سوم:۔ دس وصلوں پر منقسم ہے جس میں علی الترتیب سید خضر رومی قلندرؒ سے سید باسط علی قلندرؒ تک دس پیران شجرہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

لطیفہ چہارم:۔ اس میں دو وصل جن میں علی الترتیب شاہ مسعود علی قلندرؒ اور شاہ محمد کاظم قلندرؒ کا ذکر ہے۔

لطیفہ پنجم:۔ دو وصلوں پر منقسم ہے، وصل اوّل شاہ تراب علی قلندرؒ کے حالات میں ہے اور وصل دوم چار فصلوں پر محیط ہے جن کے عنوانات علی الترتیب یہ ہیں ——

۱۔ شجرۂ نسب شاہ تراب علی قلندرؒ ۲۔ ذکر حضرت محمد بن الحنفیہ ۳۔ فضیلت اولاد علیؓ بر اولاد شیخین اور ۴۔ مراد از آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

لطیفۂ ششم :۔ اس میں حضرت شاہ تراب علی قلندرؒ کا تصوف میں مسلک اور معمول نیز دیگر مسائلِ تصوف کا بیان نو فصلوں میں کیا گیا ہے۔

لطیفۂ ہفتم :۔ "دربیان مسلک حضرت ایشاں در اصول وغیرہ" کے عنوان سے سات فصلوں پر منقسم ہے جس میں عقائد کے بعد وحدت وجود و شہود کا بیان، حضرت شیخ محی الدین ابنِ عربی کے مختصر حالات نیز دیگر مضامین متعلق بہ تصوف و سلوک و عقائد کو با تفصیل مع ثبوت نص و احادیث و عمل خلفاء راشدین و صحابۂ کبار و ائمۂ اطہار و علماء متقین پیش کیا ہے۔

لطیفۂ ہشتم :۔ اس لطیفہ میں شاہ تراب علی قلندرؒ کی عبادت و ریاضت نیز اہتمام والتزام نوافل و دیگر عبادات کو مع ان کے مسلک و معمول کو تفصیلی طور پر علمی و تحقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔

لطیفۂ نہم :۔ "در ذکر سماع غنا" کے عنوان سے اس میں سماع سے متعلق صحابہ و تابعین تبعِ تابعین۔ ائمہ اربعہ، علماء و محدثین اور سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ کے اقوال کو نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف بزرگوں کی سماع کی حکایات کو بیان کیا ہے۔ سماع کے لئے ضروری اشیاء کا بیان بھی اسی فصل میں ہے۔

(۲) خصائل عشرہ فطرۃ :۔

شاہ صاحب کا یہ رسالہ دستیاب نہیں ہے۔

کتابیات

۱۔ اذکار الابرار۔ شاہ تقی حیدر قلندر، شاہی پریس لکھنؤ ۱۳۵۷ھ

۲۔ تذکرہ گلشن کرم۔ شاہ تقی انور قلندر۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۴۰۵ھ

۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری۔ شاہ علی حیدر قلندر، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء

۴۔ چشمۂ فیض۔ منشی فیض بخش (مخطوطہ) کتب خانہ انواریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری

۵۔ حوض الکوثر تتمہ روض الازہر۔ شاہ علی انور قلندر، اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۳۹ھ

۶۔ روض الازہر فی مآثر القلندر۔ شاہ تقی علی قلندر، مطبع سرکاری ریاست رامپور ۱۳۲۹ھ

۷۔ کشف التواری فی حال نظام الدین قاری۔ شاہ تراب علی قلندر، اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۲۸ھ

۸۔ مواہب القلندر۔ شاہ حبیب حیدر قلندر، اصح المطابع لکھنؤ ۱۳۳۶ھ

۹۔ نسب نامہ۔ مولوی ذوالفقار علی حامد (مخطوطہ) کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری

۱۰۔ نغمات التسلیم۔ مولانا سمی علی علوی۔ مطبع شام اودھ لکھنؤ ۱۳۲۱ھ

آہ! مقیم الدین فاروقی

ماہ ستمبر ۲۰۰۲ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سکریٹری جناب مقیم الدین فاروقی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم فاروقی بڑے ہی ملنسار اور ہمدرد قوم انسان تھے۔ مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے زبردست معتقد تھے ان کے پرستار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی میں رہنے کے باوجود انہوں نے کسی بھی مذہب اسلام مغائر حرکت کو نہیں ہونے دیا مسلم پرسنل لاء کے معاملے میں ان کے خیالات اپنی پارٹی سے بالکل مختلف تھے اور وہ اس معاملے میں اس آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مؤید تھے جسکے سربراہوں میں حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، حضرت مولانا امیر شریعت منت اللہ رحمانیؒ جیسے اکابرین کا نام گرامی رہا ہے۔ اور جس کے موجودہ کرتا دھرتا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کا اسم مبارک نمایاں ہے۔ ایم فاروقی بیشک کامریڈ تھے لیکن اندر سے وہ پکے مسلمان تھے۔ ان کا دل و دماغ اسلامی تعلیمات سے منور و سرشار تھا۔ غریب پرور اور رحم دل تھے دوسروں کے کام آنا ان کا اصل مقصد تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی لغزشوں کو درگذر فرما کر ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما اور ان کی مغفرت فرما کر مقام رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

(م۔ س۔ ب)

اکتوبر ۱۹۹۷ء

برہان

جلد ۱۲۱ شمارہ ۴

اس شمارے میں

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

ملکہ انگلستان الزبتھ دوم ہندوستان کی آزادی کے پچاس برس مکمل ہونے کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ ہند کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائیں اور ایک ہفتہ ہندوستان میں مختلف پروگراموں میں اپنی شمولیت کرنے کے بعد واپس لندن روانہ ہوگئیں۔

ہندوستان میں اس باران کا وہ استقبال نہیں کیا گیا جو ۱۹۶۱ء اور ۱۹۸۳ء میں کیا گیا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کچھ بیانات اخبارات میں ایسے شائع ہوئے جسے ہندوستان کے عوام نے پسند نہیں کیا اور یہ بات ہمارے خیال میں ہندوستانی عوام کے لئے کوئی خوبی یا خوشی کی بات نہیں ہے کہ اگر کسی سے اختلاف ہے تو اس پر بُرا مان اور روٹھ کر الگ بیٹھ جایا جائے۔ یہ ہندوستانی تہذیب و شرافت اور مزاج کے یقیناً خلاف بات ہے۔ مگر اسے کیا کیا جائے کہ ہمارے یہاں ووٹ کی سیاست نے ہر اس چیز کو پلٹ کر رکھ دیا ہے جیسیں ہندوستان کی خوبی، ہندوستان کی انسانیت، ہندوستان کی رواداری و شرافت ہندوستان کی تہذیب و بڑائی نمایاں شے ہے۔ ہندوستان کی شہرت تھی یہاں دوسرے کے خیالات کو شرافت سے سُنا گیا ہے یہاں دوسروں کے مذاہب کا احترام کرنے کا دستور عام ہے۔ لیکن آج ہندوستان کی یہ شہرت باقی ہے یا اس میں کچھ کمی آئی ہے اس کا اندازہ ہر شخص کو بخوبی ہے ۔ ۱۹۹۲ء میں ایک جم غفیر نے بابری مسجد کو ڈھا کر ناچا گایا اور خوشیاں منائیں اس وقت ہندوستان کا دانشور طبقہ خون کا آنسو رو رہا تھا کہ آنے والے وقت میں اس مذموم فعل کے نتائج ہندوستان کی عزت و عظمت کو خاک میں ملا کر رہیں گے۔ چنانچہ آج ہم وہ ہی دیکھ رہے ہیں کہ جس جگہ ہندوستان کی خوبیوں کے

تذکرے ہوتے تھے وہاں اب ہندوستان کی ان خامیوں کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے۔ یہ بہت ہی غلط اور گھٹیا بات ہے کہ ہندوستان کے بارے میں غیر ممالک میں اس طرح کے خیالات پروان چڑھیں اگر دیکھا جائے تو اس بدترین فعل کے ہم خود ذمہ دار ہیں ہم اپنے کردار و حالات سے ایسا موقع کیوں فراہم کرتے ہیں کہ جس سے ہمارے بارے میں کوئی غلط خیال و تصور قائم کرے۔

برطانیہ کی ملکہ الزبتھ دوم ہماری محترم مہمان تھیں اور ہمارا فرض تھا کہ ہم اپنے ملک کی عظیم اعلیٰ روایات کے پیش نظر ان کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ ان کے خیالات کو یہ سمجھ کر کہ ہر شخص کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی ہے۔ گوارہ کرتے اور اس پر برا نہ مانتے صرف اس لیے کہ یہ ایک مہمان کے خیالات ہیں اور مہمان کی عزت ہندوستان کی عظیم روایات میں شامل ہے۔ برطانوی ملکہ کے دورہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ برطانوی سرمایہ کاری اور ٹکنالوجیکل تعاون کو فروغ دینے کے امکانات کا جائزہ لینا۔ کیونکہ ملکہ کا دورہ زیادہ سے زیادہ اس سرمایہ کاری کی ضرورت اور امکان کی طرف برطانوی اور ہندوستانی سرمایہ کاروں کی توجہ مبذول کرنے میں مدد کر سکتا ہے اور وہ بھی ایک حد تک۔ ہم نے اس بات کو سمجھنے کے بجائے ان سوالات کے جاننے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کے جوابات سے ہندوستانی عوام کو اب کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے۔ بوسیدہ سوالات کے بوسیدہ جوابات پانا ہی کیا ہم مقدر بنانا پسند کریں گے۔ ہم ہندوستانیوں کو بہر حال حقائق سے ہر وقت آگاہ رہنا چاہیئے۔ یہ ہی بات ہمارے مستقبل کے لئے نیک فال ثابت ہو سکتی ہے۔

لیکن یہاں ہم ایک بار ضرور کہنا چاہیں گے کہ ملکۂ انگلستان کو سیاسی حالات کے سلسلے

میں بیان بازی سے احتراز کرنا چاہیئے تھا کیونکہ آج کل ہر ملک اپنے حالات کو بخوبی سمجھتا ہے اسے کیا کرنا ہے اور کیا کرنا چاہیئے اس میں کسی دوسرے ملک کے سربراہ کی مداخلت یقیناً ناقابل برداشت بات ہے۔ ان کے وزیر خارجہ مسٹر روبن لگن نے کشمیر کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ بیان نے ہندوستانی عوام کے جذبات کو جو ٹھیس پہنچائی ہے۔

اس کے سلسلے میں ملکۂ انگلستان کیا کہہ کر صفائی پیش کریں گی۔ جہاں میزبان کے لئے حد ادب ہے وہاں مہمان کے لئے بھی تو کچھ تہذیب و شرافت کی پابندی عائد ہوتی ہے مہمان جب میزبان کی عزت نفس پر ہی حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگے تو آخر میزبان کو کب تک مہمان کی عزت کا خیال رکھنے کی بات کب تک یاد دلائی جاتی رہے گی۔ میزبان کے آداب تو یاد کرائے جائیں مگر مہمان اپنے آداب کو فراموش کردے اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ ناانصافی کب تک چلے گی یہ سمجھنے کی بات ہے۔ کشمیر ہندوستان کا ہے اتنی موٹی حقیقت اگر ہمارے مہمان یاد کر کے نہ آئیں تو پھر معاف کریں اسمیں قصور ہمارا نہیں مہمان اپنی عزت کی خود مٹی پلید کرنے کا باعث ہے۔ ہماری آزادی کے درمیان میں غلامی کی دقیانوسی باتوں سے ابھی تک چمٹے رہنا کوئی عقل و دانش کی بات نہیں ہے۔

اپنے دورۂ ہند کے درمیان میں ملکۂ انگلستان الزبتھ دوم نے یہ کہا ہے کہ دہلی گندہ شہر ہے۔ اس بات پر ہم سب کو چونکنا ہونا ہی تھا یہ بات ملکۂ انگلستان نے جس وجہ سے بھی کہی ہے اس سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ انہوں نے حقیقت میں بالکل صحیح کہا ہے اور ہم ہندوستان کے لئے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو حقیقت ہم پاس و قریب رہ کر نہ جان سکے اور نہ سمجھ سکے وہ حقیقت ہزاروں میل دور سے آئی ملکہ کو ایک دن ہی میں ظاہر ہو گئی۔ یہ کس قدر تعجب کی بات ہے اور ہمارے لئے ڈوب مرنے کا بھی مقام ہے چلو بھر پانی میں۔

انگلستان کی ملکہ ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں عالیشان جگہ ٹھہریں جہاں کے در و دیوار شیشے کی طرح صاف شفاف ہیں اور جن جگہوں سے ان کی سواریاں کاروں میں گذریں وہ سڑکیں بھی انتہائی صاف ستھری شیشے کی طرح چمکدار تھیں اس کے باوجود انھیں دہلی شہر کی گندگی نظر آگئی یہ ہم ہندوستانیوں کے لئے کس قدر تعجب کی بات ہے اس میں ہمارے لئے کس قدر سبق ہے یہ بیان سے باہر ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگلینڈ کے جمہوریت واقعی جمہوریت ہے جہاں عوام کے مسائل سے حکمراں طبقہ ہر طرح واقف و آگاہ ہے۔ ایک غیر ملک کی راجدھانی کی گندگی اس کی ملکہ کی نظر سے اوجھل نہ رہ سکی تو پھر اسے اپنے یہاں کے عوام کے مسائل کی کس قدر جانکاری ہوگی اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

دہلی شہر کی گندگی کا ذکر ملکۂ انگلستان کی زبان سے سن کر ہمارے ملک کے حکمرانوں اور دہلی کے وزیر اعلیٰ کے منہ پر زور سے طمانچہ پڑا ہے اس کے بعد اگر ہم میں ذرا بھی شرم و حیا باقی ہے تو عوام کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا برملا اظہار کرتے ہوئے ان کے مسائل کو حل کرنے کی طرف راغب و آمادہ ہونا چاہیئے مگر نہیں دہلی کے وزیر اعلیٰ صاحب سنگھ کہتے ہیں کہ ملکۂ انگلستان نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ جبکہ دیگر لیڈران نے ملکۂ انگلستان کے اس بیان پر کہ دہلی شہر گندہ ہے پر اپنی ناراضگی ظاہر کی ہے کہ انہیں ایسا بیان دینا نہیں چاہیئے۔ کانگریس کے لیڈران نے اس بیان کے سہارے حکمراں جماعت کے خلاف بیان بازی شروع کر دی ہے۔ مگر اس کے تدارک کے لئے کسی لیڈر کی طرف سے ہمارے سامنے کوئی ایسا پلان نہیں ہے جس سے دہلی کی گندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ نئی دہلی کے روزنامہ ٹوبھارت ٹائمس ہند نے اس پر سروے کروایا ہے عوام الناس کی سو فیصدی رائے میں دہلی گندہ شہر ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اس حقیقت کے اجاگر ہونے کے بعد بجائے دہلی کی گندگی کو دور

کرنے کے منصوبے عمل میں لائے جائیں۔ ایکدوسرے پر الزام تراشیاں شروع ہوگئی ہیں دہلی میونسپل کارپوریشن اور نئی دہلی نگر پالیکا پریشد اور دہلی چھاؤنی بورڈ میں ہلچل ضرور مچی ہے سب کواپنی اپنی ذمہ داریاں عوام باور کرارہے ہیں مگر کسی نے بھی دہلی شہر کی گندگی پر اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں دکھایا ہے۔ میونسپل کمشنر نے اگرمگر کے ساتھ دہلی شہر کی گندگی پر اظہار خیال کیا ہے اسی طرح وزیر اعلیٰ دہلی اور حزب اختلاف کانگریس کے لیڈران نے بھی اخباری بیانات کا سلسلہ دہلی شہر کی گندگی پر شروع کر دیا ہے۔ لیکن کسی کے پاس بھی عوام کے اس سب سے ضروری اور بڑے مسائل کے سدباب کے لئے کوئی فارمولہ نہیں ہے۔ گندگی جو انسانوں کی بیماری کا باعث ہے اور جس سے آدمی موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے اس سب سے بڑے اہم مسئلہ پر ہمارے حکمرانوں کا رویہ کس قدر شرمناک ہے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ملکۂ انگلستان دہلی شہر کی گندگی پر اظہار خیال کرکے جاچکی ہیں۔ اب ہمارے عوام کو انتظار ہے کہ ملکۂ انگلستان نے دہلی کی گندگی کی طرف ہمیں جو توجہ دلائی ہے ہم اسے دہلی کے عوام کے مفاد میں کب اس پر عمل کرتے ہوئے دہلی شہر کی گندگی کو دور کرکے دہلی کو ایک صاف ستھرا شاندار شہر بنانے کے لئے کوشش وجدوجہد کریں گے۔

مہنگائی نے ہندوستانی عوام کی کمر توڑ کر رکھدی ہے مہنگائی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی ہے جس تیز رفتاری کے ساتھ ریلیں چل رہی ہیں دوڑ رہی ہیں اسی تیزی کے ساتھ مہنگائی نے عوام الناس کا کچومر ہی نکال دیا ہے اخبارات میں سیاسی لیڈران کے بینک کھاتوں کی داستانیں چھپتی رہتی ہیں جس میں کروڑوں اربوں روپے کا تذکرہ ہوتا ہے مگر عوام کا حال یہ ہے کہ انکو دو وقت کی روٹی کے لئے کس طرح پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ صرف وہی جانتے ہیں کب تک اس مہنگائی کی چکی میں عوام پستے رہیں گے۔ حد ہو چکی ہے اب تو اس مہنگائی کو بڑھنے سے روکنا ہی ہوگا ورنہ ڈر ہے کہ عوام کا غصہ کوئی گل نہ کھلادے۔ خدا خیر کرے!

اسلامی دارالافتاء اور منصبِ مفتی
ایک تحقیقی مطالعہ

قسط ۲　ڈاکٹر نور احمد شاہتاز (کراچی یونیورسٹی)

افتاء کی شرائط اور ممنوعات:

اس بات پر اصولیوں کا اجماع ہے کہ ثقہ و عادل عالم کو افتاء کا اختیار ہے۔ جبکہ ائمہ اسلام نے ایسے شخص پر سخت ملامت کی ہے جو قلت علم یا ضعف دین یا دونوں کی موجودگی کے باوجود مسند افتاء پر چڑھ بیٹھے (۱۵) اور ایسے شخص کی شدید مذمت کی ہے جو بلا اہلیت میدان افتاء میں دم مارنے لگے اور لاعلمی کے باوجود فتویٰ صادر کرنے لگے۔ یا خلاف علم اپنی خواہش یا کسی دوسرے کی خواہش کے مطابق فتاویٰ جاری کردے یا سستی شہرت کی خاطر یوں فتویٰ دے کہ حلال کو حرام یا حرام و ناجائز کو حلال اور جائز بتلائے۔ یا کسی قول شاذ کو حجت قرار دے کر اس سے استدلال کرے اور اسی پر فتویٰ دے۔ مفتی کو چاہیئے کہ وہ سوال کا جواب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ اس کا جواب اس حکم شرع میں اسی طرح ثابت شدہ ہے جیسا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ یعنی مفتی کی حیثیت "جبکہ اس کا تعلق مجتہدین سے ہو" ایک ایسے مخبر کی ہوگی جو سائل کو قرآن وسنت سے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کتاب وسنت کا حکم سنا رہا ہو یا اس کی حیثیت ایسے مخبر کی ہوگی جو امام فی المذاہب کی فقہی آراء و نصوص سے مسائل کے سوال کا جواب اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق دے یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کا تعلق مقلدین

سے ہو جیسے کوئی مجتہد سوائے اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے کتاب و سنت سے سیکھا ہے اسی طرح کوئی مقلد اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا جو اس نے آئمہ امام فی المذہب کے مذہب سے سیکھا ہو. جس کا وہ مقلد ہے۔

اسی طرح جب کسی مفتی کو کسی استفتاء کے موضوع کے بارے میں مکمل معلومات مل جائیں اور وہ سوال کا حل یقین یا غلبۂ ظن کی بناء پر نکال لے تو پھر اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے مطابق جواب دے اور سوال کا صحیح حل مل جانے اور استفسار کا درست جواب معلوم ہو جانے کے باوجود اس سے اغماض برتنا اور اس کے خلاف فتویٰ دینا حرام ہے ایسا کرنے والا شخص ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہوگا جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"یقولون علی اللہ ما لا یعلمون" نیز قل انما حرم ربی الفواحش.... الی قولہ تعالیٰ وان تقولو علی اللہ ما لا تعلمون"

اور جب کسی نے علم کے خلاف فتویٰ دیا تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے.... ویوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ۔

اور اگر کسی میں وصف علم بغیر عدالت کے پایا جائے تو اسے بھی فتویٰ دینا جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے اور فتویٰ کے درمیان فسق حائل ہے اور وہ اس لئے کہ فتویٰ کا تعلق امور دینیہ سے ہے جبکہ فاسق کی بات امور دین میں قابل قبول نہیں۔(۱۶) بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد فاسق معلن اور متبدع ہے جس کا فتویٰ صحیح نہیں (۱۷) جیسے روافض کہ جو سلف صالح پر سب و شتم کرتے ہیں چنانچہ ان کے فتاویٰ مردود ہیں اور ان کے اقوال ساقط الاعتبار ہیں۔ جیسا کہ نووی نے

صیمری کا قول "المجموع" میں نقل کیا ہے۔ (۱۸)

افتاء و استفتاء کا حکم :

ہر مسلم مرد و عورت کو ایسا کوئی بھی کام جو امور دین میں سے ہو شروع کرنے سے قبل سوچنا ہوگا کہ ان کا یہ عمل شرعاً حلال ہے یا حرام جائز ہے یا ناجائز؟ اگر انہیں اس کا علم ہے تو فبہا اور اگر وہ اس کا شرعی حکم نہیں جانتے تو انہیں کسی ایسے صاحب علم سے رجوع کرنا ہوگا جو فتویٰ دینے کا اہل اور مجاز ہو، بمقتضائے امر الٰہی فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔

اس کے بعد ہی مزعومہ امر کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر وہ امر شرعاً جائز ہو تو اسے باطمینان قلب انجام دیا جائے گا اور اگر ممنوع یا ناجائز ہو تو اس سے اجتناب کیا جائے گا۔

اور جب کوئی مسلمان امور دینیہ کے سلسلہ میں کوئی سوال کسی ایسے عالم سے کرے کہ اس علاقہ　　میں اس کے سوا اور کوئی عالم نہ ہو تو اس عالم کو چاہیئے کہ وہ پوری احتیاط کے ساتھ ادلہ شرعیہ کے مقتضی کے عین مطابق اس سوال کا جواب دے کہ ایسا کرنا شرعاً اس پر واجب ہے اور اگر اس علاقہ میں ایک سے زائد ایسے علماء ایک ہی مجلس میں موجود ہوں جو فتویٰ دینے کے اہل ہوں تو اب ان تمام پر اس کا جواب دینا فرض کفایہ ہے کہ ان میں سے اگر ایک بھی یہ ذمہ داری قبول کرلے تو تمام پر سے وجوب ساقط ہو جائے گا جیسا کہ دیگر فرائض کفایہ میں معروف ہے۔ لیکن اگر سائل کو ان میں سے صرف ایک ہی مفتی دستیاب ہو تو اس ایک پر اس کا جواب دینا فرض عین ہے۔

اور اگر سائل کے علاقہ میں صرف ایک متفقہ پایا جائے جو کہ مفتی ہونے کی استعداد (ABILITY) نہ ہو اور سائل کو باوجود تلاش بسیار کے کوئی مفتی نہ مل سکے تو اسے اس صورت میں اسی متفقہ

سے رجوع کرنا ہوگا اور اسی سے مسئلہ کا حل طلب کرنا ہوگا کہ ایسا کرنا کم از کم اس سے بہتر ہے کہ وہ بغیر شرعی حکم معلوم کئے شک وارتیاب کے عالم میں کسی امر پر عمل پیرا ہو اور سائل کا مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں کوشش وکاوش کرنا باوجودیکہ اسے کوئی اہل علم نہ ملے یہ بھی تقویٰ کی وہ حد ہے جسے اللہ نے فاتقوا اللہ ما استطعتم فرمایا ہے۔ (۲۰)

اور مستفتی پر کسی ایسی جگہ کوئی افتاد آن پڑی کہ جہاں نہ تو کوئی مفتی، مجتہد ہے اور نہ مقلد، تو ایسی صورت میں اس سے اس افتار کا شرعی حکم معلوم کرنے کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی اور یہ اس شخص کی مانند ہوگا جسے دعوت نہیں پہونچی۔ اگرچہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ مکلف ہے تاہم اسے اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیئے کہ فطرت سلیمہ اور ضمیر زندہ اسے حق کی طرف رہنمائی کریں گے (۲۱)

بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عالم اس مخصوص صورت حال کا شرعی حکم نہ جانتا ہو جس سے سائل دوچار ہوا ہے تو عالم کو چاہیئے کہ وہ مستفتی کے سوال کا جواب نہ دے۔ یہ اس صورت میں ہے جبکہ واقعتاً استفسار کسی ایسی صورت سے متعلق ہو جو کہ حقیقتاً درپیش ہو مگر عموماً پیش نہ ہوتی ہو نہ کہ فقط کسی صورت کے امکانات سے متعلق ہو یا ناممکن الوقوع مسائل سے متعلق استفسار ہو۔ امام مالک سے بسا اوقات بعض مسائل کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ فرماتے کیا یہ امر واقعتاً درپیش ہے؟ اگر کہا جاتا کہ ہاں تو جواب دیتے بصورت دیگر جواب نہ دیتے تھے اور یہ کہہ کر اسے چھوڑ دیتے کہ جب کوئی ایسی صورت پیش آئے گی تو اللہ تعالیٰ جواب بھی ارزاں فرمادیں گے۔

مفتی کی خوبیاں: مفتی کا منصب امور دین میں ایک اہم منصب اور حساس اجتماعی فریضہ اور سوشل ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حقیقی استعداد اور ظاہری و باطنی صفات سے متصف ہونا لازمی ہے۔

۱۔ مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ کردار کا مالک اور فسق و فجور کا باعث بننے والے امور سے کلیتاً مجتنب ہو۔

۲۔ عوام الناس کے نزدیک اس کی شہرت عمدہ ہو، حق پر ثابت قدم رہنے والا اور نرمی کے موقع پر نرمی اور سختی کے موقع پر سختی کرنے والا ہو۔

۳۔ بارعب اور پروقار شخصیت کا مالک ہو۔

۴۔ صاحب بصیرت، سلیم العقل اور استنباط مسائل میں حسن تصرف کا مالک ہو۔

۵۔ لوگوں کے احوال سے واقف ہو اور ان کے مکر وفریب کو جانتا ہو۔ تاکہ حق و باطل کی تمیز کر سکے اور ظالم و مظلوم کو پہچان سکے۔

۶۔ وہ صرف اپنے ہی علم پر تکیہ کرنے والا نہ ہو بلکہ اپنے ہم مجلسوں سے مشورہ بھی کرتا ہو اگرچہ اس کے ہم مجلس اس سے علم میں نسبتاً کم ہوں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ اس طرح کوئی ایسی صورت اس پر ظاہر ہو جائے جو اس وقت اس کے ذہن سے اوجھل ہو اور مشورہ کر لینا سلف صالحین کی اتباع بھی ہے۔ ماسوا ان امور کے جن کا پوشیدہ رکھنا مطلوب ہو یا جن کے افشار سے فساد کا خطرہ یا آداب معاشرت کے خلاف لازم آتا ہو۔

۷۔ اسے اپنے علم اور مفتی کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کا گھمنڈ نہ ہو بلکہ وہ امور مسئولہ میں اللہ علیم و خبیر سے مدد و نصرت کا طلبگار رہے اور یہ التجا کرتا رہے کہ رب کریم اسے مسئلہ کے صحیح ترین حل تک پہنچنے میں رہنمائی فرمائے۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ وہ جب بھی اللہ کے دروازے پر دستک دے گا تو گویا توفیق کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ (۲۳)

۸۔ لباس و پوشاک میں نظافت پسند ہو۔ کبھی بھی غیر شرعی وضع قطع کے ساتھ گھر سے نہ نکلے، القرافی کہتے ہیں کہ عامۃ الناس ظاہری شکل وصورت، وضع قطع کا بہت اثر لیتے ہیں اور اگر مفتی کا وقار و احترام ان کے دل میں نہ ہوگا تو وہ نہ تو اس کے فتاویٰ کو اہمیت دیں گے اور نہ شرعی مسائل کے سلسلے میں اس سے رجوع ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ایک ایسے قاری کو پسند کرتا ہوں جو سفید لباس

میں ملبوس ہو تاکہ وہ لوگوں کی نظروں میں باوقار ٹھہرے اور دین جو کچھ علوم حقہ میں سے اس کے پاس ہے اس کی بھی قدر و منزلت ہو۔ (۲۴)

ابو عبداللہ ابن بطہ اپنی کتاب "الخلع" میں امام احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ کوئی شخص منصب مفتی کا اہل نہیں جب تک اس میں پانچ خوبیاں نہ ہوں:

۱۔ نیک نیت ہو۔

۲۔ اس میں علم وحلم اور وقار و سکون ہو۔

۳۔ ہیبت و وقار ہو، ورنہ عوام اسے چبا ڈالیں گے۔

۴۔ علم میں پختہ اور عزم میں قوی ہو۔

۵۔ لوگوں کے احوال سے واقفیت رکھتا ہو۔

ان خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ابن قیم کہتے ہیں کہ یہ پانچ خوبیاں مفتی کی اصل اور اساس ہیں، ان میں سے کوئی بھی کم ہوگی تو مفتی میں اسی حساب سے اتنی ہی کمی یا نقص پایا جائے گا۔

فتویٰ کے سلسلہ میں مفتی کو کیا کیا کوششیں کرنی چاہئیں:

مفتی کے پاس جیسے ہی کوئی سوال آئے تو اسے اس کا جواب دینے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے اور مستفتی کے مفاد میں یہ ہے کہ مفتی اس سوال پر خوب غور و فکر کے لئے کافی وقت دے اور اس کے تمام اجزاء و عناصر پر اول سے آخر تک گہری نظر ڈالے تاکہ فتویٰ دینے میں کہیں کوئی تساہل اس سے منصب کے [illegible] کی صف میں اور ایسے لوگوں کے زمرے میں اسے شامل نہ کردیا جائے جن کے [illegible]

اعتبار نہیں چنانچہ ایسے مندرجہ ذیل کوششیں فتویٰ دیتے وقت کرنی چاہئیں۔

۱۔ فتویٰ تحریر کرنے سے قبل مستفتی کے سوال کو غور سے پڑھا جائے اور اس کے الفاظ پر غور کرکے جواب اسی کے الفاظ کے مطابق لکھا جائے کیونکہ مستفتی اگر پڑھا لکھا نہیں تو اس کے الفاظ کا صحیح مفہوم ممکن ہے مفتی سرسری نظر سے نہ جان سکے یا یہ کہ جو الفاظ سائل نے استعمال کئے ہیں عرف عام میں ان کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہو۔ چنانچہ مفتی کو جواب میں ایسے ہی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جو معروف ہوں اور جن سے سوال کا واضح اور صحیح جواب مستفتی کے سمجھ میں آسکے۔ اور اگر مفتی بلا غور وخوض اور الفاظ میں تامل کے بغیر فتویٰ نویسی شروع کردے گا تو یہ فتویٰ خلاف شرع ہوگا کہ مستفتی کا ما فی الضمیر سمجھے بغیر لکھا گیا۔ (۲۵)

۲۔ مفتی کا جواب خلاف واقع نہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ مفتی سائل سے اس کے شہر یا گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرے اور جواب اسی کے شہر وگاؤں کے عرف کے مطابق دے کہ مختلف علاقوں میں عرف مختلف ہوسکتے ہیں لہذا مفتی عرف کا لحاظ رکھے اور اپنے ہی شہر کے عرف کے مطابق فتویٰ نہ دے کہ ہر شہر کا عرف خاص حکم شرعی رکھتا ہے (۲۶)

۳۔ جواب مستفتی کی غرض وغایت سمجھنے کے بعد لکھا جائے اور تفصیلات جاننے کے لئے اس سے استفسار کیا جائے تاکہ موضوع کی وضاحت ہوسکے اور اگر موضوع کی تفصیلات جاننا ضروری ہوں تو یہ تفصیلات جاننے کے بعد ہی جواب تحریر کیا جائے تاکہ ہر طرح کے احتمالات واشکالات سے پاک جواب لکھا جاسکے (۲۷)

۴۔ مفتی کا جواب حق وصواب کے مطابق ہو۔ تاکہ مستفتی کو اس کے نتیجہ میں کسی ملامت وعتاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مفتی کو سوال کی اچھی طرح چھان پھٹک کرنی چاہیئے کیونکہ

ہر سائل کی نیت واقعتاً اس کا جواب حاصل کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ ایسے سائل بھی ہوتے ہیں جو اس سوال کے جواب کے نتیجہ میں اپنا کوئی الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ یا مفتی کو الجھانا مقصود ہوتا ہے یا اس کے ذریعہ اپنے دیگر مقاصد کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر سائل کے سوال کو حسن نیت پر بھی محمول نہیں کیا جاسکتا۔ مفتی اگر ان امور کا خیال کئے بغیر فتویٰ دے گا تو خود بھی گرفتار بلا ہوگا اور دوسروں کو بھی مبتلائے عذاب کرے گا۔ اس صورتحال کو حسب ذیل مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال بھی آسکتا ہے جو دو ایسے مسائل پر مشتمل ہو کہ جن کی صورت ایک جیسی ہو مگر حکم مختلف ہو۔ اور یوں ان میں سے ایک تو صحیح وجائز کے قبیل سے ہو جبکہ دوسرا باطل وحرام کے قبیل سے اور اس کی وجہ پہلے اور دوسرے مسئلہ کی حقیقت میں اختلاف پایا جانا ہو۔ اب اگر مفتی ذہانت سے کام نہ لے اور اس کی نظر صرف ایک ہی صورت پر ہو تو وہ ان دونوں کی حقیقت سے تجاہل کی بناء پر دونوں پر ایک ہی حکم لگائے گا اور یوں حکم صحیح کے مخالف فتویٰ دے ڈالے گا کیونکہ اس نے ان دو امور کو جمع کردیا جن میں اللہ نے فرق رکھا ہے۔

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال آسکتا ہے جو دو ایسے مسائل پر مشتمل ہو کہ جن کی صورت مختلف ہو مگر حکم ایک ہی ہو کہ دراصل ان کی حقیقت ایک ہی ہے اور اگر مفتی ذہانت سے کام نہ لے اور اس کی نظر ایک ہی صورت پر ہو اور وہ دونوں مسائل کو نفس حقیقت میں ایک سا نہ سمجھ سکے تو وہ ایک مسئلہ پر ایک حکم اور دوسرے پر دوسرا حکم لگائے گا۔

کبھی مفتی کے پاس ایسا سوال بھی آسکتا ہے جو مجمل ہو مگر اس کے اجمال میں متعدد انواع ہوں چنانچہ مفتی کا ذہن کسی مخصوص نوع کی طرف جاسکتا ہے اور کسی دوسری نوع سے اس کا ذہن غافل بھی رہ سکتا ہے اور ممکن ہے وہی نوع مستفتی کے نزدیک زیادہ اہم اور مقصود بالذات ہو۔ چنانچہ اگر مفتی اجمال کی تفصیل جانے بغیر فتویٰ دے گا اور

ابتلاء ہی میں سائل کا قصد معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے گا تو جواب تحریر کرنے میں کسی ایسی صورت کو اختیار کر سکتا ہے جو صواب سے دور تر ہو۔

اس سے بھی بڑھ کر ایک صورت مفتی کو پیش آسکتی ہے اور وہ یہ کہ مفتی کے سامنے ایک ایسا سوال آئے جو اصلاً باطل ہو مگر خوبصورت الفاظ اور شگفتہ تحریر کے لبادے میں پیش کیا گیا ہو (۲۹)

اور اگر مفتی اس مکر و فریب کی طرف متوجہ نہ ہو جو اس میں ملفوف ہے اور جواب دینے میں جلدی کرے تو وہ معذورات میں جا پڑے گا۔

ایسے ہی موقع کی مناسبت سے القرافی نے کہا کہ مفتی کو بہت چوکنا رہنا چاہیئے کیونکہ بسا اوقات باطل کو حق کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے مگر اس سے اصلاً مقصود باطل ہوتا ہے (۳۰)

مفتی ہوشیار باش!

مفتی کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جہاں اس کے پھسل جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مفتی کو ایسی پھسلن (SLIPPING) سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ مثلاً اگر کسی مسئلہ میں دو قول ہیں۔ ایک قول تخفیف (نرمی) کا اور دوسرا تشدید (سختی) کا تو مفتی کو شدت کے قول پر فتویٰ نہ دینا چاہیئے اسی طرح عوام کو تشدید کے قول پر اور خواص کو تخفیف کے قول پر فتویٰ دینا بھی درست نہیں جبکہ اس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی شرعی جواز بھی نہ ہو (۳۱) کیونکہ ایسا کرنا ایک طرح کا فسق ہے پھر دین میں خیانت بھی ہے اور مسلمانوں سے دھوکہ بھی۔ (۳۲)

اسی طرح مفتی کو باطل شبہات کی بناء پر اپنی فاسد اغراض کے پیش نظر فتویٰ نہ دینا چاہیئے اور نہ ہی ذاتی منفعت کی خاطر حرام و مکروہ قسم کے حیلے بہانوں سے تخفیف کرنی چاہیئے۔

اسی طرح اسے کسی ایسے شخص کو مشکل اور تنگی میں نہ ڈالنا چاہیئے جس سے اسے کچھ نقصان پہنچا ہو گو یا مفتی کو یوں اپنے منصب سے گر کر فتویٰ نہ دینا چاہیے ہاں مگر جو اپنے دین و ایمان کو اتنا ہی حقیر و کمتر جانے تو وہ اس قسم کی حرکت کر گذرے گا۔ مگر اس کے بعد فتویٰ دینے کا مطلقاً مجاز نہ ہوگا۔ (۳۳)

اگر کسی ایک مسئلہ میں متعدد اقوال ہوں اور مفتی میں ان اقوال میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی استعداد نہ ہو تو اسے یونہی اندازے سے فتویٰ دینے کا حق نہیں کہ وہ جسے چاہے جس قول کے مطابق فتویٰ دے ڈالے، کیونکہ اسے شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ اپنی منفعت اور ذاتی پسند ناپسند کو مختلف اقوال میں معیار ترجیح ٹھہرالے اور اپنے پسندیدہ افراد یا دوست احباب کو تو اس قول کے مطابق فتویٰ دے جس سے اس کی غرض پوری ہو جائے اور دیگر لوگوں یا مخالفین کو اس کے برعکس قول کے مطابق

قاضی ابو الولید الباجی اپنے دور کے ایک مفتی (جو کہ اپنی منشا و مرضی کے مطابق فتویٰ دیا کرتا تھا) کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "اہل اسلام میں اس سلسلہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اس پر اجماع ہے کہ اس طرح فتویٰ دینا جائز نہیں" کیونکہ یہ تو شریعت سے مذاق ہوگا اور اس پر اصرار کرنا یا قائم رہنا بدتر فسق اور اکبر الکبائر گناہ ہے۔ (۳۴) ہاں اگر مفتی کسی شرعی مصلحت کی بنا پر سائل کو ایسا فتویٰ دے جس میں شدت ہو اور اس کے پاس اس کی تاویل بھی ہو تو تادیب و تنبیہ کے اعتبار سے جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے کسی نے قاتل کی توبہ کے قبول ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جبکہ ایک اور شخص نے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا ہاں اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے اپنے

دونوں اقوال پر مبنی دو مختلف و متعارض جوابات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ پہلا شخص جسے میں نے کہا کہ قاتل کی توبہ قبول نہیں ہوتی اس کی آنکھوں سے ارادۂ قتل ٹپک رہا تھا سو میں نے اسے قتل سے باز رکھنے کی غرض سے یہ کہا جبکہ دوسرا قتل کرنے کے بعد نادم ہو کر مسئلہ دریافت کرنے آیا تھا تو میں نے اسے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں کیا۔ (۳۵)

مفتی کو چاہیئے کہ جب اس کے اخلاق میں تبدیلی اور مزاج میں حد اعتدال سے تجاوز آجائے جیسا کہ گھریلو معاملات و تفکرات کی بنا پر ہونا ممکن ہے تو وہ ایسے حالات میں فتویٰ نہ دیا کرے ہاں اگر وہ خارجی عناصر کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے تو ایسی صورت میں اس کے فتویٰ دیتے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ (۳۶)

مفتی کو چاہیئے کہ وہ منصب افتار سنبھالنے سے پہلے اس بات کا اطمینان کرلے کہ اس کے پاس اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے بقدرِ کفالت سامانِ بود و باش ہے! بصورتِ دیگر لوگ اس کی معاشی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے اور مال و دولت کا لالچ دے کر اسے اپنے دباؤ میں لے آئیں گے چنانچہ وہ لوگوں کے لئے تر نوالہ ثابت ہو گا۔ اور اس مال کا خواہش مند رہے گا جو اوروں کے پاس ہے

مفتی کو چاہیئے کہ وہ اپنے گذر بسر کا اہتمام دیگر جائز ذرائع آمدنی سے کرے اور فتویٰ کا کام محض فی سبیل اللہ انجام دے۔ مفتی کو چاہیئے کہ اگر اس کے پاس بقدرِ کفایت سامانِ زیست نہ ہو تو حاکم سے وظیفہ قبول کرے۔ اور حاکم کو چاہیئے کہ وہ مفتی کا وظیفہ مقرر کرے تاکہ اس سے اس کی ذاتی ضروریات پوری ہو سکیں۔ (۳۷) اور وہ اس وظیفہ کے عوض افتار کی خدمات انجام دے سکے جو کہ فرض کفایہ بھی ہے اور مصالح عامہ میں سے ایک اہم ضرورت بھی۔

حافظ ابوبکر خطیب بغدادی نے اپنی کتاب الفقیہ والمتفقہ میں لکھا ہے کہ حاکم کو چاہیے کہ وہ تدریس فقہ اور منصب افتار پر فائز اشخاص کے وظیفہ کا انتظام کرے تاکہ انہیں اپنی ضروریات کے لئے کوئی کاروبار نہ کرنا پڑے۔ مفتی کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جانا چاہیے" پھر خطیب بغدادی نے اپنی سند سے ایک روایت نقل کی ہے، کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس قسم کی خدمت انجام دینے والے ہر شخص کو سو (۱۰۰) دینار سالانہ وظیفہ دیا کرتے تھے۔ (۳۸)

مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کے مقاصد!

جب کوئی سائل یا مستفتی کسی مفتی سے کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا یہ سوال تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہوتا۔

۱۔ سوال کا مقصد کسی مسئلہ میں واقعتاً اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ مفتی صاحب کا مسلک کیا ہے اور وہ کس امام کے مقلد یا پیروکار ہیں۔

۳۔ یہ معلوم کرنا کہ مفتی صاحب صورت مسئولہ میں اپنے امام مذہب کے قول کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی رائے کو۔

پہلی صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہو اور اسے یقین ہو کہ جو کچھ وہ جواب دے رہا ہے درست ہے۔ تو وہ سائل یا مستفتی کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے جواب دے، کہ اس کے بغیر اس کے پاس چارہ کار نہیں۔

دوسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ مفتی اپنے اس امام مذہب کے قول کے مطابق فتویٰ دے جس کا کہ وہ مقلد یا پیروکار ہے اور اس بات کا اطمینان کرے کہ جو قول وہ نقل

کر رہا ہے وہ واقعی اس امام کا ہے بھی یا نہیں۔ اور یہ کہ آیا وہ قول اس امام کا واقعی مذہب مشہور ہے یا نہیں۔

تیسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سائل کو ایسا جواب دے جو پوری محنت اور کوشش کے ساتھ کی گئی تحقیق کے بعد اس کے نزدیک راجح قرار پائے اور جس کے بارے میں اسے اطمینان ہو جائے کہ یہی صحیح ترین جواب ہے۔ اب اس صورت میں یہ سائل پر لازم نہیں آئے گا کہ اس نے محض قولِ مفتی پر اعتماد کیا بلکہ اسے فتویٰ پر عمل کرنے میں خوشی محسوس ہوگی کہ یہ خلاصۂ تحقیق ہے۔ (۳۹)

مفتی کی بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس سے کوئی مستفتی کسی چیز کے حلال و حرام ہونے کے بارے میں سوال کرے تو مفتی کو چاہیئے کہ اگر وہ حرمت کا فتویٰ دے رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی بتا دے کہ اس کے مقابل حلال اور جائز امر کیا ہے۔ تاکہ جب سائل پر ممنوع و ناجائز کا دروازہ بند ہو، ساتھ ہی جائز اور مباح کا دروازہ کھل جائے۔ ابن القیم کہتے ہیں "اس طرح کا عمل کوئی زیرک اور شفیق عالم ہی کر سکتا ہے۔ جسے منجانب اللہ توفیق نصیب ہو، اللہ اس کے نصیحت کرنے اور اس کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے والے کو اجر عطا فرمائے"۔ علماء میں اس طرح کا عالم ایک طبیب حاذق کی مانند ہے کہ جو مریض کو ایسی اشیاء کے استعمال سے روکتا ہے جو نقصان دہ ہوں اور ایسی اشیاء کے استعمال کی ہدایت دیتا ہے جو مفید ہوں۔ (۴۰)

ابوالبقاء الحسینی کہتے ہیں کہ جہاں تک علم و ارشاد کا تعلق ہے تو معلم کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ایک طبیب کی مانند ہو جو مریض کو شفایاب کرنے کے سلسلہ میں سرتوڑ کوشش کرتا ہے اور ایسا نسخہ اور علاج تجویز کرتا ہے جو مرض کے مطابق ہو نہ کہ مریض کے بتانے کے موافق۔ (۴۱)

آدابِ سوال و سائل: مستفتی کو ایسی حالت میں مفتی سے سوال نہ کرنا چاہیئے

جب مفتی پریشان ہو۔ یا کسی کام کو جانے کے لئے تیار ہو۔ یا کسی سوچ اور خیال میں گم ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ سائل کے سوال پر پوری توجہ نہ دے پائے گا اور نہ ہی صحیح طور پر جواب دے سکے گا۔ (۴۲) (جاری)

حواشی

(۱۵) القرافی ۔ الاحکام فی التمییز بین الفتاویٰ والاحکام ص ۲۶۶

(۱۶) الحصکفی، در المختار، ج ۴ ص ۴۸

(۱۷) ابن قیم، اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۹۱

(۱۸) النووی۔ المجموع۔ ج ۱ ص ۴۲

(۱۹) ابن قیم۔ اعلام الموقعین ۔ ج ۴۔ ص ۱۹۲

(۲۰) ایضاً ۔ ج ۴ ص ۱۷۴

(۲۱) ایضاً ۔ ج ۴ ص ۱۹۱ والموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۱۷۲

(۲۲) ابراہیم اللقانی ۔ اصول الفتویٰ ص ۸۷ (مخطوطہ)

(۲۳) ابن القیم ۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۵۰

(۲۴) القرافی۔ الاحکام فی التمییز بین الفتاویٰ والاحکام، ص ۲۴۱

(۲۵) ایضاً ص ۲۵۲

(۲۶) ایضاً ص ۲۴۹

(۲۷) ابن القیم۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۶۳

(۲۸) القرافی۔ الاحکام ص ۲۵۹

(۲۹) ایضاً۔ جلد ۴ ص ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۶۹۔

(۳۰) ایضاً۔ ص ۲۵۷

(۳۱) النووی۔ المجموع۔ ج ۱ ص ۴۱

(۳۲) القرافی، الاحکام، ص ۲۶۹؟

(۳۳) ابن فرحون۔ البقرہ، ج ۱ ص ۵۱ نیز ابن القیم۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۹۳۔ النووی۔ المجموع، ج ۱ ص ۴۶۔ المقسول۔ ج ۱ ص ۲۴

(۳۴) ابن القیم۔ اعلام الموقعین۔ ج ۴ ص ۱۸۳۔۱۸۴۔

(۳۵) النووی۔ المجموع، ج ۱ ص ۵۰ بحوالہ الصیمری

(۳۶) النووی۔ المجموع۔ ج ۱ ص ۴۶۔ ابن القیم۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۹۸۔

(۳۷) ابن القیم۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۷۸ نیز اللقانی اصول الفتویٰ قلمی نسخہ ۸۴

(۳۸) النووی۔ المجموع۔ ج ۱ ص ۴۶۔

(۳۹) ابن القیم۔ اعلام الموقعین ج ۴ ص ۱۵۳

(۴۰) ایضاً۔ ص ۱۹۸

(۴۱) ابوالبقاء، کلیات۔ ص ۳۶۸۔ ۳۶۹۔

(۴۲) النووی، المجموع۔ ج ۱ ص ۵۷۔

زمین کا کرۂ ہوائی

از جناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب سابق صدر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ہوا جس کے بغیر ہم تھوڑی دیر کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ مظاہر قدرت کا ایک پُراسرار مخزن ہے۔ اس کا علم نہ صرف ضروریات زندگی کے لحاظ سے بلکہ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی انتہا درجہ دلچسپ ہے۔ انسان پہلے ہوا کے طبعی خواص سے آگاہ ہوا۔ پھر اس سے ہوا چکی اور جہاز رانی میں مدد لینے لگا۔ دسویں صدی کے اختتام تک کسی کو کرۂ ہوائی کی وسعت کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ نور کی شعاعیں اس میں سے گزرتے وقت مڑ جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ابن ہثیم نے گیارہویں صدی کے ابتدائی قرن میں فلکی مشاہدات اور تجربوں کی مدد سے بتایا کہ کرۂ ہوائی میں ہوا کی کثافت اگر نیچے سے لیکر اوپر تک یکساں فرض کی جائے تو اس کی بلندی تقریباً ۵۵ میل ہوگی اور شفق ہوا میں آفتاب کی شعاعوں کے مڑنے سے پیدا ہوتی ہے جبکہ آفتاب فی الحقیقت افق کے نیچے ہوتا ہے اور جب تک آفتاب افق سے ۱۹ درجے نیچے نہ ہولے برقرار رہتی ہے۔ حالیہ تحقیقات سے متجانس کرۂ ہوائی کی بلندی ۴۵ میل برآمد ہوئی ہے اور شفق کی مدت کے متعلق پتہ چلا ہے کہ آفتاب افق سے تقریباً ۱۸ درجے نیچے رہنے تک قائم رہتی ہے۔ ان نتائج سے ظاہر ہے کہ ابن ہثیم کی تحقیقات قلتِ آلات کے باوجود کس قدر صحیح اور قابلِ تحسین تھیں۔

ہوا کی کیمیائی ترکیب کا علم اٹھارہویں صدی عیسوی کے تیسرے قرن سے شروع ہوا۔ سویڈن کے کیمیا داں شیلے نے ۱۷۷۳ء میں انگلستان کے پریسٹلی نے ۱۷۷۴ء میں آکسیجن کو علیحدہ کر کے اس کے خواص دریافت کئے اور بتایا کہ ہوا میں جلنے والی اشیا اس آکسیجن ہی کی بدولت جلتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ہوا کی دوسری گیسیں بھی دریافت ہوئیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہوا ان گیسوں کا آمیزہ ہے۔ نیٹروجن، آکسیجن، آرگون، کاربن ڈائی آکسائیڈ، ہیڈروجن، نیون، کرپٹون، ہیلیم، اوزون اور زینون۔ اس فہرست میں گیسوں کے نام انکی گھٹتی ہوئی مقداروں کی مناسبت سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ سب سے کم مقدار زینون کی ہے جو دس کروڑ مکعب فٹ ہوا میں صرف ۹ مکعب فٹ ہے لیکن اس کے باوجود کرۂ ہوائی میں آکسیجن کی تیزی کو ہلکا کرتا ہے۔ یہ دوسرے عناصر کے ساتھ ذرا مشکل ہی سے ترکیب کھاتی ہے اسی لئے دھاتوں اشیا زیادہ تر اسی کے مرکب ہوتے ہیں۔ ہم ہوائی گیسوں کے کیمیائی خواص پر وقت صرف کرنا نہیں چاہتے۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا آدمی ان سے واقف ہے یا ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ آرگون جو کسی عنصر سے بھی میل نہیں رکھتی۔ ان دنوں برقی چراغوں کے گولوں میں بھری جاتی ہے، جو عام طور پر گیس بھرے گولے کہلاتے ہیں ایس سے وہ جلد خراب ہونے نہیں پاتے۔ کیا عجب کہ آگے چل کر کرپٹون اور زینون بھی اس کام میں استعمال ہوں۔

ہیلیم گیس اس لحاظ سے بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ اس کو سر نارمن لاکیٹو نے اٹھارہ سو پینسٹھ سنہ عیسوی میں زمین پر دریافت ہونے سے پہلے آفتاب کے ضیائی کرہ میں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) طیف پیما کے ذریعہ دریافت کیا۔ زمین کے کرۂ ہوائی میں سر ولیم رمزے نے ۱۸۹۵ء میں اس کا پتہ چلایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ریڈیم، یورنیم، تھوریم وغیرہ جیسے تابکار عناصر کے جواہر کے مکسر یعنی از خود شکست و ریخت ہونے سے خارج

ہوتی ہے ممالک متحدہ امریکہ میں بعض جگہوں پر زمین میں گہرے سوراخ کھودے گئے ہیں جن میں سے یہ گیس بکثرت برآمد ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہیڈروجن کے سوا باقی تمام گیسوں سے ہلکی اور اشتعال ناپذیر ہے۔ اس لئے ہوائی جہازوں کو کرۂ ہوائی میں تیرانے کی غرض سے ڈبلوں میں بھر کر استعمال کی جاتی ہے۔

کرۂ ہوائی میں ہیلیم بیرونی فضا سے بھی داخل ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کی طرف دنیائے سائینس نے اب تک بہت کم توجہ کی ہے۔ جب شہاب ثاقب ہوا میں جلکر خاک ہو جاتے ہیں تو ان کی ہیلیم ساری کی ساری ہوا میں مل جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک شبانہ روز میں کم از کم بیس لاکھ شہاب ثاقب ہمارے کرۂ ہوائی میں جذب ہوتے ہیں اگرچہ ان کی مجموعی کمیت سے زمین کے ٹھوس حصہ میں لکھوکھا برس میں بھی کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوتا۔ تاہم گیس فضا میں ہیلیم کی مقدار ضرور کسی قدر بڑھ جانی چاہیئے آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اس درآمد کے باوجود ہوا میں ہیلیم کا تناسب کیوں مستقل رہتا ہے۔

نیون کے دلفریب سرخ رنگ کے برقی چراغوں سے ہر شہری واقف ہے اس لئے وہ بکثرت تشہیر کے کاموں میں استعمال ہو رہی ہے۔ کرۂ ہوائی کا دباؤ اگرچہ ابن ہیثم کو اچھی طرح معلوم تھا لیکن اس کی صحیح پیمائش ٹورِ یچلی نے سترہویں صدی کے ابتدائی قرن میں کی۔ اور رابرٹ بائل نے اس کے تیسرے قرن کے شروع میں ہوا کے پھیلاؤ سے متعلق اپنا مشہور کلیہ دریافت کیا۔

سطح زمین کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ تمازت آفتاب سے ہوا میں نقل و حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح طوفان باد و باراں کرۂ ہوائی کی گیسوں کو باہم دیگر خوب ملائے رکھتے ہیں۔ اس لئے سات آٹھ میل کی بلندی تک ہوا کی کیمیائی ترکیب میں کوئی فرق نہ آنا تعجب کی بات نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کوہ ایورسٹ کی ساڑھے پانچ میل کی بلندی طے کرنے کے بعد کرہ ہوائی کا آبی بخار تقریباً سب کا سب برف وغیرہ کی شکل میں خارج

ہوجاتا ہے اور سات میل کی بلندی پر تو اس کا شائبہ ہی رہتا ہے. لیکن انسان کو لے ہوئے یا اس کے بغیر اڑنے والے غباروں کے ذریعہ مختلف بلندیوں کی ہوا کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی تشریح سے پتہ چلتا ہے کہ ساڑھے بارہ میل کی بلندی تک بھی ہوا کی کیمیائی ترکیب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ اس کے اوپر آکسیجن کی کسی قدر کمی اور ہیلیم کی بیشی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اسٹیونز نے ۱۱ر نومبر ۱۹۳۵ء کو غبارہ میں ۱۳½ میل بلندی تک پرواز کی اور ایک خالی از انسان امتحانی غبارہ ریگنر کی نگرانی میں بمقام اسٹگارٹ ۳۱ر جولائی ۱۹۳۴ء کو ۱۹ میل بلندی کی ہوا کی خبر لے آیا۔ طیارہ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ بلند پرواز ریزی نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو کی جو ۱۰½ میل سے تجاوز نہ ہو سکی۔

امتحانی غباروں کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ بلندی کے ساتھ تپش میں کمی صرف ایک معین بلندی کی فضا تک ہی مشاہدہ ہوتی ہے جو ٹروپوپاز کہلاتی ہے۔ خط استوا پر اس کی حد ساڑھے دس میل ہے اور جوں جوں مقام کا عرض بلد بڑھتا جاتا ہے یہ بلندی گھٹتی ہے اور قطبین پر سات میل سے بھی کم تر رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی تیس میل بلندی تک تپش میں نمایاں کمی محسوس ہوتی۔ یہ فضا اسٹریٹوسفیر کہلاتی ہے اس کے اوپر تپش بجائے گھٹنے کے بڑھنے لگتی ہے۔

طیفی مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فضاء کے اوپر اوزون کی ایک پتلی پرت ہے جو آفتاب کے بنفشی رنگ سے کمتر طول موج والی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح ہماری آنکھوں کو ان کے مضر اثر سے بچاتی ہے ورنہ سب آنکھیں اندھی ہو جاتیں۔ اوزون آکسیجن کا ایک دوسرا اور اس سے زیادہ کیمیائی قابلیت والا روپ ہے جس کا سالمہ بجائے دو جواہر کے تین جواہر پر مشتمل ہے۔ جس بلندی پر ہوا کی تپش میں اضافہ شروع ہوتا ہے یعنی اسٹریٹوسفیر کے ختم پر وہیں سے غیر معمولی حدت کی آوازیں بھی جو سطح زمین سے منتشر ہوتی ہیں منعکس

ہو جاتی ہیں۔

یورپ کی گذشتہ بڑی جنگ میں جب فلینڈرز کے میدانوں پر توپیں سر ہوتی تھیں تو ان کی آواز ابنائے برطانیہ میں نہیں سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دور مقاموں یعنی انگلستان کے وسطی خطوں کے باشندے اس کو صاف طور پر سن پاتے تھے۔ یہ معمہ اس وقت حل ہوا جبکہ بلند پرواز استحانی غباروں کے ذریعہ اسٹریٹوسفیر کی بلائی فضا میں تپش کی ترقی کا پتہ چلا۔ اس ترقی تپش کی وجہ سے آواز کی موجیں مڑی چلی جاتی ہیں اور بالآخر منعکس ہو کر نیچے اتر آتی ہیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰ کیلومیٹر یعنی ۶۲ میل کی بلندی پر ہوا کی تپش ۶۰۰ درجہ مئی ہے۔ سابقہ جنگ میں جرمنی کی "بگ برتھا" یا پیرس پر گولے برسانے والی توپ کی دوری زد کا راز بھی تھا کہ اس کے گولے اسٹریٹوسفیر میں ۲۴ میل بلندی سے گزرتے تھے۔

شہاب ثاقب کی روشنی اور ان کی بلندی کے مطالعہ سے بھی لنڈیمان اور ڈاسن نے ۱۹۲۲ء میں نتیجہ اخذ کیا کہ اسٹریٹوسفیر کے اوپر تپش بڑھنی چاہیئے تاکہ اس کے اوپر کی ہوا ایک زیادہ کثافت کے خط کو سہار سکے ورنہ جس بلندی پر شہاب ثاقب دہکنے لگتے ہیں قلت کثافت کی وجہ سے دہک نہ سکیں گے۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ پچاس ساٹھ میل کی بلندی پر ہوا کا جسم بالکل ساکن ہے اگر چہ اس کے سالمات منفردہ طور پر نظریہ تحرک کے موجب ادھر ادھر ضرور اڑتے پھرتے ہیں لیکن شہاب ثاقب کی منور لکیروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہاں کی ہوا بھی اچھی خاصی رفتار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرتی ہے۔ شہاب ثاقب کوئی سو سوا سو میل کی بلندی پر دہکنے لگتے ہیں اور ساٹھ ستر میل کی اونچائی پر پہنچ کر عموماً بجھ جاتے ہیں۔ پچاس ساٹھ میل کی بلندی پر بعض اوقات راتوں میں روپہری رنگ کے چمکتے ہوئے ابر بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی ماہیت اور پیدائش کا راز ابھی حل نہ ہو سکا۔

لاسلکی خبر رسانی کے ابتدائی دور میں جب دریافت ہوا کہ اس کی موجیں زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باوجود اس کی کروی شکل کے منتقل ہوتی ہیں تو یہ ماننا پڑا کہ وہ بھی فضاء کی ایک کافی بڑی بلندی پر پہنچ کر منعکس ہو جاتی ہیں۔ اس خطہ کو ہیوی سائڈ کنیلی طبقہ یا ای لیئر کہتے ہیں جو عموماً ۷۰ میل کی بلندی پر واقع ہے یہاں ریڈیو کی بڑی موجیں ہی منعکس ہوتی ہیں۔ انعکاس کا سبب ہوا کا ریونائزیشن ہے یعنی اس کے جواہر کے منفی برق والے ذرات (الیکٹرون) مثبت برق والے ذرات (پروٹون) سے جدا ہونے لگتے ہیں۔ پس ریڈیو کی موجیں سیدھا جانے کے عوض مڑکر بالآخر نیچے اترآنے لگتی ہیں اسی وجہ سے اس خطہ کو ایونوسفیر بھی کہتے ہیں۔ ۱۴۰ میل کی بلندی پر ایپلٹن طبقہ یا (ایف) لیئر شروع ہوتا ہے۔ جہاں سے چھوٹے طول کی لاسلکی موجیں منعکس ہوتی ہیں۔

ایسے کئی تجربے کئے جاچکے ہیں جن میں ایک مقام سے بھیجا ہوا لاسلکی پیام زمین کے سارے محیط کے گرد کئی مرتبہ چکر لگا کر پھر اسی مقام پر صدائے بازگشت کی طرح بار بار سنائی دیتا ہے۔ ریڈیو کی موجوں کی رفتار نور کی رفتار یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے۔ اس حساب سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ ریڈیو کی موجیں زمین کے اطراف کتنے بار چکر لگا کر واپس آئیں۔

بالائی ہوا کے سکون اور پست تپش کے غلط مفروضوں کی بنا پر پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کرۂ ہوائی میں پانچ چھ سو میل کی بلندی پر ہیڈروجن اور ہیلیم کے سوا باقی سب اجزاء متفرق ہوں گے۔ لیکن طیف نمائی مشاہدات صاف بتاتے ہیں کہ یہاں بھی نیٹروجن اور آکسیجن ہی موجود ہیں مگر نہایت رقیق حالت میں ہماری زمین کے کرۂ ہوائی کے سالمات کی رفتار فرار صفر درجہ مئی پر ۷۰۴۱ میل فی ثانیہ ہے اگر رفتار سالمات اس کے

پانچویں حصہ یعنی ۴ر۱ میل فی ثانیہ سے کمتر ہو تو سالمے زمین کے دائرہ کشش سے کبھی بھی باہر نہ جاسکیں گے ہیڈروجن کے سالمات سب سے زیادہ تیز رفتار ہیں لیکن ان کو بھی اس معیاری رفتار تک پہنچنے کے لئے ۸۸ درجے مئی تپش درکار ہے۔ صفر درجہ پران کی حقیقی جذر اوسط مربع رفتار صرف ۱ر۱۵ میل فی ثانیہ ہے پس واضح ہے کہ موجودہ حالات میں سطح زمین کے قریب کسی گیس کا سالمہ فرار نہیں ہو سکتا لیکن کرۂ ہوائی کے انتہائی بلند خطوں سے ہیڈروجن تھوڑی بہت اب بھی فرار ہو رہی ہے۔

ہیلیم کی جذر اوسط مربع رفتار صفر درجہ مئی پر ۸۲ر میل فی ثانیہ ہے جو ۴ر۱ میل سے بہت کم ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس وقت بھی ہیلیم کرۂ ہوائی سے غائب ہوتی جارہی ہے اور اگر زمین کے تابکار اشیاء اور شہاب ثاقب سے اس کی تلافی نہ ہوتی تو اس کی مقدار مسلسل گھٹتی چلی جاتی۔ جس ذریعہ سے ہیلیم کے سالمات کی رفتار فراری رفتار سے بڑھ جاتی ہے اس کی تحقیق نہایت دلچسپ ہے۔ ہم فنی دشواریوں کے باوجود اس کو نہایت آسان طریقہ پر سمجھا سکتے ہیں۔ کرۂ افق کے انتہائی خوشنما مظاہر میں قطبین کی روشنی ہے جو زیادہ تر زمین کے شمالی و جنوبی مقامات پر اندھیری راتوں میں ابر سے پاک فضا میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ آسمان پر زمین کے مقناطیسی محور کے قطبین کے گرد ایک منور تاج نظر آتا ہے جس کا رنگ کبھی گلابی ہوتا ہے اور کبھی بنفشی۔ روشنی کبھی جھالروں یا پردوں کی شکل میں آویزاں نظر آتی ہے یکایک بجلی کی طرح کوندتی ہے۔ آن کی آن میں مدھم پڑ جاتی ہے اور پھر فوراً تازہ دم ہو کر آنکھ مچولی کھیلنے لگتی ہے۔ بعض اوقات یہ تماشا کمتر عرض بلد والی فضا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۸ء کی رات کو انگلستان کے سواحل پر اس کا جلوہ انتہا درجہ دلکش بیان کیا گیا جس کی تصدیق اس کے فوٹو گرافوں سے ہوتی ہے

سنہ ۱۸۶۰ء میں یہ منظر مصر اور ہندوستان میں بھی دکھائی دیا۔ ۲۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کی شب کو آسٹریلیا اور سنگاپور جیسے مقامات پر جو خط استوا سے صرف ایک درجہ شمال میں واقع ہیں اور سنہ ۱۹۲۱ء میں جنوبی بحر الکاہل کے جزائر ساموا میں جن کا عرض بلد ۱۳ درجہ جنوبی ہے اس کا جلوہ مشاہدہ ہوا۔

قطبی نور جو زمین کے سایہ میں دکھائی دیتا ہے نیلگوں ہے اور اس کا محل وقوع ۶۰ یا ۷۰ میل کی بلندی پر ہے۔ کسی مقام پر سورج افق سے کافی نیچے اتر آنے پر بھی زمین کی سطح سے چھ سو میل بلندی پر کی ہوا اس کے نور سے مستفیض ہو سکتی ہے اور اس وقت بحالت شب مقام مذکور پر جو قطبی روشنی مشاہدہ ہوتی ہے اور بھی زیادہ لطف اندوز ہوتی ہے اس کا رنگ گلابی ہے اور اس کے طیف میں آکسیجن اور نیٹروجن کے ایسے خطوط بھی مشاہدہ ہوتے ہیں جو عام طور پر ان گیسوں کی معمولی کثافت کی حالت میں ممنوع متصور ہیں۔ چھ سو میل کی بلندی پر ہوا اتنی رقیق ہے کہ سالمات و جواہر کا تصادم کبھی آدھے ثانیہ سے لیکر ۱۰۰ ثانیوں تک معطل رہتا ہے۔ سالمات یا جواہر (خصوصاً آکسیجن کے) جب نور کے ایک مخصوص طیفی خط کی توانائی کو خارج کرکے مجازاً مدت ہائے مرحہ تک ستالیتے ہیں تو کہیں دوسرے خط کی توانائی خارج ہو سکتی ہے ——— لیکن عین اس وقت اگر ہیلیم کا کوئی بھٹکتا ہوا سالمہ ان سے ٹکرا جائے تو آکسیجن کا جوہر بجائے طیفی خط کے ذریعہ اپنی توانائی کو خارج کرنے کے ہیلیم کے سالمہ کو اس شدت کی ضرب لگاتا ہے کہ وہ فراری رفتار سے زیادہ سرعت کے ساتھ زمین کے دائرہ اثر سے باہر نکل پڑتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زمین کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

اندھیری راتوں میں ابر سے خالی آسمان پر جو روشنی دکھائی دیتی ہے وہ فقط ستاروں ہی کی تنویر سے نہیں پیدا ہوتی اور نہ منطقۃ البروج کے نور ہی تک محدود ہے بلکہ ہوا

بس دن بھر کی جذب شدہ آفتاب کی روشنی ایک دوسرا جسم لے کر رونما ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے فوٹوگرافی کی تختی پر آکسیجن اور نیٹروجن کے ممنوعہ طیفی خطوط قطبی نور کے خطوط کی طرح اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ ایسے نور کے لئے غیر قطبی نور نام تجویز ہوا ہے

اس تقریر کے آغاز میں کرۂ ہوائی کے کیمیائی اجزاء کی جو تفصیل بتائی گئی وہ صرف دورِ حاضر ہی سے متعلق ہے۔ زمین کا مادہ جب آفتاب سے گیس کی شکل میں نکل کر منجمد ہونے لگا تو اس میں وہ تمام عناصر اسی تناسب میں موجود تھے جو آفتاب کے ضیائی کرہ میں ہیں۔ لیکن بہت جلد تیزی تپش کی وجہ سے مستقل گیسوں کے اکثر سالمات فرار ہو گئے۔ جب تک زمین کافی ٹھنڈی نہ ہولی اس کے گرد کرہ ہوائی پیدا نہ ہوسکا۔ بالآخر جو کرۂ ہوائی پیدا ہوا وہ زیادہ تر آبی بخار اور کاربن ڈائی آکسائیڈ ہی پر مشتمل تھا۔ آبی بخار رفتہ رفتہ سمندروں میں تبدیل ہوا اور اس کے بعد سے نباتات کا دور دورہ شروع ہوا۔ آفتاب کے کیمیائی شعاعوں کے زیر اثر نباتات ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ سے کاربن لے کر آکسیجن کو آزاد کرنے لگے اور اس طرح حیوانات کی زندگی کا سامان تیار ہونے لگا۔

شاہنامۂ فردوسی کا ایک قلمی نسخہ

صدر کتب خانہ واقع جامع مسجد بڑودہ، گجرات، میں شاہنامۂ فردوسی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ نسخہ ہذا چار ابواب پر مشتمل ہے اور یہ چاروں ابواب دو جلدوں میں مجلد ہیں۔ پہلی جلد جو باب اول پر مشتمل ہے کے صفحات کی تعداد ۱ تا ۲۴۶ ہے۔ اس کی کتابت ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۱ھ میں ہوئی۔ دوسری جلد جو باب دوم، باب سوم اور باب چہارم پر محتوی ہے کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۴۷ تا ۷۰۵ ہے۔ دوسرے باب (۲۴۷ تا ۳۳۳) کی کتابت صفر سنہ ۱۲۴۳ھ میں عمل میں آئی۔ تیسرا باب (۳۳۴ تا ۵۱۹) محرم سنہ ۱۲۴۴ھ میں لکھا گیا اور چوتھا اور آخری باب (۵۲۰ تا ۷۰۵) رمضان سنہ ۱۲۴۳ھ میں تحریر کیا گیا۔

اس نسخے کا سائز ۳۰٫۳ × ۲۴ × ۱۳٫۰۲ انچ ہے۔ اس کے کاتب کا نام مانک لال کھتری گجراتی ہے جو زین البلاد 'احمد آباد' کا رہنے والا تھا۔ نسخۂ مذکور کو سید معظم علی خنداں ابن میر معصوم علی، سابق لائبریرین، صدر کتب خانہ نے لائبریری کو بطورِ عطیہ عنایت کیا ہے۔

ڈاکٹر مقصود احمد
شعبۂ عربی، بڑودہ یونیورسٹی
بڑودہ ۔ ۲

تبصرۂ کتاب

نام کتاب : عمدۃ المغیث شرح اردو الفیۃ الحدیث

نام مصنف : مولانا محمد منظور نعمانی

شارح : مولانا مفتی محمد اصغر خادم تدریس و افتاء جامعہ عزیز العلوم ویٹ نغاز گجرات

قیمت : ۱۵۰/ روپے

سائز : $20 \times \frac{30}{8}$ - صفحات : ۴۵۶

ملنے کے پتے: مرکز و معارف۔ دیوبند ، دارالکتاب دیوبند

کتب خانہ رشیدیہ جامع مسجد دہلی، کتب خانہ عزیزیہ جامع مسجد دہلی

یہ کتاب عقائد، عبادات یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، معاشرت، معاملات، اذکار و دعاء و استغفار۔ درود و اخلاقیات وغیرہ کے موضوع پر نہایت ہی مفید اور بیش بہا تحفہ ہے جو عوام و خواص علماء اور اساتذہ و طلبہ کے لئے لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے۔

موصوف نے کتاب کی شرح میں سادہ زبان استعمال کی اور ان چیزوں کے اضافہ کا لحاظ رکھا ہے جس کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کتاب میں جو احادیث احکامات سے متعلق ان میں ائمہ اربعہ کا اختلاف مدلل اور تشفی بخش تحریر کیا ہے۔ خاص طور سے قرأۃ خلف الامام، رفع یدین رکعات وتر و تراویح۔ آمین بالجہر، بسم اللہ وغیرہ کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کتاب احادیث کی بڑی کتابوں میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

اس عالم دین شخصیت نے اس کتاب کو بڑی محنت و جاں فشانی کے عالم میں مرتب کیا ہے۔ اس کا آرڈر بڑی مقدار میں ارسال کریں۔
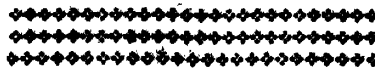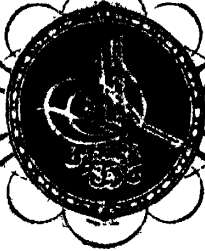
سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد

نومبر ۱۹۹۷ء

برہان

جلد ۱۲۱ شمارہ ۵

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

اس شمارے میں

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

گذشتہ ماہ نومبر کے وسط میں علی الصبح معصوم بچوں کو اسکول لے جانے والی بس وزیر آباد پل پر اس کی ریلنگ توڑتی ہوئی ایکدم جمنا میں گر گئی۔ جس میں تقریباً ایک سو بیس کے قریب بچے سوار تھے جو اپنے معمول کے مطابق اسکول جا رہے تھے۔ جیسے ہی بس جمنا میں گرتی ہوئی وہاں مچھلی پکڑنے والوں نے دیکھی فوراً ہی مستعدی کے ساتھ بس کی طرف تیرتے ہوئے وہ دوڑ پڑے اور انہوں نے روتے بلکتے، چیختے چلاتے بچوں کو ہر ممکن طریقہ سے جمنا میں پھنسی بس میں سے نکالنے کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ جس کے نتیجے میں خدا کے فضل و کرم سے اسی نوے بچے ڈوب کر موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۸ بچے جاں بحق ہوئے ہیں باقی سب صحیح و سلامت ہیں۔ یہ حادثہ کس قدر دردناک ہے اس کا اندازہ صرف اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان سطور کا راقم جب روز ناموں میں اس خبر کو پڑھ رہا تھا تو بے ساختہ آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ باوجود کوششوں کے بھی جذبات قابو میں نہ رہ سکے۔ یہ حادثہ کیوں ہوا اس کے بارے میں تو ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہی ہے کیونکہ دہلی حکومت نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھانے کا اعلان کیا ہے اس کی تحقیقات جو سامنے آئے گی اس کے بعد ہی کچھ اظہار خیال کیا جائے گا مگر اخبارات کی خبروں سے اتنا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ ڈرائیور کی ناعاقبت اندیشی، اتراہٹ، غیر ذمہ دارانہ پن، بچپن کی طفلانہ اُچھل کود والی ذہنیت، ہی کے نتیجے میں یہ حادثہ رونما ہوا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اسکول کے اسٹاف کے پڑھے لکھے لوگوں کو بار بار ڈرائیور کی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں یاد دلائی جاتی رہیں اس کے باوجود انہوں نے اس طرف کان دھرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پڑھے

والی جگہ پران پڑھ جیسے لوگوں کے طرز عمل کا نظارہ حیرت وشرم کی بات ہے۔ ایک بس میں دو ولیسوں کے بچوں کو ٹھونس ٹھونس کر بھرا ہوا تھا اور اس پر بائیس سالہ ڈرائیور کی غیر ذمہ داری ولاپرواہی سے بس چلانے کی عادت، اگر اسکول کے منتظمان میں ذرا بھی ذمہ داری کا مادہ ہوا اور وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مستعد وچوکس ہوں تو اس قسم کے حادثات سے بچا جاسکتا ہے۔ اور اسکول کے اساتذہ، منتظمان کو تو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے چوکس ومستعد ہونا ہی پڑے گا۔ کیونکہ اس سے تمام انسانیت کی فلاح وبہبودگی وابستہ ہے۔ وزیرآباد پل پر بس گرنے کے حادثہ میں کتنی ہی معصوم جانیں ضائع ہوگئیں کتنی ہی ماؤں کی گودیں اُجڑ گئیں کتنے ہی گھروں کے چراغ بجھ گئے کتنے ہی گھروں میں نہ معلوم کب تک ماتم چھایا رہے۔ یہ سب سوچ کر دل ودماغ میں لرزہ سا طاری ہوجاتا ہے رنج وغم میں ہر انسان ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتا ہے لیکن اس گھٹا ٹوپ اندھیری رنج وغم کی پت جھڑ میں انسانی فرض کے انجام دہی میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اللہ کے نیک بندوں کی بے مثال بہادری کی مشعل نے بھروسہ اعتماد وشرافت کی نظیر بھی ہم کو دکھا دی ہے جس سے کچھ ڈھارس بندھی یعنی مچھلی پکڑنے والے کشتی پر موجود عبدالستار اور اس کے ساتھی مزدور جن میں ہندو مسلمان دونوں ہی تھے ایکدم جمنا میں بچوں کو نکالنے کے لئے کود پڑے اور جمنا میں کودتے وقت انہوں نے اس کی مطلقاً پرواہ نہیں کی کہ وہ خود بھی جاں بحق ہوسکتے ہیں یا ان کی زندگی خطرے میں پھنس سکتی ہے۔ واہ! واہ! شاباش ہے عبدالستار اور اسکے ہندو مسلمان ساتھی مزدوروں کو، جنھوں نے صرف اور صرف انسانی فرض کو محسوس کرکے ڈوبتے معصوم بچوں کو جمنا کے پانی سے زندہ نکالا۔ اس پر انھیں جس قدر شاباشی دی جائے انعام واکرام سے نوازا جائے وہ کم ہی ہے۔ مقام شکر ہے کہ دہلی سرکار نے تو نہیں لیکن انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا گروپ نے "ہیرو ایوارڈ" جو اس نے اس حادثہ سے متاثر ہوکر پہلی دفعہ قائم کیا ہے اس کا

سب سے پہلا انعام عبدالستار کو دے کر عزت افزائی کی ہے عبدالستار نے اپنی نیک دلی کی بدولت اپنے ہندو مسلمان ساتھیوں کو بھی اس انعام میں شامل کر کے شرافت کا اعلیٰ مثال قائم کی ہے جس پر ہم کو دلی مبارکباد اور دعائیں دئیے بغیر نہ رہ سکے۔ سچا مسلمان اسی کو کہتے ہیں جو اطاعتِ رسول اللہ میں پیش پیش رہے۔

اس قسم کے حادثات کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے ہمارے ملک کی سڑکیں اس قدر خراب ہیں کہ اس پر گاڑیوں کا چلانا تو دور کی بات ہے سائیکل چلانا اور آدمی کا پیدل چلنا ہی جوکھم بھرا ہے۔ اس قدر خستہ حال سڑکیں ہیں جن پر ٹرک، ٹمپو اور انسانوں سے لدی پڑی بسیں جب چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ملک پر اگر خدا مہربان نہ ہوتا تو یہاں ہزاروں انسان صرف سڑکوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہو رہے حادثوں ہی کا شکار ہو کر روزانہ مر جاتے ــــ سڑکوں پر ہر جگہ گڈھے ہیں بیشتر علاقوں کی سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں جس پر ملبہ، پانی، کیچڑ اکٹا پڑا رہتا ہے۔ اور اس پر گائے بھینسوں کی چہل قدمی نے سڑکوں کو بالکل ہی غیر محفوظ بنا کر رکھ دیا ہے۔ جہاں جانوروں کی جانوں کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہو وہاں انسانی جانوں کی تو زبردست وقعت ہونی چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ صورت حال موجود نہیں ہے جانور کی جان عزیز ہے مگر انسانوں کی جان کی کوئی قدر و وقعت نہیں ہے یہ ہے سائنسی دنیا میں انسانوں کی دُرگت، جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ہم لوگ روزانہ نت نئی چیزیں ایجاد کر رہے ہیں ہوائی جہاز بنا ڈالے مگر ہوائی جہاز کسی حادثہ کا شکار نہ ہوں اس پر ہمارا کوئی قابو نہیں ہو سکا۔ کاریں نو سے نئے طرز کی بن کر سڑکوں پر چل رہی ہیں جس سے ٹریفک کا مسئلہ قابو سے باہر ہو گیا ہے۔ سڑکیں اتنی اور اتنی ہیں نہیں جس پر ہزاروں کاریں چلیں اور دوڑیں نتیجتاً سڑکوں پر کاروں کی رفتار انسانی

کے پیدل چلنے سے بھی کم ہو کر رہ گئی جو انسان کار سے جلد سے جلد مطلوبہ قیام پر پہونچنے
کے لئے نکلتا ہے وہ سڑکوں پر اپنی کار کو ٹریفک جام میں آگے بڑھانے سے بے بس
و مجبور ہے۔ گھنٹوں ہو جاتے ہیں لوگوں کو اپنی تیز رفتار کار سے اپنے مطلوبہ مقام پر
پہونچنے کے لئے کیونکہ سڑکوں پہ بے تحاشا ٹریفک کی وجہ سے جام رہتا ہے۔ سڑکیں کشادہ
ہونے کی بجائے تنگ ہیں اور وہ اسی زمانے کی ہیں جب کاریں تو ایک آدھ ہی ہوا کرتی تھیں
رکشا اور تانگیں ہی انسانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے استعمال میں آتے
تھے آج وہ مفقود ہیں اور اس کی جگہ سائنسی کمال نے تیز رفتار کاریں پیدا کر دیں مگر اس سے
انسانوں کا چین و سکون اور آرام سب غارت ہی ہو کر رہ گیا اور انسان ان سب چیزوں کا غلام
بن کر رہ ایک طرح سے مفلوج ہی ہو گیا ہے ۔ سڑکوں کو چوڑا کرنا سرکار کی ذمہ داری ہے
غیر ممالک کی حرص و ہوس نے ہم کو ان کی ضرورت کو اپنی ضرورت بنا ڈالنے کے مرض میں
جس طرح مبتلا کیا ہوا ہے اس پر افسوس اور صد افسوس کے اظہار کرنے کے علاوہ ہمارے
پاس کوئی چارہ ہی نہیں ہے ۔

اب تک سنا تھا کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے مگر اب سیاست کی بازیگری
کا ہم جو تماشہ دیکھ رہے ہیں وہ نہ صرف عجیب و غریب ہی ہے بلکہ لرزہ خیز ہولناکی سے
بھرپور ہے ۔ رونق سے بھرپور چہل پہل میں شہر اور بازاروں میں اپنی ضروریات کی
چیزیں خریدنے آئے عورتیں بچے جوان بوڑھے یکدم کسی انجان حادثے کا شکار
ہو جائیں تو اسے کیا کہا جائے گا ۔ درندگی، سفاکی، حیوانیت اور درندگی کا ہی نام دینا
پڑے گا کس قدر دکھ کی شرم کی، افسوس کی، رنج کی بات ہے کہ بھرے بازاروں میں
کسی درندہ صفت شیطان کی شیطانی کرتوت سے معصوم و بے گناہ انسان آناً فاناً تم

اجل بن گئے۔ یعنی بموں سے قیمتی جانوں کو ہلاک کر دیا جائے جو بھی بموں کے ذریعہ انسانی جانوں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے وہ شیطان ہے درندہ ہے مردود ہے ملعون ہے اور اس کی مذمت کے لئے تمام دنیا کی زبانوں میں جس قدر بھی ڈکشنریاں ہیں اور اس میں ایسے شیطانوں کی شیطانی حرکات کی ملامت و مذمت کے لئے جتنے بھی لفظ ہیں وہ سب ناکافی ہی ہیں ایسے شیطانوں کی مذمت و ملامت کے لئے ۔۔۔ قدرت اسے آخرت میں تو دے گی ہی سزا، دنیا میں ایسے مردود و ملعون کو قدرت سزا دے کر رہے گی یہ ہمارا ایمان و یقین ہے۔

ابھی ہم نے بم حادثہ پر اظہار خیال ختم کیا ہی تھا کہ ہماری نظر روزآنہ نو بھارت ٹائمس نئی دہلی مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۹۸ء کی پہلی خبر پر پڑ کر رہ گئی۔ اس خبر میں بتایا گیا ہے بہار میں سو سے زیادہ لوگوں کو رن ویر سینا نام کی کسی تنظیم نے ہتھیاروں سے لیس ہو کر گولیوں سے بھون ڈالا۔ ظاہر ہے کہ مرنے والے سب ہی بے گناہ ہوں گے ان پر اس قدر ظلم و ستم آن کی آن میں انہیں زندگی سے موت کے مقام پر پہنچا دیا گیا اس پر جتنا بھی انسانوں کو رونا آئے کم ہی ہے۔ آخر یہ درندگی اس قدر عروج پر کیوں ہو گئی ہے انسانیت کی جگہ درندگی اور شیطانیت نے کیوں سبقت حاصل کر لی ہے اس پر غور و توجہ کرنے کی ضرورت ہے دراصل ٹیلی ویژن کے پروگرام اور فلموں میں بڑھتے ہوئے مار دھاڑ کے واقعات چوری، زنا بالجبر، ڈاکہ ڈالنے کی ترکیبیں جس طرح فلموں میں دکھائی جاتی ہیں اس سے معاشرہ میں بگاڑ ہی بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ کسی سیاسی موقع پر یا کسی دیگر ماحول میں اسی سے ترغیب پا کر اس کو دہرایا جاتا ہے دشمن ملکوں کی کرتوتیں بھی اس شیطانیت میں معاون ہوتی ہیں۔ آج سب سے بڑا مسئلہ پوری انسانیت کے سامنے یہ ہی ہے کہ اس سے کس طرح نجات حاصل ہو۔ آخر انسانی نام سے جانے والوں کے ذریعہ سے انسانیت کی ہلاکت کو

کب تک برداشت کیا جاتا رہے گا۔

گیارہویں پارلیمنٹ کے لیے انتخابات میں کسی بھی جماعت کو اکثریت نہیں ملی تو تمام سیکولر جماعتیں متحد ہو کر حکومت بنانے پر کسی ایک پروگرام کے تحت مل بیٹھیں تو کانگریس جماعت نے ان سیکولروادی جماعتوں پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہنے کی نیت سے ان پر اپنی ہدائتیں تھوپنی شروع کر دیں جسے ان سیکولروادی جماعتوں نے اپنی توہین سمجھتے ہوئے کسی بھی حالت میں ماننے سے انکار ہی کیا ـــــ اب عالم یہ ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کے بارے میں غیر ممالک میں کیا ردعمل اور کیا خیال ہے اس کی تو ہمیں کوئی جانکاری نہیں ہے لیکن اپنے ملک کے عوام کے جو خیالات ہیں اس کے پیش نظر مستقبل میں پیش آنے والے حالات سے سب مشوش ہیں طرح طرح کے اندیشوں نے انھیں گھیرا ہوا ہے سیاسی جماعتوں اور سیاسی راہنماؤں نے ملک کی جو حالت کر دی ہے اس پر کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے بس اسی فکر و تردد میں گذر رہی ہے۔ روپیہ کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں اس قدر گر گئی ہے کہ ہر شخص غیر یقینی صورتحال کے احساس میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ اس قدر بھرشٹاچار کے واقعات سامنے ہیں کہ سیاست اور سیاسی جماعتوں اور اس کے راہنماؤں کے بارے میں عوام الناس کے خیالات پراگندہ ہو چکے ہیں ایک بار اڑیسہ کے انجہانی لیڈر بیجو پٹنائک نے کہا تھا کہ ہندوستان میں اب جب ہی سدھار ہو سکتا ہے جب یہاں ملٹری ساشن ہو جائے تو اس پر تمام لیڈروں نے بیجو پٹنائک کے خلاف چیخ چیخ کر زمین و آسمان ایک کر دیا تھا۔ مگر آج سیاست اپیاسی جماعتوں اور سیاسی راہنماؤں کے کردار و عمل کو دیکھ کر عوام کی اکثریت بیجو پٹنائک کے خیالات سے متفق ہوتی دکھائی دے رہی ہے تو اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں ہے۔ کون سی ایسی جگہ ہے جہاں بھرشٹاچار کی لعنت نے زور نہ پکڑ رکھا

ہے۔ اس نے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت کو خستہ بنانے میں زوردار رول ادا کیا ہے ابھی تک اس بیماری پر قابو پانے میں کسی کو بھی کامیابی نہیں ملی ہے چاہے وہ کوئی مذہبی اصلاحی تنظیم ہو یا کوئی فلاحی ادارہ ہو یا انسانی حقوق کی محافظ کوئی جماعت ہو، سب ہی بے بس و ناکام ہیں۔ آج ایڈس پر قابو پانے کے لئے بڑے بڑے پروگرام عمل میں لائے جارہے ہیں جبکہ یہ بیماری بھی ماڈرن انسان کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ننگی فلموں کی نمائش خوب دھڑلے سے کی جاتی تھیں اس وقت جو احتجاج کرتے تھے کہ اس کو بند کرو یہ معاشرہ کو دیمک کی طرح خراب کر دیگا اس وقت سب نے اس کو دقیانوسی کہہ کر مذاق اڑایا تھا آج جب اس کے مضر اثرات نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے تو اب اس کے تدارک کی طرف توجہ مرکوز ہوئی ہے لیکن اب مرض لاعلاج ہو گیا ہے اس لئے اب جاگنا بیکار ہے اب کوئی علاج ہی اثر کرنے کے قابل نہیں رہا ہے اسی طرح بھرشٹاچار ملک کے لئے کینسر بن چکا ہے اس کو دور کرنے کے لئے کیا تدبیر عمل میں لائی جائے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اگر یہاں اپنی سیاسی جماعت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر سوچنے سمجھنے کی تکلیف گوارہ کی گئی تو یہ سب ہی کے لئے مہلک ثابت ہوگی مستقبل میں کوئی جماعت اور کوئی لیڈر اور ملک کا کوئی فرد اس مضر بیماری کے مہلک اثرات سے بچ نہیں پائے گا یہ حقیقت سب کو ماننی پڑے گی اور اب ہی تسلیم کرنی پڑے گی ورنہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔

اسلامی دارالافتاء اور منصبِ مفتی

ایک تحقیقی مطالعہ

(قسط ۳)

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز ــــ (کراچی یونیورسٹی)

مستفتی کو کوئی ایسا مسئلہ دریافت نہ کرنا چاہیئے جو فی الواقع پیش ہی نہ آیا ہو یا نادر الوقوع ہو، یا دور از کار ہو۔ اسی طرح ایک عام مستفتی کو کسی ایسی چیز کے بارے میں نہ پوچھنا چاہیئے جو اس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو، اور اگر وہ اس قسم کے سوالات میں الجھے الجھاتے تو مفتی کو چاہیئے کہ وہ اس کے سوال سے صرفِ نظر (IGNORE) کرے اور اسے کوئی جواب نہ دے۔ ہاں اگر مستفتی کا مقصد اس سوال سے ایسے معاملات کا علم حاصل کرنا ہو جو اسے پیش نہیں آتے مگر وہ انہیں تحصیل علم اور تفقہ کی نیت سے اور اس خیال سے جاننا چاہتا ہے کہ جب کبھی اس طرح کے معاملات پیش آئیں تو پہلے ہی سے وہ جواب جانتا ہو یا اس سے ملتے جلتے مسائل پر ان جوابات کا اطلاق کر سکے تو مستفتی کو کافی و شافی جواب دیا جائے گا۔

اگر سوال کا سبب پیچیدہ مسائل یا متشابہات ہوں جس سے مستفتی کے ذہن میں شبہات نے جنم لیا ہو اور اس کا ارادہ ان شبہات کے ازالہ کا ہو جن میں اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا ہو تو اس صورت میں مفتی کو چاہیئے کہ وہ انتہائی شفقت سے مستفتی کا ذہن صاف کرے اور ایسا اسلوب اختیار کرے جو مستفتی کے ذہن اور عقل کو اپیل کرے کیونکہ مخلوقِ خدا کی ہدایت اہل علم پر فرض ہے جیسا کہ القرافی نے کہا (۴۳) کہ

جہاں کہیں بھی جواب کی مصلحت راجح ہو وہی اولیٰ ہے جیسا کہ ابن القیم نے بھی کہا ہے۔

سوال کیسے (PuT-u P) کیا جائے:

اگر مستفتی پر کوئی آفت ایسی آن پڑے جس کا حل وہ شریعت کے حکم سے چاہتا ہو اور اس کے شہر میں کئی مفتی ہوں اور وہ تمام مفتیوں کے جوابات ایک ہی کاغذ پر حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ایک بڑے سائز کا کاغذ لے جس پر تمام مفتیوں کے جوابات لکھے جا سکیں۔ پھر ادب و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جوابات کے سلسلہ میں سب سے پہلے عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ صاحب علم سے رجوع کرے پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ دیگر مفتی صاحبان کے پاس اپنا سوال لے جائے اور اگر وہ متعدد کاغذوں پر مختلف مفتیوں کی آراء و فتاویٰ حاصل کرنا چاہتا ہو تو پھر سوال کی نقول جسے چاہے پہلے بھیج دے اور جس کے پاس چاہے بعد میں لے جائے البتہ کاغذ اتنا بڑا ہو کہ سوال کے بعد اس پر مفتی مکمل فتویٰ تحریر کر سکے۔

سائل یا مستفتی کو چاہیئے کہ وہ اپنا سوال اس انداز سے لکھے کہ اس سے اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو اور جس مقصد کے لئے اس نے سوال لکھا ہے وہ پورا ہو سکے، اسی طرح الفاظ واضح اور جلی قلم سے لکھے ہوں ان میں کوئی پیچیدگی اور ہیر پھیر نہ ہو۔ اگر سائل ایک عام سا شخص ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنا سوال کسی ایسے شخص سے لکھوائے جو پڑھا لکھا ہو تاکہ سوال خوش اسلوبی سے لکھا اور پیش کیا جا سکے۔ (۴۴)

جواب کیسے مرتب کیا جائے:

سائل کے سوال کی حدود اور حاجت کے مطابق جواب دیا جائے اور سوال کی عبارت میں کوئی اضافہ کیا جائے نہ اس کے موضوع میں۔ جواب مختلف اقوال اور اختلافات

کے ذکر سے خالی ہونا چاہیئے کیونکہ مختلف اقوال ذکر کرنے سے مستفتی کے ذہن میں تشویش پیدا ہوگی اور وہ یہ نہ سمجھ سکے گا کہ کس قول پر عمل کرے۔ جواب دو ٹوک، واضح اور حصول مقصد کے لئے کافی ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ کسی اور بات کی ضرورت نہ رہے (۴۵)

اگر مستفتی نے صرف رہنمائی کی خاطر سوال کیا ہو تو اس کے سوال کا صرف مختصر جواب ہی کافی ہوگا۔ اس کے ساتھ دلائل اور حوالہ جات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یہ توقع ہو کہ جواب پر اعتراض یا اشکال وارد ہوگا تو پھر دلائل اور حوالہ جات جواب کے اندر ہی ذکر کرنے چاہئیں تاکہ جو کوئی حقیقت امر جاننا چاہے وہ حق اور صواب جان لے (۴۶) الصیمری نے کہا ہے "اگر کوئی عام آدمی سائل ہو تو دلیل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی پڑھا لکھا سوال کرے تو دلیل ذکر کر دی جائے (۴۷)

القرافی نے کہا ہے کہ جب استفتاء کسی بڑے واقعہ سے متعلق ہو جو دین کے کسی اہم معاملہ یا مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو تو مفتی کو چاہیئے کہ وہ مفصل جواب لکھے، اور حق واضح کرنے کے لئے مبالغہ سے کام لے اور فوراً سمجھ میں آنے والے دلائل ذکر کرے تاکہ فوائد حاصل اور مفاسد دور ہوں اور ایسے دلائل ذکر کئے جائیں جو شرعی/قانونی مفادات کو تحفظ فراہم کریں، مذکورہ صورت کے علاوہ اس قسم کا جواب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۴۸)

ابن القیم کہتے ہیں کہ جواب میں دلیل اور اس کے حوالہ جات کا حتی الامکان ذکر ہونا چاہیئے اور مستفتی کو بالکل روکھا اور پھیکا اور بلا دلیل و حوالہ فتوٰی نہ دینا چاہیئے اس رائے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض فتاویٰ سے استدلال کیا گیا ہے۔ (۴۹)

ابن القیم کا کہنا ہے کہ مفتی کو سائل کے سوال سے زیادہ جواب دینا جائز ہے (۵۰) اور انہوں نے اس پر صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے جو حسب

ذیل ہے:

"باب من اجاب السائل باکثر مما سال عنہ" یعنی سائل کو سوال سے زیادہ جواب دینا:

رہا معاملہ یہ کہ جواب کیسے لکھا جائے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جواب لکھتے وقت یہ خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ جواب میں کسی اور کی طرف سے کسی اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی جائے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس جواب میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کر دے جو اس جواب کے برعکس ہو یا گمراہ کن ہو، چنانچہ جواب کی تحریر میں نہ تو بین السطور کوئی جگہ چھوڑی جائے اور نہ کوئی نقص رہنے دیا جائے اور مفتی کو ایک ہی قلم اور خط سے فتویٰ تحریر کرنا چاہیئے کیونکہ خط بدلنے یا قلم بدلنے سے کسی کو فتویٰ میں جعل سازی و تزویر کا موقع مل سکتا ہے۔ خط واضح ہونا چاہیئے نہ زیادہ باریک نہ زیادہ بڑا کہ پڑھنے والے کو دشواری ہو یا ناگوار گزرے۔ (۵۱)

القرافی کہتے ہیں کہ اس طرح کی احتیاطی تدابیر کرنا ضروری ہے اور کسی قسم کی بدظنی جعل سازی وغیرہ کے راستے مسدود کرنا عمدہ اسلوب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "دع ما یریبک الی ما لا یریبک" (۵۲)

مفتی کسی قسم کا اضافہ کر سکتا ہے؟

اگر مستفتی یا سائل کا سوال ایسا عجیب ہو کہ جو غیر مانوس سا ہو تو مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک دم سے سائل کو ٹکا سا جواب دیدے بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ پہلے مقدمہ کے طور پر تمہید باندھے تاکہ سائل جواب سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی پوزیشن میں آجائے اور اس جواب پر عمل کرنے کو ذہنی طور پر تیار ہو جائے (۵۳) اگر سوال کا جواب ایسا ہو کہ جس سے سائل کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو مفتی کو چاہیئے کہ

وہ سائل کو متنبہ (خبردار) کرے تاکہ اس کا خیال اور ذہن غلط فہمی کی جانب نہ جائے(۵۴)
اگر سائل کے سوال میں کسی نص قرآن وسنت کا حوالہ دیا گیا ہو تو مفتی کو چاہیئے کہ وہ اپنے فتویٰ میں بھی اس نص کو نقل کرے اور جہاں تک ممکن ہو نص کے الفاظ ذکر کردے کیونکہ جو نص بھی شارع کے حوالہ سے ذکر ہوئی ہوگی اس میں کسی حکم کا بیان ہوگا۔ علاوہ ازیں اس میں حکم اور دلیل مذکور ہوں گے جو کہ موقع کی مناسبت سے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی موضوع پر مذکور نص خطاء، تناقض اور اضطراب سے پاک ہوتی ہے۔ (۵۵)

اگر سائل نے کسی خاص مسئلہ کے بارے میں سوال کیا ہو اور مفتی یہ محسوس کرے کہ اس کے سوال کو مزید اہم اور سودمند بنانے کے لئے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے تو وہ اپنے جواب میں اس طرح اضافہ کرے کہ سائل کا سوال بھی ضمناً آجائے اور جواب مفصل، جامع اور مفید تر ہو جائے۔ اگر اس طرح کیا جائے تو یہ فتویٰ کے کمالات میں سے اور مفتی کے ذی علم ہونے کی دلیل و علامت ہوگا، اسی طرح یہ اس بات کی بھی دلیل ہوگا کہ مفتی خیر خواہ ہے اور سائل کو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے مطمئن کیا ہے، اس سلسلہ میں جو عمدہ مثال پیش کی جا سکتی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ جو ایک سوال کو بیان کرنے کا بہترین انداز ہے۔ فرمایا:

"یسئلونک ماذا ینفقون"، اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں گے؟

پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم"۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ حسن سلوک

کے طور پر تم جو مال بھی خرچ کرو تو وہ ماں باپ قریبی رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے اور تم جو نیکی کرو تو بے شک اللہ اسے خوب جانتا ہے:

انداز جواب اور اسلوب دیکھئے کہ صرف اتنا بتا دینے کی بجائے کہ مسلمان کیا خرچ کریں؟ وہ تمام مصارف بھی بیان کر دیئے کہ جہاں جہاں مسلمانوں کو خرچ کرنا چاہئے اور اس مخصوص سوال کا جواب بھی اللہ نے مختصراً اس طرح دے دیا "قل العفو" آپ فرما دیجئے "جو آسان ہو"۔

منصب افتار اور علمار کرام!

اللہ رب العزت نے اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرمایا ہے: "یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات" تم میں سے جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے گا۔

نیز فرمایا: "ترفع درجات من نشاء وفوق کل ذی علم علیم: ہم جس کو چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر اس سے بھی زیادہ علم والا ہے۔

مختلف عصور و ممالک میں علمار کرام جن مختلف درجات پر فائز رہے ہیں ان کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ افتار مفتیوں کے کئی ایک نمونے پیش کرتی ہے اور اس کی وجہ مختلف ادوار میں فکر اسلامی میں انقلابات اور مد و جزر کا آنا ہے۔

پہلا نمونہ:۔ فقیہ کا نمونہ ہے، ایک ایسا فقیہ جو اجتہاد کے تمام امور و معاملات سے آگاہ اور واقف ہے، اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول کا عالم ہے، جو احکام میں اجتہادِ مطلق کا امین ہے، اور اس کا اجتہاد شریعت کے عام و خاص

اجمالی و تفصیلی دلائل سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسا نمونہ ہے جسے مثالی اور درجۂ اول کا نمونہ کہا جا سکتا ہے جو مجتہدین کو حاصل ہے جیسے آئمہ مذاہب اور فقہی مذاہب کے بانی علمار کرام۔

دوسرا نمونہ :۔ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جو مشہور فقہی مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے پھر اپنے امام مذہب کی رائے کے مطابق ہی اجتہاد و فتویٰ کے راستہ پر گامزن ہے۔ اسے اس بات کا یقین کامل ہے کہ اس کے امام نے جو کچھ کہا وہ صحیح اور اس نے جو اصول و قواعد مرتب کئے وہ اصح ترین ہیں۔ اگر اس کے پاس کوئی ایسے مسائل آجاتے ہیں جن میں اس کے امام کا کوئی قول یا رائے نہ ہو تو وہ از خود اس میں اجتہاد سے نہیں گھبراتا بلکہ قیاس کے ذریعہ وہ اپنے امام کے اقوال کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے امام کا نکتہ نظر اور دلائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نمونہ دوسرے درجہ میں ہے اور یہ بھی مجتہدین کے درجہ میں ہے جو ایک مذہب کے پابند اور اس میں رہتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں

تیسرا نمونہ :۔ یہ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جو اپنے امام مذہب کے اقوال و فتاویٰ اور ان پر اس کے دلائل پر قائم ہے۔ وہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف نہیں کرتا اور کسی بھی مسئلہ میں اگر اسے امام کی رائے مل جائے تو اسے ترجیح دیتا ہے اور خود سے مسئلہ میں تحقیق کرنے کے چکر میں نہیں پڑتا بلکہ اسی پر اکتفا کرتا ہے اور اس کا متبادل تلاش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اپنے امام کے استنباط کردہ مسائل کو کافی سمجھتا ہے یہ نمونہ تیسرے درجہ میں آتا ہے۔ یہ اجتہاد اور تقلید کا درمیانی درجہ ہے۔

چوتھا نمونہ :۔ یہ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جسے متفقہ فی المذہب کہا جاتا ہے

اور جو اپنے اوپر تقلید محض کو لازم کئے ہوئے ہے وہ امام اور اس کے اصحاب کے اقوال و فتاویٰ پر انحصار کرتا ہے اور امام مذہب کے بیان کردہ مسائل کو اصل و فروع میں پیش کرتا ہے، جب کبھی اس سے کسی مسئلہ میں بات کی جائے اور اس کے سامنے کوئی دلیل پیش کی جائے تو وہ یہ کہکر رد کر دیتا ہے کہ امام (فلاں) ہم سے زیادہ بہتر جانتے تھے اور ہم تو ان کی تقلید کرتے ہیں۔ اور ان کے فیصلوں سے تجاوز نہیں کرتے۔ یہ نمونہ چوتھے اور آخری درجہ میں ہے۔ (۲۰)

اس تجزیہ سے ثابت ہوا کہ مفتیٔ مقلد جو محض تقلیدِ محض پر قائم ہو۔ وہ دراصل حقیقی مفتیوں میں سے نہیں بلکہ ان کا قائم مقام ہے اور ان کی نیابت کا فریضہ انجام دینے کی وجہ سے مفتیوں میں شمار ہے، درحقیقت وہ اپنے امام اور مستفتیوں کے درمیان ایک واسطہ ہے۔ ابن القیم کہتے ہیں: "ان کے علاوہ اگر کوئی فقیہ ہے تو وہ ایک تھرڈ کلاس خودساختہ مفتی ہے جس نے اپنے آپ کو کام کے بندوں سے دور رکھا اور علماء کے درجہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایسا شخص جاہلوں میں سے ایک ہے۔"

مفتیٔ مقلد کس مذہب پر فتویٰ دے!

مذہبی امور پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ متفق علیہ یا مختلف فیہ مذہبی مسائل جو مدون یا مرتب ہو چکے ہیں حکم کے اعتبار سے پانچ طرح کے ہیں:

۱۔ ایسے مسائل جن میں اثباتِ حکم پر اتفاق ہے۔

۲۔ ایسے مسائل جن میں اکثر کے حکم کا اثبات اور کم کی نفی ہے۔ اور وہ مذہب مشہور کہلاتا ہے پھر جس میں دلیلِ قوی ہو وہ راجح قرار پاتا ہے۔

۳۔ ایسے مسائل، جن میں اثبات اور نفی کے دو قول ہوں اور برابر حیثیت کے

۴۔ ایسے مسائل جن میں اثبات کا حکم کم اور نفی کا زیادہ ہو ایسے مسائل کو مرجوح کہتے ہیں جو راجح اور مشہور کے مقابل ہے۔

۵۔ ایسے مسائل جن میں ایک یا دو نے اثبات کا حکم لگایا ہو اور باقیوں نے نفی کا۔ اسے شاذ کہتے ہیں۔

ان پانچ اقسام میں سے معاملات اور حقوق العباد میں فتویٰ دینا جائز ہے۔ بشرطیکہ قولِ متفق علیہ قولِ مشہور یا راجح ہر طرح سے برابر نوعیت کے ہوں اور ان میں ترجیح ممکن نہ ہو تو دو قولوں میں سے کسی ایک کے مطابق فتویٰ دیا جاسکتا ہے اور مرجوح قول پر صرف کسی ضرورت یا مصلحت کی بناء پر فتویٰ دیا جا جاسکتا ہے یا کسی امام کے کسی قول کی پہلے سے قائم ترجیح کے مطابق فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

قولِ شاذ پر فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔ اور اگر کوئی قول شاذ پر فتویٰ دے تو اس سے باز پرس کی جائے گی اِلّا یہ کہ عدلیہ کے قاضی حضرات اور مفتی کے منصب پر فائز اہلِ علم اس بات کی تصدیق کریں کہ قول شاذ پر دیا گیا فتویٰ مخصوصہ قابلِ عمل ہے۔ ایسی صورت میں یہ فتویٰ قول مشہور سے بھی مقدم ہوگا۔ باوجودیکہ بنیادی طور پر وہ قول شاذ پر ہے۔ بشرط یہ ہے کہ تصدیق کنندگان ایسے عادل اور ثقہ اہلِ علم ہوں جن کی فقہی امور میں پیروی کی جاتی ہو اور جنہیں فقہی معاملات کا خاصا تجربہ ہو، جب کبھی بھی قولِ شاذ پر دیئے گئے فتویٰ کو ناقابلِ عمل یا منسوخ قرار دیا جائے گا تو خود بخود اس کے تمام دلائل بھی ناقابلِ عمل ہوں گے اور لائق اعتبار نہ رہیں گے اور قول مشہور کی طرف از سرِ نو رجوع کرنا ہوگا۔ (۵۸)

التسولی نے القرافی کا ایک قول بیان کیا ہے کہ مجتہد کو قولِ راجح کے سوا فتویٰ دینا جائز نہیں جبکہ مقلد کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنے مذہب میں قول مشہور پر فتویٰ

دے اگرچہ وہ قول خود اس کی نظر میں راجح نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ اس پر اپنے امام کی پیروی لازمی ہے۔ البتہ ابن القیم کا خیال ہے کہ مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے اعتقاد اور یقین کے خلاف فتویٰ دے البتہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے قولِ راجح ہی کو بیان کرے کیونکہ اس پر عمل کرنا ہی اولیٰ اور افضل ہے۔ (۵۹) امام الجوینی نے کہا ہے کہ کسی مفتی کو اپنے امام مذہب کے قول کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں۔ ہاں مگر یہ کہ وہ کسی دوسرے مذہب میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہو اور اس کے تمام اسرار ورموز سے واقف وآگاہ ہو۔ (۶۰)

اگر کسی مفتی نے فتویٰ دیا اور فتویٰ صادر ہو جانے کے بعد اس پر واضح ہوا کہ یہ اس کے امام مذہب کی نصوص کے خلاف ہے تو مقلد ہونے کی صورت میں اسے فوراً اس سے رجوع کر لینا چاہیئے کیونکہ اس کے امام مذہب کی بات اور دلیل اس کے لئے وہی حکم رکھتی ہے جو کسی مجتہد بالذات کے لئے نصِ شارع (۶۱) ہاں اگر اس پر یہ واضح ہو جائے کہ اس کے امام کی رائے مخالف نص اور اجماع ہے۔ یا قیاسِ جلی کے خلاف ہے تو ایسی صورت میں امام کی رائے پر فتویٰ دینا حرام ہے اور اس سے اس کے امام کی شان میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اجتہاد میں خطا واقع ہونے سے گناہ لازم نہیں آتا جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "حاکم اگر اجتہاد کرے اور اس میں غلطی کر بیٹھے جب بھی اسے ایک اجر ملتا ہے اور اگر وہ اجتہاد کرے اور صحیح حل تک پہونچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے۔" (۶۲)

تاہم ایسی معمولی باتیں جن کے بارے میں مذہب (مخصوص) میں کوئی نص نہ ہو تو ان میں پہلی بار ہی تحقیق کرنا ہوگی اور مفتی کے لئے امام یا اس کے اصحاب کے اقوالِ منصوصہ سے ہٹ کر بحث وتحقیق اور تخریج جائز ہوگی جبکہ اسے اپنے امام مذہب

کے قواعد و ضوابط کا علم ہو اور ان تمام دلائل و قیاسات سے واقف ہو جن سے امام مذہب نے کام لیا ہے، اور اگر اس میں یہ استعداد نہ ہو تو پھر بلا وجہ وہ اس بکھیڑے میں نہ پڑے جس کا وہ اہل نہیں۔ القرافی کہتے ہیں: "مفتی کو چاہیئے کہ اگر اس کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے بارے میں نص نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اجماع کے قواعد پر غور و فکر کرکے دیکھے کہ اس کی جو صورت نکلتی ہوئی نظر آئی ہے اس میں اور اصل میں کیا فرق ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ اصل اور صورت مخرجہ میں بہت زیادہ فرق واقع ہو رہا ہے تو تخریج مسئلہ سے اجتناب کرے کیونکہ قیاس مع الفارق باطل ہے جس طرح کسی مجتہد کے لئے قواعد شرع پر قیاس مع الفارق ممنوع ہے اسی طرح کسی مقلد کا قیاس مع الفارق درست نہیں کسی مفتی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر منصوص کو منصوص پر مقدم جانے یا ترجیح دے ماسوائے اس صورت کے کہ اسے اپنے مذہب کے قواعد اور اجماع کے ضوابط پر کامل دسترس ہو (۶۳)　(جاری)

حواشی

(۴۳) القرافی۔ الاحکام، ص ۲۸۲، ۲۸۳، ابن القیم، الاعلام ج ۳ ص ۱۹۳، النووی المجموع ۱ ص ۴۳

(۴۴) النووی۔ المجموع۔ ج ۱ ص ۵۔

(۴۵) ابن القیم۔ الاعلام۔ ج ۴ ص ۱۵۴

(۴۶) القرافی۔ الاحکام۔ ص ۲۵۷، ۲۶۶، ۲۶۸

(۴۷) النووی۔ المجموع، ج ۱ ص ۵۲

(۴۸) القرافی، الاحکام۔ ص ۲۶۹

(۴۹) ابن القیم۔ الاعلام۔ ج ۴ ص ۱۴۰، ۱۴۱

(۵۰) ایضاً　ج ۴ ص ۱۳۸

(باقی ص ۳۲ پر)

مقالہ

مولوی محمد عمر فاروق
میر واعظ کشمیر

یہ مقالہ بین الاقوامی اجلاس برائے امور دعوت ندوۃ العلماء دارالعلوم لکھنؤ میں ۱۳ر نومبر کو ہزاروں مندوبین کے سامنے پڑھا گیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ. وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ. اَمَّا بَعْدُ قَالَ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی فِی الْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ. اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور تم سے اسلام دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا"

جناب صدر، علمائے اسلام، عمائدین ملت، گرامی قدر حاضرین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں سب سے پہلے ایشیا کی عظیم تاریخی اور ممتاز علمی دانشگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں مفکر اسلام، داعی کبیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی الندوی دامت برکاتہم کی زیر سرپرستی ایک نہایت ہی اہم موضوع سے متعلق نمائندہ کانفرنس کے انعقاد پر منتظمین کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ ہم سب کے ارادوں میں خلوص، دینی کوششوں میں برکت اور ہماری مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔

بلاشبہ اس عظیم الشان اجتماع کا سہرا ہم سب کے مخدوم حضرت مولانا دامت برکاتہم

کے سر ہے۔ جو ناتوانی اور پیرانہ سالی کے باوجود شب و روز دینی و دعوتی مشن کی خاطر ہمہ تن مصروف ہیں ہنگ ہے سے

ہوا ہے گو تند و تیز مگر چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جسے حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

میری دلی خواہش ہے جس مبارک اور احسن مقصد کے لئے دور دراز علاقوں، دنیا بھر کے ممالک اور خطوں سے ہم سب محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کی خاطر وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہم اس میں ہر طرح کامیاب ہوں۔

محترم حضرات! ماشاء اللہ! میں دیکھ رہا ہوں کہ اس اہم اور نمائندہ اجلاس میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے تقریباً اہل علم، فضلاء اور دانشور شریک ہیں۔ اہل علم کا بڑا طبقہ دور دراز علاقوں سے چل کر یہاں پہونچ گیا ہے، حضرت مولانا کے خلوص، للٰہیت جدو جہد اور جذبۂ صادق نے ہم سب کو یہاں جمع کر دیا ہے۔ جس میں کشمیر کی برف پوش پہاڑوں سے گذر کر آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔

آپ جانتے ہیں مجھے وہ کونسی طاقت ہے جو کھینچ کر لائی ہے اور سفر کی زحمت کو رحمت سمجھ کر حاضر ہو گیا ہوں۔ میں فخر اور مسرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ طاقت اسلام کی ہے۔ وہ قوت کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ بلاشبہ اسلامی رشتہ میں بے پناہ طاقت اور کشش ہے۔ دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ سکتے ہیں، ختم ہو سکتے ہیں، مگر دین اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت ختمی مرتبت جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا سب سے گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک، رسولؐ ایک، کتاب ایک، قبلہ و کعبہ ایک، دین و مذہب ایک۔ کلمۂ اسلام نے ہم سب کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے ہم سب ایک تسبیح کی مانند ہیں، آج اسی کی برکت سے ہم سب یہاں جمع ہیں۔

حاضرین! یہ حقیقت خوب ذہن نشین کرلیں کہ ساری دنیا کے مسلمان آپس میں باہم بھائی بھائی ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ۔ ہمارے عقیدۂ توحید ورسالت نے سارے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر رکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ بین الاقوامی حالات، مسائل اور مختلف چیلنجز کے پیش نظر اس رشتۂ اخوت ودینی کو مزید زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔

بہرحال قرآن مقدس کی ابھی جو آیت کریمہ میں نے خطبہ میں تلاوت کی ہے اس میں اس بات کی صراحت کردی گئی ہے۔ کہ اللہ رب العالمین نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دینِ قیم کو مکمل کر دیا ہے۔ اور انسانوں کے لئے تا قیام قیامت جس قدر نعمتوں کی ضرورت ہوسکتی ہے، وہ ساری کی ساری پوری کر دی ہیں اور بندوں کے لئے دینِ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کے قوانین دستورِ زندگی ہیں اور یہ دین ایک ابدی اور دائمی دین ہے۔ سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے اس دین کی تبلیغ کی اور سبھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں خدا کے بندوں تک پہونچایا۔

آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہیں۔ آپؐ کی ذات ستودہ صفات پر دین کی تکمیل ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تکمیل کا باضابطہ اعلان فرمادیا۔ اور رہتی دنیا تک ایسے اصول وضوابط طے فرمادیئے گئے جو انسانوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے رہے ہیں۔

بزرگو! قرآن وحدیث، اجماع امت اور پوری ملت اسلامیہ اس بات پر متفق ہیں اور اس میں کوئی شک وشبہ اور ابہام نہیں ہے۔ کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ؐ

صرف تمام عالمین کے پیغمبر ہیں، جن و بشر، شجر و حجر اور بحر و بر کے پیغمبر ہیں، بلکہ ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کے آخری فرستادہ اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بدقسمتی سے جس صدی اور دور سے ہم لوگ گذر رہے ہیں، یہ ایک فتنے اور ارتداد کا دور رہا ہے لیکن الحمد للہ علمائے حق ہر طرح کے فتنے کی سرکوبی سے کسی بھی وقت ہر گز غافل نہیں رہے، اور آج بھی نہیں ہیں۔

ماضی میں صیہونی اور طاغوتی قوتوں کی گہری سازش کے تحت جب آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا تو برصغیر کے چوٹی کے علماء، خاص طور پر وادیٔ کشمیر کے ایک بطلِ جلیل اور گلِ سر سبز، دنیائے اسلام کے عظیم محدث و مفکر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے معتمد اور قابلِ فخر شاگردوں کی ایک زبردست ٹیم کے ساتھ میدانِ عمل میں کود پڑے اور مرزا کی جھوٹی نبوت کے دعووں کی قلعی کھول کر رکھدی اور برصغیر کے مسلمانوں، عالمِ اسلام اور امتِ مسلمہ کو زبردست اور طاقتور لٹریچر، مواد اور کتابوں کے ذریعے اس فتنۂ عظیم کی زہرناکی سے خبردار کیا۔ اس ضمن میں وادیٔ کشمیر میں ردِ قادیانیت اور تحفظِ ختمِ نبوت کے حوالہ سے میرواعظین کشمیر خاص طور پر میر واعظ مولوی احمد اللہ صاحبؒ اور مہاجرِ ملت میرواعظ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے تاریخی رول کو بھی ہر گز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی) کے تئیں ہمارے عقائد کی تفصیل خود شہیدِ ملت میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحبؒ اپنی دینی، دعوتی اور اصلاحی تصنیف "اسلام کی بنیادی تعلیمات" میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رسالت و نبوت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات سے کی گئی۔ دوسرے حضرات صرف رسول اور پیغمبر تھے۔ اور آپؐ

پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین ؐ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عام ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے۔ آپ ؐ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ ساری دنیا اور تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جس مالک و خالق نے اپنے دوسرے تمام رسولوں کو بھیجا تھا اور جس نے آپ ؐ کو بھی اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے" یہ اسی کا اعلان ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط اور وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔
(سورہ سبا)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ط (اعراف)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک ایسی امتیازی اور نمایاں صفت ہے جو آپ کے لئے ہی خاص ہے۔ آپ ؐ سے پہلے جو انبیاء ؑ بھی آئے اُن کا دائرہ کار محدود اور خاص زمان و مکان کے لئے تھا۔ آپ ؐ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

"كُلُّ نَبِيٍّ كَانَ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ
(مسلم شریف) حضرت امام بوصیری ؒ فرماتے ہیں: ؎

مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ　　وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمٖ
فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِىْ خَلْقٍ وَّفِىْ خُلُقٍ　　وَلَمْ يُدَانُوْهُ فِىْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمٖ

حقیقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالاصل ہے جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوت بالتبع ہے یعنی اصل اور حقیقی نبوت کا جوہر آپ ؐ کی

ذاتِ گرامی میں موجود ہے۔ دیگر انبیاء علیہم السلام اسی ذات کے خوشہ چین اور اسی گل کے گلچیں ہیں۔ (اسلام کی بنیادی تعلیمات ص ۱۸)

نبوت محمدی کی خاتمیت کے ضمن میں شہیدِ ملت لکھتے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر، حاملِ وحی ربانی اور رسالتِ خداوندی کے آخری علمبردار ہیں۔ سردارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی رسالت اور ختمِ نبوت کے اقرار سے ہی نجات اور انکار سے گمراہی اور ہلاکت ہے۔ اب قیامت تک علماء و خلفاء (جو آپ کی شریعت کے حامل اور آپ کی تعلیمات کے ترجمان ہیں) کے وجود سے دین اور شریعت کی ترجمانی ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا تاج رکھ کر منصبِ نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں آپ کے ختمِ نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۔ (الاحزاب)

ترجمہ:۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مردوں کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

تشریح:۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کو بیٹا مت جانو، ہاں اللہ کے رسول ہیں، اس لحاظ سے سب ان کے روحانی بیٹے ہیں۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگ گئی بس جن کو ملنی تھی مل چکی۔ اس لئے آپ کی نبوت کا دور سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔ آپ غایت اللہ کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ سرکار دو عالم

کی رسالت اور ختم نبوت کی تصدیق پر منحصر ہے: (ص ۹)

ختم نبوّت کی مثال: چنانچہ سیدنا حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَہٗ وَاَجْمَلَہٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَۃٍ مِنْ زَاوِیَۃٍ۔ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِہٖ وَیَعْجَبُوْنَ وَیَقُوْلُوْنَ ھَلَّا وُضِعَتْ ھٰذِہِ اللَّبِنَۃُ قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضورؐ کی خصوصیات "یوں تو آپؐ سارے رسولوں کے سردار اور سالار کارواں ہیں۔ آپؐ نے جن خصائص کا ذکر اپنی زبان فیض ترجمان سے فرمایا ہے ان میں ختم نبوّت کا مسئلہ بھی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ارشاد فرمایا:

فضلت علی الانبیاء بستۃٍ اعطیت جوامع الکلم ونصرت بالرّعب واحلت لی الغنائم وجعلت لی الارض مسجدا وطھوراً وارسلت الی الخلق کافۃً وختم بی النبیون (مسلم)

حضرت محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانیؒ کبریت احمر میں اس مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں:

وَخُتِمَتْ بِہِ الرِّسَالَۃُ وَالدَّلَالَۃُ وَالْبِشَارَۃُ وَالنِّذَارَۃُ وَالنُّبُوَّۃُ۔

حضرت جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی کشمیری فرماتے ہیں: ؎

ختم رسل پادشہہ انبیار خاک درش تاج سر اولیار
سیّد عالم سند عالمین جاءَ الینا بکتابٍ مبین

حاضرین! جیساکہ میں نے عرض کیا کہ ختم نبوت کا مسئلہ متفق علیہ مسئلہ تھا اور ان شاء اللہ تاقیام قیامت رہے گا۔ اس میں کسی قسم کے تساہل اور سودا بازی کی ہرگز اور قطعی گنجائش نہیں۔ چنانچہ نصف صدی کی ہماری دینی و ملّی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مرزا قادیانی کا کامیاب ترین تعاقب علمائے امّت نے ہر جگہ اور ہر مرحلہ پر اس طرح کیا کہ یہ فتنہ تقریباً مردہ ہوچکا تھا اور عام مسلمان بھی اس فتنہ سے محفوظ ہوگئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے کچھ عرصہ سے مرزائی نہایت منظم طریقے سے، منصوبہ بند پلان کے ساتھ نہایت سرگرم ہوگئے ہیں۔ اور اس وقت مسلم ممالک کے بجائے ان کی سرگرمیاں ان ملکوں میں زیادہ ہیں جو جمہوریت کی بنا پر ہر قسم کی سرگرمیوں کی کھلے عام اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے غیر مسلم ممالک میں جمہوری حقوق کے سائے میں اپنی مہم چلاکر مفلوک الحال، پسماندہ یا ناواقف مسلمانوں کو مرزائی بنانے کی سعی میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ بھارت کے مختلف ریاستوں کے ساتھ مصدقہ اطلاعات کے مطابق جموں وکشمیر میں بھی مرزائی مبلغین سرگرم ہوچکے تھے۔ لیکن الحمدللہ اجتماعی طور پر بروقت کارروائی کے سبب بڑی حد تک رائے عامہ بیدار ہوگئی۔ جموں وکشمیر کی قدیم تعلیمی انجمن" ادارہ "انجمن نصرۃ الاسلام" کے زیر اہتمام ہم نے وادی کے کم وبیش سبھی دینی و دعوتی تنظیموں کے سربراہوں، سرکردہ علماء کرام، مفتیان عظام کا ایک نمائندہ اجلاس طلب کیا اور متفقہ طور قرارداد پاس کراکر اسے مؤقر اخبارات میں شائع کرایا۔ قرارداد کے الفاظ میں کہا گیا کہ:-

پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین ؐ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عام ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے۔ آپ ؐ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ ساری دنیا اور تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جس مالک و خالق نے اپنے دوسرے تمام رسولوں کو بھیجا تھا اور جس نے آپ ؐ کو بھی اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے" یہ اسی کا اعلان ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (سورہ سبا)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ۔ (اعراف)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک ایسی امتیازی اور نمایاں صفت ہے جو آپ کے لئے ہی خاص ہے۔ آپ ؐ سے پہلے جو انبیاءؑ بھی آئے اُن کا دائرہ کار محدود اور خاص زمان و مکان کے لئے تھا۔ آپ ؐ کا ایک ارشاد گرامی ہے!

"كُلُّ نَبِیٍّ كَانَ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلٰی كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ (مسلم شریف) حضرت امام بوصیریؒ فرماتے ہیں:

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَمِنْ عَجَمٍ

فَاقَ النَّبِیِّیْنَ فِیْ خَلْقٍ وَفِیْ خُلُقٍ وَلَمْ یُدَانُوْهُ فِیْ عِلْمٍ وَلَا كَرَمٍ

حقیقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالاصل ہے جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوت بالتبع ہے یعنی اصل اور حقیقی نبوت کا جوہر آپ کی

ذاتِ گرامی میں موجود ہے دیگر انبیاء علیہم السلام اسی ذات کے خوشہ چین اور اسی کل کے جزو ہیں۔ (اسلام کی بنیادی تعلیمات ص۴۰)

نبوت محمدیؐ کی خاتمیت کے ضمن میں شہید ملتؒ لکھتے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر، حامل وحی ربانی اور رسالت خداوندی کے آخری علمبردار ہیں۔ سردار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی رسالت اور ختم نبوتؐ کے اقرار سے ہی نجات اور انکار سے گمراہی اور ہلاکت ہے۔ اب قیامت تک علماء و خلفاء (جو آپؐ کی شریعت کے حامل اور آپؐ کی تعلیمات کے ترجمان ہیں) کے وجود سے دین اور شریعت کی ترجمانی ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا تاج رکھ کر منصب نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کردیا گیا۔ قرآن مجید میں آپؐ کے ختم نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۔ (الاحزاب)

ترجمہ:۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مردوں کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والا ہے۔

تشریح:۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو بیٹا مت جانو، ہاں اللہ کے رسول ہیں، اس لحاظ سے سب اُن کے روحانی بیٹے ہیں۔ آپؐ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مُہر لگ گئی بس جن کو ملنی تھی مل چکی۔ اس لئے آپؐ کی نبوت کا دَور سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔ آپؐ غایت اللہ کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ سرکار دو عالمؐ

پیغمبر ہونے کے ساتھ ساتھ خاتم النبیین ؐ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عام ہے۔ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ آپ ؐ کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے۔ آپ ؐ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ ساری دنیا اور تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ جس مالک و خالق نے اپنے دوسرے تمام رسولوں کو بھیجا تھا اور جس نے آپ ؐ کو بھی اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے" یہ اسی کا اعلان ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا. وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(سورۃ سبا)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ○ (اعراف)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک ایسی امتیازی اور نمایاں صفت ہے جو آپ کے لئے ہی خاص ہے۔ آپ ؐ سے پہلے جو انبیاء ؑ بھی آئے اُن کا دائرہ کار محدود اور خاص زمان و مکان کے لئے تھا۔ آپ ؐ کا ایک ارشاد گرامی ہے:

"كُلُّ نَبِيٍّ كَانَ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ

(مسلم شریف) حضرت امام بوصیری ؒ فرماتے ہیں:

مُحمدٌ سیدُ الکونینِ والثقلینِ والفریقینِ مِن عُربٍ ومن عجمٖ

فاقَ النبیینَ فی خَلقٍ و فی خُلقٍ ولَم یدانُوہُ فی عِلمٍ ولا کَرَمٖ

حقیقت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بالاصل ہے جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوت بالتبع ہے یعنی اصل اور حقیقی نبوت کا جوہر آپ کی

ذاتِ گرامی میں موجود ہے دیگر انبیاء علیہم السلام اسی ذات کے خوشہ چین اور اسی کل کے جزو ہیں:۔ (اسلام کی بنیادی تعلیمات ص۱۸۱)

نبوت محمدیؐ کی خاتمیت کے ضمن میں شہیدِ ملت لکھتے ہیں:

• محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر، حاملِ وحیِ ربانی اور رسالتِ خداوندی کے آخری علمبردار ہیں۔ سردارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی رسالت اور ختمِ نبوتؐ کے اقرار سے ہی نجات اور انکار سے گمراہی اور ہلاکت ہے۔ اب قیامت تک علماء و خلفاء (جو آپؐ کی شریعت کے حامل اور آپؐ کی تعلیمات کے ترجمان ہیں) کے وجود سے دین اور شریعت کی ترجمانی ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا تاج رکھ کر منصبِ نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں آپؐ کے ختمِ نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (الاحزاب)

ترجمہ:۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

تشریح:۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کا بیٹا مت جانو، ہاں اللہ کے رسول ہیں، اس لحاظ سے سب اُن کے روحانی بیٹے ہیں۔ آپؐ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپؐ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مُہر لگ گئی بس جن کو ملنی تھی مل چکی۔ اس لئے آپؐ کی نبوت کا دَور سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔ آپؐ غایت اللہ کی وحدانیت کے ساتھ ساتھ سرکارِ دوعالمؐ

کی رسالت اور ختم نبوت کی تصدیق پر مضمر ہے: (صد ۹)

ختم نبوت کی مثال: چنانچہ سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ختم نبوت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا اور ارشاد فرمایا:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَہٗ وَاَجْمَلَہٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَۃٍ مِنْ زَاوِیَۃٍ۔ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِہٖ وَیَعْجَبُوْنَ وَیَقُوْلُوْنَ ھَلَّا وُضِعَتْ ھٰذِہِ اللَّبِنَۃُ قَالَ فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ۔ (مشکوٰۃ شریف)

حضورؐ کی خصوصیات "یوں تو آپؐ سارے رسولوں کے سردار اور سالارِ کارواں ہیں۔ آپؐ نے جن خصائص کا ذکر اپنی زبان فیض ترجمان سے فرمایا ہے ان میں ختم نبوت کا مسئلہ بھی ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ارشاد فرمایا:

فضلت علی الانبیاء بستۃٍ اعطیت جوامع الکلم ونصرت بالرعب واحلت لی الغنائم وجعلت لی الارض مسجدا وطھورا وارسلت الی الخلق کافۃً وختم بی النبیون (مسلم)

حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کبریتِ احمر میں اس مضمون کو یوں بیان فرماتے ہیں:

وَخُتِمَتْ بِہٖ الرِّسَالَۃُ وَالدَّلَالَۃُ وَالْبِشَارَۃُ وَالنِّذَارَۃُ وَالنُّبُوَّۃُ۔

حضرت جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ فرماتے ہیں: ؎

ختم رسل پادشہ انبیاء خاکِ درش تاج سر اولیاء
سیدِ عالم سندِ عالمین جاءَ الینا بکتابٍ مبین

حاضرین! جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ختم نبوت کا مسئلہ متفق علیہ مسئلہ تھا اور انشاء اللہ تا قیام قیامت رہے گا۔ اس میں کسی قسم کے تساہل اور سودا بازی کی ہرگز اور قطعی گنجائش نہیں۔ چنانچہ نصف صدی کی ہماری دینی و ملی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مرزا قادیانی کا کامیاب ترین تعاقب علمائے امت نے ہر جگہ اور ہر مرحلہ پر اس طرح کیا کہ یہ فتنہ تقریباً مردہ ہو چکا تھا اور عام مسلمان بھی اس فتنہ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے کچھ عرصہ سے مرزائی نہایت منظم طریقے سے منصوبہ بند پلان کے ساتھ نہایت سرگرم ہو گئے ہیں۔ اور اس وقت مسلم ممالک کے بجائے ان کی سرگرمیاں ان ملکوں میں زیادہ ہیں جو جمہوریت کی بنا پر ہر قسم کی سرگرمیوں کی کھلے عام اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے غیر مسلم ممالک میں جمہوری حقوق کے سائے میں اپنی مہم چلا کر مفلوک الحال، پسماندہ یا ناواقف مسلمانوں کو مرزائی بنانے کی سعی میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ بھارت کے مختلف ریاستوں کے ساتھ مصدقہ اطلاعات کے مطابق جموں و کشمیر میں بھی مرزائی مبلغین سرگرم ہو چکے تھے۔ لیکن الحمدللہ اجتماعی طور پر بروقت کارروائی کے سبب بڑی حد تک رائے عامہ بیدار ہو گئی۔ جموں و کشمیر کی قدیم تعلیمی انجمن" ادارہ "انجمن نصرۃ الاسلام" کے زیر اہتمام ہم نے وادی کے کم و بیش سبھی دینی و دعوتی تنظیموں کے سربراہوں، سرکردہ علماء کرام، مفتیانِ عظام کا ایک نمائندہ اجلاس طلب کیا اور متفقہ طور قرارداد پاس کرا کر اسے مؤقر اخبارات میں شائع کرایا۔ قرارداد کے الفاظ میں کہا گیا کہ :-

۱۔ " آج مورخہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۳ اگست ۱۹۷۵ء بعد نماز ظہر میرواعظ منزل سرینگر میں وادیٔ کشمیر کے علمائے اسلام کا ایک نمائندہ اجلاس میرواعظ کشمیر مولوی محمد عمر فاروق کی صدارت میں منعقد ہوا اجلاس میں مرزائیوں اور قادیانیوں کی تازہ ترین سرگرمیوں پر سیر حاصل بحث ہوئی بعد میں متفقہ طور پر مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی گئی اور اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ جملہ فرزندانِ اسلام کو اس قرار داد سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ اس باطل اور طاغوت کے داؤ پیچ کا شکار ہونے سے محفوظ رہ سکیں"

۲۔ علما اسلام کا یہ نمائندہ اجلاس عالم اسلام کے اس متفقہ فیصلہ کی تائید کرتا ہے جس میں دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔
واضح رہے کہ مرزا غلام احمد کے کفر پر بطور سببِ کفر درجِ ذیل چھ چیزیں علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے عدالتِ بہاولپور میں ثابت کی تھیں:
۱۔ ختم نبوت کا انکار (۲) نبوت کا دعویٰ (۳) وحی کا دعویٰ (۴) حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی توہین (۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین (۶) عام اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر قرار دینا۔

مرزائیت کے تمام فرقے (چاہے قادیانی ہوں یا لاہوری) اسلام سے خارج ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ رشتہ قائم کرنا، ان کے مذہبی مراسم میں شامل ہونا مسلمانوں کے لئے باعثِ کفر وارتداد ہیں"۔

۳۔ نمائندہ اجلاس کے فوراً بعد یہاں مرزائی مبلغین کا ایک وفد مجھ سے ملاقی ہوا۔ تو میں نے انہیں صاف صاف بتلا دیا کہ وہ لوگ اولین فرصت میں اپنی غیر اسلامی

سرگرمیاں اور ختمِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی ریشہ دوانیاں فوراً بند کردیں اور کشمیر کے سادہ لوح عوام اور عام مسلمانوں کے دینی جذبات کو مشتعل نہ کریں۔ الحمدللہ اب تک اس کے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں تاہم میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف ہمیں مقامی طور ملکی طور بلکہ بین الاقوامی سطح پر دینِ اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم اور مسلمانانِ عالم کے خلاف رچائی جارہی مکروہ سازشوں اور مذموم حربوں سے ملتِ اسلامیہ کو باخبر اور چوکنا رہنے کے لئے ٹھوس بنیاد والی تجاویز اور اقدامات کرنے لازمی اور ضروری ہیں۔"

حاضرین کرام! غالب مرحوم کے اس شعر کے ساتھ ع

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

دو چار باتیں عرض کرنی ضروری ہیں۔ فرمانِ خداوندی انما المؤمنون اخوۃ اور ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم "المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً" کے پیشِ نظر بلاشبہ عرب و عجم میں پھیلے ہوئے تمام مسلمان اور کلمہ گو ملتِ اسلامیہ کا حصہ اور ناقابلِ تنسیخ جزو ہیں۔ اسی جذبۂ اسلامی اور اخوتِ دینی کے تحت خود ہندوستان کی موجودہ دینی و ملی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی یہاں کی اقلیتوں خاص طور پر مسلمانوں پر کوئی آفت پڑی چاہے ملک میں بھیانک اور تباہ کن مسلم کشی فسادات ہوں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اقلیتی کردار کی بحالی ہو، اردو زبان کی بقا اور اس کے ارتقار کا مسئلہ ہو، مسلم پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت اور یکساں سول کوڈ (COMMON CIVIL CODE) کی بات ہو

قرآن حکیم پر پابندی لگانے کا مطالبہ ہو یا بابری مسجد کے تنازعہ اور شہادت کا سانحہ ہو، ہر موقع اور ہر مرحلہ پر جموں وکشمیر کے غیور عوام نے اپنے مخلص قائدین بالخصوص اپنے ممتاز دینی وسیاسی قائد شہیدِ ملت میرواعظ مولوی محمد فاروق صاحبؒ کی قیادت میں مقدور بھر آواز بلند کر کے حق وانصاف اور مظلوموں کی حمایت کا فریضہ انجام دینے میں کوئی کوتاہی اور تساہل سے کام نہیں لیا۔ سرزمین کشمیر سے شہید رہنماؒ کی آوازِ حق برابر بلند ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۲۱ رمئی ۱۹۹۰ء کو اس بے باک رہنما کو ایک گہری سازش کے تحت جامِ شہادت سے ہمکنار کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ

برادرانِ ملت! یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ پچھلے سات آٹھ سال سے بھارت سرکار کے شکنجے میں پھنسے مظلوم کشمیری عوام ایک جارح قوت کے ساتھ اپنے مسلمہ حقوق کے حصول اور بازیابی کے لئے پرعزم جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اور اس ضمن میں جہاں ایک طرف وہ بیش بہا جانی ومالی قربانیاں پیش کر کے حریت اور آزادی کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں وہاں دوسری طرف حکومتِ ہند طاقت کے نشہ میں چور وہ تمام حربے استعمال کر رہی ہے اور جبر وقہر کے وہ تمام ہتھکنڈے آزما رہی ہے جن سے عوامی تحریک کو لقمۂ اجل بنایا جا سکے۔ چنانچہ وہاں نام نہاد جمہوریت کی مٹی پلید کر کے ایسے کالے قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔ جن کی مہذب اور جمہوری دنیا میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ مسلح افواج اور سیکورٹی فورسز کی مختلف ایجنسیوں کو من مانی کرنے کی کھلی ڈھیل ہے اور پوری وادی آٹھ لاکھ افواج کے ذریعہ ایک بھیانک قومی چھاؤنی میں تبدیل کر دی گئی ہے۔ فورسز اپنے وسیع تر اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے رات دن مار دھاڑ، قتل وغارت، لوٹ مار اور بڑے

پیمانے پر زیرِ حراست بڑی بیدردی سے کشمیری مسلمان بچوں اور جوانوں کے قتلِ عام اور غیر انسانی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس دوران کم و بیش ساٹھ ہزار کشمیری بچے بوڑھے، جوان اور عورتوں کو جرم بے گناہی کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ وادی کا چپہ چپہ اور گلی کوچہ بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو چکا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں محبِ وطن کشیری، جموں و کشمیر اور بھارت کی مختلف جیلوں اور انٹروگیشن سنٹروں میں نظر بند اور پابندِ سلاسل ہیں۔ کشمیر کا ہر گھر ماتم اور ماتم کدہ ہے۔ کرفیو بدنام زمانہ کریک ڈاؤن، فوجی محاصرہ، بھرپور شاداب اور آباد بستیوں کو نذرِ آتش کرنا، رہائشی مکانات کو بارود اور بم سے اڑا دینا، مقدس مذہبی مقامات مساجد، خانقاہوں اور درگاہوں کے تقدس کی پامالی اور آتش زنی، اندھا دھند پکڑ دھکڑ، یہاں تک کہ اسکول کالج آتے جاتے بچوں اور طالب علموں کو پکڑ کر، بعد میں قتل کر کے لاش سڑکوں پر پھینک دینا، پردہ نشین، عزت مآب خواتین کی بے حرمتی اور آبرو ریزی کے شرمناک واقعات وہاں روز کا معمول بن گئے ہیں۔

یہ دھماکہ خیز اور سنگین نوعیت کے حالات جن کا مختصر سا خاکہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ان کے پس منظر میں کشمیر کے ہمارے لوگ ہندوستان کے امن پسند عوام مسلمانوں اور انصاف و جمہوریت پر یقین رکھنے والے لوگوں سے بجا طور پر اس بات کی نہ صرف توقع رکھتے ہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کے بیدار مغز علماء، سرکردہ شخصیات اور دانشور حضرات نہتے اور مظلوم کشمیری عوام پر ڈھائے جا رہے ریکارڈ توڑ مظالم بے گناہوں کے قتلِ عام اور خون ریزی اور بنیادی انسانی و مذہبی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے خلاف آواز بلند کریں گے۔"

کشمیری عوام یقیناً آپ سب کے شکر گذار ہوں گے اگر کرۂ ارض کے اس خطے کی مکدر فضا اور خونیں فضا کو خوشگوار بنانے میں ہندوستانی قائدین اور یہاں کے عوام اپنی حکومت پر اخلاقی دباؤ ڈال کر اسے کشمیر کے دیرینہ تنازعہ کے پرامن، پائیدار اور مستقل حل کے لئے اپنا کردار ادا کریں گے۔ والسّلام

بقیہ : صہ ۱۹ کا۔

(۵۱) القرافی۔ الاحکام، ص ۲۵۱، ۲۵۴، ۲۶۴

(۵۲) ایضاً ــــ ص ۲۵۱، الطبرانی، المعجم الکبیر، والسیوطی، المعجم الصغیر

(۵۳) ابن القیم۔ الاعلام ج ۳ ص ۱۴۲، ۱۴۳

(۵۴) ایضاً ــــ ج ۳ ص ۱۳۹

(۵۵) ایضاً ــــ ج ۳ ص ۱۴۸

(۵۶) ایضاً ــــ ج ۳ ص ۱۳۷

(۵۷) ایضاً ــــ ج ۳ ص ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷ وابن رشد، المختصر ج ۶ ص ۹۴

(۵۸) التسولی علی التحفہ، ج ۱ ص ۲۵

(۵۹) ابن القیم۔ الاعلام، ج ۴، ص ۱۵۴

(۶۰) ایضاً ــــ ج ۴ ص ۱۷۰

(۶۱) النووی، المجموع، ج ۱ ص ۴۵

(۶۲) الفروق، ج ۲ ص ۱۰۹ للقرافی

(۶۳) القرافی۔ الاحکام ص ۲۶۰ والفروق ج ۲۔

دسمبر ۱۹۹۷

برہان

جلد ۱۲۱ شمارہ ۶

Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

لیجیے صاحب بھارت کے عوام کو جمہوریت بچانے کے لیے آٹھ سو کروڑ روپے خرچ کر کے پارلیمنٹ کے ڈیڑھ سال کے وقفے کے درمیان میں دوسری بار الیکشن کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ آٹھ سو کروڑ روپے ہندوستانی عوام ہی کی جیبوں سے مختلف ٹیکسوں کی صورت میں یا ضروریات زندگی کی چیزوں کی مہنگائی کر کے نکالے جائیں گے۔ ہندوستانی عوام واقعی قابل تعریف عوام ہیں کہ عرصہ دراز تک وہ انگریز سامراج کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے قربانی پہ قربانی دیتے رہے اپنی جانوں کی بازی لگاتے رہے انگریز سامراج کی سخت ترین جیلوں کی صعوبتیں ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے۔ پھانسیوں کے تختے پر اپنے ملک کی آزادی کا خواب لیے جھولتے رہے۔ ان کی ان ہی قربانیوں کی بدولت ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستانی عوام نے اپنے لیڈروں کے بنائے ہوئے نظام جمہوریت کو اسی طرح ہنسی خوشی برداشت کیا جس طرح انھوں نے آزاد ہندوستان دیکھنے کے لیے ظالم و جابر انگریز سامراج کی حکومت کے ظلم و ستم کو برداشت کیا تھا۔

لیکن ؟.... یہ لیکن بڑا ہی دکھ و افسوس میں ڈوبا ہوا ہے اس کی اگر تشریح کی جائے گی تو پھر نہ معلوم کیا کیا کچھ نہ کہنا پڑ جائے گا اور کچھ باتیں تو شاید ایسی بھی نوک قلم سے نکل سکتی ہیں جنھیں آزاد ہندوستان کے حکمراں قابل گرفت بتا دیں گے۔ اب یہ کیا بتایا جائے کہ ان پچاس سالوں میں آزاد ہندوستان کے عوام نے کیا کیا نظارے کیے ہیں۔ ان نظاروں کی تفصیل اگر بیان کی جائے تو ایک پوری لمبی چوڑی تصویر ہی تیار ہو جائے گی جس کے لیے آج کے تیز رفتار ماحول میں کوئی دیکھنے اور سننے کے لیے ہی وقت نہ نکال سکے گا۔ مختصر لفظوں میں اگر بیان کیا جائے تو اس کا نچوڑ یہ نکلے گا کہ آزاد ہندوستان کے عوام کے مقدر میں شاید قدرت ہی نے یہ لکھ دیا ہے کہ انھیں ہر وقت قربانی ہی دیتے رہنا ہے۔ جان کی یا مال کی، دونوں ہی چیزوں کی قربانی بھارت کے عوام کی قسمت بن گئی ہے۔ پہلے آزادی کے لیے قربانی دی، پھر آزاد ہندوستان کے حکمرانوں کے لیے قربانی دینے کے لیے انھوں نے اپنے کو تیار کر لیا ہے چنانچہ آزادی کے بعد ہی سے ہندوستانی عوام [illegible]

دیا شروع کر دیا تھا۔

شروع میں ہندوستانی عوام کے سامنے نہرو و پٹیل کے اختلافات کی صورت میں رونما حالات آئے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اقتدار میں ایک پارٹی کانگریس کا بھی دبدبہ تھا دھیرے دھیرے اس دبدبے میں زوال آتا گیا اور ہندوستان میں بدعنوانیوں کی ایک لہر کا پیدا ہو گئی کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں بدعنوانیوں کی خبروں سے ہندوستانی عوام کو پریشان نہ ہونا پڑا ہو۔ پہلے لاکھوں کے گھپلے سامنے آتے تھے لیکن پھر لاکھوں کی کوئی وقعت ہی نہ رہی اور آج ہندوستان میں بعض سیاسی حکمرانوں کی طرف سے لوٹ کھسوٹ اور گھپلوں کی خبریں لاکھوں کو دانت دکھاتی کروڑوں کو منہ چڑاتی اربوں میں پہنچ گئی ہیں۔ شروع شروع میں آزاد ہندستان میں کسی ایک نام کی کوئی خبر آتی تو وہ عوام کے ذہنوں میں ذہن نشین ہو کر رہ جاتی تھی اور اس نام پر ہر طرف سے لعنت برستی تھی جس کے نتیجے میں وہ نام اپنے کو شرم کے مارے گوشہ نشین بنانے پر مجبور ہو جاتا مگر اب جو نام سامنے آتے ہیں تو وہ نہ شرماتے ہیں نہ جھینپتے ہیں اور نہ ہی اپنا منہ چھپاتے ہیں بلکہ عوام کے سامنے وہ ہیرو بن کر آتے ہیں۔ جین حوالہ ڈائری میں جن جن لیڈروں کے نام آئے وہ عوام کے سامنے جب آئے تو انھیں اس پر کوئی شرمندگی نہ تھی بلکہ وہ یہ کہہ کر کہ "سیاسی وجوہات کی بنا پر ان کی شخصیت کو داغدار بنانے کے لیے یہ سازش رچی گئی ہے" اپنے کو عوام کے سامنے پیش کرنے لگے تو عوام کی ہمدردی ان ہی کے ساتھ ہو گئی اور جب عدالت کے ذریعے انھیں بے گناہی کی چٹ مل گئی تو پھر تو ان کی ہر دلعزیزی میں اور چار چاند لگ گئے۔ پنڈت سکھرام اور للو پرشاد جی ابھی اپنے دم خم ٹھونکے ہوئے ہیں دونوں جیلوں سے ضمانت پر واپس، عوام کے سامنے خوب دھڑلے سے گھوم رہے ہیں۔

ان سب گھپلوں کا بھی سیدھا اثر عوام کی جیبوں پر پڑے گا اور جمہوریت کو بچانے کے لیے الیکشن کرائے جانے کے اخراجات کا سیدھا اثر بھی ہندوستانی عوام کی جیبوں پر پڑنا لازمی ہے۔ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں جنتا پارٹی کی سرکار برسر اقتدار آئی تو وہ بمشکل دو سال بھی پورے نہ کرنے پائی تھی کہ عوام کو پھر ۸۰ء میں الیکشن کا بوجھ جھیلنا پڑ گیا۔ ۸۹ء تک الیکشن اپنے وقت ہی پر ہوتے رہے لیکن ۸۹ء کے بعد جو جنتا دل برسر اقتدار آیا وہ بھی اپنی مدت پوری نہ کر سکا اور ۹۱ء میں پھر عوام کو الیکشن کا سامنا کرنا پڑا۔ ۹۱ء کے الیکشن میں کانگریس اپنی معمولی سی اکثریت سے برسر اقتدار آئی تو اس نے کشتم پشتم ۵ سال کسی نہ کسی طرح پورے کر لیے پھر ۹۶ء میں پارلیمنٹ کا جو الیکشن ہوا اس کے بعد ایک ایسا محاذ برسر اقتدار آیا جو ۱۳ صوبائی پارٹیوں پر مشتمل تھا اس کے باوجود اس نے باہر سے دوسری سب سے بڑی جماعت کانگریس کی حمایت سے اپنی حکومت بنائی لیکن اس کا بھی حشر پہلے ہی کی طرح ہوا اور ڈیڑھ سال بمشکل چل پائی اور اب ڈیڑھ سال کی مدت میں دوبارہ الیکشن کی نوبت آ گئی ہے۔ اور اس طرح ہندوستانی عوام کو ہندوستانی جمہوریت کے لیے ۸۰۰ (آٹھ سو کروڑ) روپے کی قربانی پیش کرنی پڑے گی.... یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس الیکشن کے بعد بھی کوئی ایک جماعت اس قابل ہو

سکے گی یا نہیں کہ وہ اپنے بل بوتے پر حکومت بنا کر پورے پانچ سال کی مدت پوری کر سکے۔
بظاہر حالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ الیکشن میں بھی کسی ایک پارٹی کو مکمل اکثریت ملنا محال ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہو گیا تو پھر ہندوستان میں جمہوریت ہی کو بچانے کے لالے پڑ جائیں گے اور یہ بات ملک کے لیے، ملک کے عوام کے لیے اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہو گی۔

موجودہ الیکشن میں جو تیرہ جماعتوں کا محاذ تھا وہ بکھر چکا ہے اور سب اپنی اپنی ڈفلی بجا رہے ہیں مگر سب ہی کی ایک تان ہے کہ ہم بی جے پی کو کسی بھی طرح اقتدار میں نہ آنے دیں گے۔ یعنی سب ہی کی ایک ہی آواز ہے اس کے باوجود بھی یہ سب الگ الگ راستے پر چل کر الیکشن کی بازی جیت جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن الیکشن کے ماہرین کو نہیں لگتا کہ یہ خواب پورا ہو جائے گا۔ ہمارے خیال میں تو اس سے بی جے پی کو بجائے نقصان کے فائدہ ہی ہو گا بی جے پی مخالف جماعتیں آپس میں ہی لڑ کر ایک دوسرے کے ووٹ کاٹیں گی جس سے ان کے ووٹ بکھریں گے اور بی جے پی آسانی سے میدان مار لے گی۔

سال ۱۹۹۸ء شروع ہی ہوا ہے کہ ریل کا زبردست حادثہ ہو گیا۔ کاشی وشوناتھ ایکسپریس اور ورانسی بریلی پسنجر کی ٹکر نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک اور ریل حادثہ کا اضافہ کر دیا ہے اور ایک بار پھر ریلوے میں حفاظتی اقدامات کی پول کھل کر رہ گئی ہے۔ جس طرح یہ حادثہ رونما ہوا، دو سال پہلے بالکل اسی طرح کا ریل حادثہ ہو چکا ہے اس سلسلے میں روزنامہ "نو بھارت ٹائمز" لکھتا ہے: اس بار کاشی وشوناتھ ایکسپریس ریل پٹریوں پر کھڑی تھی کیونکہ غالباً ایک نیل گائے کے گاڑی کے پہیوں کے نیچے آجانے سے گاڑی کو رکنے کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔ دو سال پہلے فیروز آباد کے پاس نیل گائے کے کٹنے کی وجہ سے پرشوتم ایکسپریس کو ان ہی حالات میں رکنے کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا تب پرشوتم ایکسپریس کو کالندی ایکسپریس نے ٹکر ماری تھی اور اس بار کاشی وشوناتھ ایکسپریس کو ورانسی ایکسپریس نے ٹکر ماری ہے۔ اس حادثے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بھارتی ریلوے اپنی پچھلی غلطیوں سے کوئی سبق نہیں لیتی ہے حادثہ ایک کے بعد ایک ہوتا رہتا ہے ہر حادثے کے بعد مرنے والوں کے وارثین کو اور زخمی ہونے والوں کو حکومت کے ذریعے مالی امداد کا اعلان کیا جاتا ہے اور حادثے کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی جاتی ہے یہ کمیٹی بتاتی ہے کہ حادثات کیوں ہوئے، اور آئندہ اس طرح کا کوئی حادثہ نہ ہو اس کے لیے کمیٹی کچھ نہ کچھ سفارشیں بھی کرتی ہے لیکن پھر بھی حادثات ہو ہی جاتے ہیں اور ہر نیا ہونے والا حادثہ پہلے کی جانچ کمیٹیوں کی کھلی اڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ "نو بھارت" آگے رقمطراز ہے۔۔۔ وجوہات جو بھی ہوں اس کے لیے ذمہ دار تو بالآخر ریلوے ہی ہے اگر لال سگنل پر پٹاخہ چھوڑنے کی سہولیت نہیں ہے تو یقیناً یہ ایک بڑی خامی ہے اور اس سہولت کو مہیا کرنا چاہئے

جانے کے لیے ذمہ دار شخص چاہے وہ کتنے ہی اونچے عہدے پر کیوں نہ ہو، اس کے خلاف سخت کارروائی کی جانی چاہیے۔

پوچھا جانا چاہیے کہ یہ کیسا ملک ہے جس کی ریلیں متواتر غیر محفوظ ہوتی جارہی ہیں؟"

"نوبھارت" نے یہ تو لکھ دیا اور صحیح لکھ دیا لیکن یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ گائے کے پوجنے والے ملک میں ایک گائے کو بچانے کے لیے اگر سینکڑوں انسان مر جاتے ہیں تو پہلے کس کو بچایا جائے انسان کو یا گائے کو۔

جس ملک میں گائے کو گئوماتا کا درجہ حاصل ہے اس ملک میں اس سوال کا جواب پانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ایک ہی طرح کے دو حادثے اور وہ بھی ایک نیل گائے کی خاطر، ہمارے سامنے ایک کبھی نہ سلجھ پانے والا مسئلہ کھڑا ہے۔ معاملہ دھرم کا ہے اور وشو ہندو پریشد اور ہندوستان کی متوقع حکمراں پارٹی بی جے پی اس کو عقیدت کا مسئلہ کہتی ہے تو اس کے پیش نظر تو گائے کی حفاظت ہر حال میں ضروری ہے۔ جب بابری مسجد کا انہدام ہوا تھا تو جناب ملائم سنگھ یادو چلاتے رہے کہ ارے یہ کیا، یہ تو ملک کے خلاف بڑی سازش ہے، ملک کے ماتھے پر ایک بڑا کلنک ہے اور یہ کارنامہ ملک دشمنی والا ہے لیکن جنھوں نے اس کو ڈھایا انھوں نے اس پر فخر جتایا تو آپ بتائیے کہ ہندوستان میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے بارے میں ہم آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟ فیصلہ تاریخ داں ہی پر چھوڑیئے وہ ہی اس پر اپنی رائے قائم کر کے بتائے گا کہ کون ملک دشمن کام کر تا رہا اور کون محب الوطنی کے کاموں کو انجام دینے کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے کے لیے کوشاں و کمربستہ رہا۔

سلاطینِ دہلی کے عہد میں ہندوؤں کی حالت

سید حسن برنی

عام خیال ہے کہ اس دور میں ہندوؤں کی حالت مستقل تباہی، تکالیف اور بے بسی کی تھی اور ان پر ہر وقت ظلم وستم ہوتے رہتے تھے۔

لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ کافی شہادتیں ملتی ہیں کہ بالعموم ہندو رعایا حفاظت، خوشحالی اور فارغ البالی سے رہتی تھی اور بے خبر مؤرخوں نے مصائب کے بیان میں مبالغہ اور رنگ آمیزیوں سے کام لیا ہے۔

دراصل سلطنت کی تبدیلی سے ملک کی عام حالت میں بہت زیادہ فرق نہیں آیا۔ یہ یقینی امر ہے کہ تاریخ کے اس دور میں عوام الناس کی حالت پچھلے زمانوں سے اگر بہتر نہ تھی تو بدتر بھی نہ تھی۔ بلاشبہ جس جماعت پر کچھ اس تبدیلی کا اثر پڑا، وہ حکمران طبقہ تھا۔ جس کے اقتدار میں قدرتی طور پر فرق آگیا تھا۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کی کیا حالت تھی۔ مسٹر دت نے قدیم ماخذوں کے حوالے سے اپنی تاریخ "تمدنِ ہند" میں لکھا ہے کہ بشسٹھ اور بندھیت (۱۰، ۱۸، ۳۶) کے رو سے پادشاہ رعایا کی آمدنی سے ۱/۶ حصہ بطور ٹیکس لینے کا مستحق تھا۔ گوتم نے ٹیکسوں کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

"۲۴۔ مزارعان پادشاہ کو (پیداوار کا) ۱/۱۰، ۱/۶، ۱/۸ اور ۱/۸ ادا کرتے ہیں۔

۵ ۔ بعض کہتے ہیں مویشی اور سونے پر ۱۸/۱ ٹیکس ہے۔

۷ ۔ جڑوں، پھلوں، پھولوں، دواؤں، بوٹیوں، شہد، گوشت، چارہ اور جلانے کی لکڑی پر ۶۰/۱۔

ہر پیشہ ور پادشاہ کو مہینے بھر میں ایک دن بے گار دے گا۔"

(ج ۱۔ ص ۲۴۲ و ج ۲۔ ص ۱۰۴)

آگے چل کر میگستھانیز (یونانی سفیر) کی سند سے لکھا ہے کہ ہر کاشت کار پادشاہ کو زمین کا لگان ادا کرتا تھا۔ تمام زمین پادشاہ کی ملک تھی۔ کوئی شخص ذاتی طور پر مالک نہ تھا۔ علاوہ لگان کے شاہی خزانہ میں پیداوار کا چہارم داخل ہوتا تھا۔ (ج ۱ ص ۲۵۲)

ہوان تزنگ نے لکھا ہے کہ جو لوگ شاہی زمینیں کاشت کرتے تھے انہیں پیداوار کا ۶/۱ ادینا پڑتا تھا۔

(ج ۲، ص ۱۵۸)

مسٹر دت اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوؤں کے زمانہ میں عام طور پر پیداوار کا ۶/۱ حصہ پادشاہ کو دیا جاتا تھا۔

یہ امر مسلم ہے کہ ان مسلمان سلاطین نے ملک کے رواج کے مطابق، نیز اپنی شریعت کے اتباع میں زمینیں انہیں کاشت کاروں کے قبضے میں چھوڑ دی تھیں جو پہلے سے قابض چلے آرہے تھے۔ انہوں نے چودھریوں، مقدموں، خوطوں، راویوں، مہتوں، پٹواریوں اور دوسرے ہندو عہدے داروں کو، جنہوں نے امتداد زمانہ کے ساتھ تقریباً موروثی حیثیت حاصل کر لی تھی، بدستور برقرار رکھا۔ اور ان سے اپنے مطالبوں کی وصولیوں میں مدد لیتے رہے۔ معاصر تاریخوں میں ان کا جابجا ذکر آتا ہے۔

بعض ٹیکس جو مسلمان بادشاہوں، مثلاً فیروز شاہ خلجی نے معاف کیے، ہندوستان کے لیے نئے نہ تھے بلکہ ہندوؤں کے زمانے سے چلے آتے اور عام طور سے مانے ہوئے تھے۔ ان مسلمان سلاطین کے عہد میں جو محصول کاشت کاروں سے لیا جاتا تھا، وہ بعض حالتوں میں تو ہندو راجاؤں کے مطالبوں سے بھی ہلکا تھا۔ چنانچہ اکثر اس کی مقدار عشر (یعنی ۱۰/۱) سے زیادہ نہ تھی۔ اس پر ہم عنقریب ایک مقالہ لکھ چکے ہیں جس میں اس دور کی مالیات سے بحث کی گئی ہے۔

مسٹر لین پول نے تسلیم کیا ہے کہ ابتدائی دور میں ہندو رعایا کے ساتھ مسلمان سلاطین ہند رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ طرز عمل برابر جاری رہا۔

علاء الدین خلجی، جو نہ مسلمانوں کی غیر معمولی دولت مندی دیکھ سکتا تھا نہ ہندوؤں کی، اس زمانے کے ہندو مقدموں اور خوطوں کی خوش حالی کا اس طرح ذکر کرتا ہے:

"خوطہ اور مقدم عمدہ گھوڑوں پر سوار ہوتے۔ نفیس کپڑے پہنتے، فارسی کمانوں سے تیر اندازی کرتے، باہم جنگ آزمائی میں مشغول اور شکار میں لگے رہتے ہیں۔ اور خراج، جزیہ، کری و چرائی کی بابت ایک چیتل بھی نہیں دیتے۔ خوطی کا حق علیحدہ گاؤں سے وصول کر لیتے ہیں۔ مجلسیں منعقد کرتے اور شرابیں پیتے ہیں اور بعض تو قطعاً بلانے یا نہ بلانے پر بھی دیوان شاہی میں حاضر نہیں ہوتے اور سرکاری محصلوں کی قطعاً پروا نہیں کرتے ہیں۔"

(فیروز شاہی، ص ۲۹۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک صدی میں جو علاء الدین خلجی کے وقت تک مسلمانوں کی سلطنت دہلی کو گزرے تھے، انہیں کتنی خوش حالی و فارغ البالی نصیب تھی۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ و قیمتی تاریخی حوالہ علاء الدین سے دو سو برس بعد سکندر لودھی کے دور سلطنت میں ملتا ہے۔ صاحب تاریخ داؤدی نے لکھا ہے کہ سکندر لودھی ایک موقع پر ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرنے اور تشدد سے کام لینے پر آمادہ تھا۔ اس نے علما کی ایک مجلس منعقد کی۔ علما نے سوال کیا کہ "ہندوؤں کے متعلق پچھلے سلاطین دہلی کا کیا طرز عمل رہا ہے؟" سلطان نے جواب دیا: "اس وقت تک انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مکمل رواداری برتی ہے۔" ملک العلما نے کہا: "یہ قطعاً نامناسب ہے کہ ہندوؤں کے مندروں کو توڑا جائے یا ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے، یا انہیں مذہبی مراسم کی ادائیگی سے باز رکھا جائے، یہ سب ہرگز جائز نہیں ہو سکتا۔" سلطان یہ سن کر نہایت غضب ناک ہوا اور تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "تم کافروں کی جانب داری کرنا چاہتے ہو؟" ملک العلما نے جواب دیا: "ہر شخص کی زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے، پادشاہ نے پوچھا ہے، تو میں نے شریعت محمدیؐ کا منشا بتادیا۔ اگر پادشاہ اس کا احترام نہ کرنا چاہے تو پوچھنا بے کار ہے۔" اس فقیہہ کی دیانت سے پادشاہ پر ایسا اثر پڑا کہ اس نے اپنا خیال بالکل چھوڑ دیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھو ج ۴، ص ۴۴۰)

ہم اس تاریخی حوالے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ہندوؤں کا خیال ان سلاطین کے متعلق کیا تھا؟

فیروز شاہ اور محمد تغلق کے متعلق یہاں تک مشہور تھا کہ انہوں نے جوالا مکھی کے مندر میں مورتی پر چھتری لگائی تھی۔ (ج ۳، ص ۳۱۸)

ہو سکتا ہو یہ روایت بالکل بے بنیاد ہو، لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ ان میں سے بعض سلاطین کو کس حد تک بے تعصب سمجھا جاسکتا تھا۔

مؤرخوں نے جزیہ کے متعلق بہت سے دفتر سیاہ کیے ہیں لیکن یہ ماننا مشکل ہے کہ جزیہ جس کے بدلے میں ہندو ہر قسم کی جبریہ خدمات سے معاف رہتے تھے اور جو ان کے جان ومال کی حفاظت کا بھی ذمہ دار تھا، وہ موجبِ شکایت سمجھا جاتا تھا، اس کے بارے میں مسٹر طامس کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا:

"جزیہ دراصل ایک سرسری قسم کا انکم ٹیکس تھا جس کی مقدار مختلف طبقوں کی استطاعت کے لحاظ سے کم وبیش ہوتی تھی۔ ایک معنی میں وہ امتیاز انگیز ضرور تھا۔ لیکن وہ سادہ، آسانی سے جمع ہو جانے والا انگریزی انکم ٹیکس کی پیچیدگیوں سے بدرجہا فائق تھا۔"

(کرانکلس ص ۴۳۳ نوٹ ۲)

ان چند سطور سے ناظرین کے ان خیالات میں کچھ فرق ضرور پڑ گیا ہو گا جو ان سلاطین کی مفروضہ سختیوں کے متعلق پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سلاطین کا طرز عمل ہندو امرا کے ساتھ کیسا تھا، اس کی بھی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

برنی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دیوگر کے راجہ نے اپنا سالانہ خراج علاء الدین کو ادا نہیں کیا۔ اس پہ فوج کشی ہوئی جس میں راجہ کو شکست ہوگئی اور وہ گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ علاء الدین نے اس پر بڑی مہربانیاں کیں۔ اسے رائے رایاں کا خطاب دیا۔ ایک لاکھ تنکہ عطا کیا اور مع اہل وعیال، نہایت عزت سے اس کی ریاست پر ہی اسے واپس بھیج دیا۔ راجا بھی پھر ہمیشہ مطیع رہا، اور اپنا خراج وقت پر بھیجتا رہا۔ (ج ۳، ص ۲۰۰۔۲۰۱)

مسالک الابصار کے مصنف نے ایک اور قصہ لکھا ہے۔ جس سے سلاطینِ دہلی کے طرزِ عمل پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سلطان محمد نے ایک ہندو راجا کے خلاف جس کا ملک دیوگری کے قریب

تھا، ایک فوج بھیجی۔ وہ مطیع ہو کر بادشاہ کے پاس آگیا۔ جب سلطان کے روبرو آیا تو اس نے راجا پر اعزاز کی بارش کر دی۔ راجا نے اپنا مال و دولت بادشاہ کی نذر کرنا چاہا لیکن سلطان نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کہا تم دہلی میں رہو اور اپنے ملک میں اپنا نائب بھیج دو۔ بادشاہ نے مصارف کے لیے راجا کا اچھا وظیفہ مقرر کر دیا، اور اپنی رعایا سمجھ کر اس کے ملک کے لوگوں کے لیے بہت سی خیرات بھیجی۔ (ج ۳، ص ۵۸۴)

عفیفؔ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ خلجی کے زمانے میں بھی یہ طرز عمل حسن سلوک کا جاری رہا۔ لکھا ہے کہ رائے جاج نگر مدت تک سلطان فیروز سے مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن جوں ہی اس نے اطاعت کی طرف میلان دکھایا تو سلطان نے خلعت و علامات حکومت مہتاؤں اور راؤں کے ہاتھ اس کے پاس بھیج دیں۔

(ج ۳ ص ۳۱۵)

نگر کوٹ کے راجا نے بغاوت کے بعد معذرت چاہی تو سلطان نے نہایت بردباری کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا اور خلعت اور شتر دے کر بڑی عزت کے ساتھ اس کے قلعہ میں واپس بھیج دیا۔ (ج ۳، ص ۳۱۹)

یہی حال سلطان فیروزؔ کا بانھیہؔ اور جامؔ کے متعلق لکھا ہے، وہ سندھ و گجرات کے راجا تھے۔ جب بانھیہ سلطان کے روبرو آیا تو بادشاہ نے شفقت سے اپنا ہاتھ اس کی پشت پر رکھا اور کہا: "تم مجھ سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا نہ ہی تمہیں۔ دل خوش رکھو، تشویش کو دور کرو، جو تمہاری حالت پہلے تھی اس سے دو چند بہتر پاؤ گے۔" پھر حکم دیا کہ ایک عربی گھوڑا بطور انعام دیا جائے۔ اسی دن جامؔ حاضر ہوا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ہوا۔ اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قیمتی خلعت دیے گئے (ج ۳، ص ۳۳۵) وہ سلطان کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ اور مؤرخ کا بیان ہے کہ انہوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی اور ان کے اہل و عیال شاہی محل کے پاس آرام سے رہتے تھے۔ ہر ایک کو شاہی خزانہ سے دو لاکھ ٹنکہ ملتا تھا اور اس کے علاوہ بھی اتنی مہربانیاں ہوتی رہتی تھیں کہ وہ اپنے وطن ٹھٹھہ کو بھول گئے تھے۔ دربار میں وہ بادشاہ کے سیدھے ہاتھ پر بیٹھتے تھے اور ان کا مقام صدر جہاں (چیف جسٹس) سے دوسرے نمبر پر شیش محل میں ہوتا تھا۔ (ج ۳، ص ۳۳۸)

ہندوستان میں اسلامی سلطنت

اور

فارسی صحافت کا آغاز

جناب کنور سین صاحب ایم۔اے بار ایٹ لا

آر۔بی کنور سین صاحب بار ایٹ لا مقیم دہرہ دون نے ہندوستان وایران کے ادبی روابط پر ایک مفید کتاب تالیف فرمائی ہے، جس میں علماء وفقراء اور صوفیائے کرام کی ایران سے ہندوستان میں آمد کے اسباب، شیخ سعدی شیرازی کی سیاحت، خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کی مقبولیت کے اسباب، امیر خسرو کی شاعری اور ان کی تصنیفات کی اثر انگیزی اور تیمور اور اس کے جانشینوں کی علمی وادبی وابستگیوں اور دلچسپیوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ زیر نظر مضمون اس کتاب کا باب ہفتم ہے جسے قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (برہان)

اسلامی سلطنت شمس الدین التمش کے عہد میں جب دہلی کے اندر مستحکم ہو گئی تو علماء ایران کے لیے بھی ہندوستان آنے کا راستہ کھل گیا۔ اور یہ سلسلہ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا۔ افغان بادشاہان دہلی کے پاس زر وجواہرات کی فراوانی تھی اور قدرتاً ان کو اپنے ہم وطنوں اور ہم زبانوں کی خاطر داری منظور تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی آب وہوا معتدل، خوشگوار اور کھانے پینے، پہننے کے سامان کی افراط وارزانی تھی۔ یہاں کے باشندوں میں رواداری اور مہمان نوازی جزو اخلاق وایمان تھی۔ جو اہل قلم یا صاحب ہنر ایران سے ایک دفعہ بھی ہندوستان آجاتا وہ یہاں سے اپنے وطن کو واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اس ملک کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہو جاتا تھا۔ احمد رازی نے اپنے تذکرہ "ہفت اقلیم" میں لکھا ہے۔

اے خوشا فصل دی بہ ہندوستان کہ شود خانہ و چمن بستان
نہ نے از برف پنبہ پشت شود نہ ز سرما شکنج مشت شود
نہ شود سبزہ کم ز دشت فراخ نہ ز پوشش برہنہ گردد شاخ

علاوہ ازیں تیرہویں، چودھویں، پندرہویں اور سولہویں عیسوی صدیوں میں بادشاہان ایران و ہندوستان کی طبائع ادبی اشواق علمی میں ایک قسم کا بعد المشرقین واقع ہو گیا تھا یعنی ہندوستان میں فارسی شعراء، علما اور ایرانی عرفا و فقرا کی قدردانی ہونے لگی اور خود ان کے اپنے ملک و وطن میں بے قدری و بے حرمتی، عہد خلافت کے اختتام اور شیعی سلطنت صفوی کے آغاز سے ہی ایران میں مذہبی تعصب کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا۔ اور شاہان صفوی نے جو شیعیت کے علمبردار تھے اہالیان سلطنت و تصوف پر سختیاں روا رکھیں۔ اندریں حالات کثیر التعداد اصحاب کمال نے ترک وطن کر کے ہندوستان میں رہائش اختیار کر لی۔ چنانچہ شمس الدین التمش نے بخارا کے مشہور شاعر قاآنی کو پناہ دی۔ اسی بادشاہ کے دور میں محمد عوفی نے ہندوستان آکر وزیر ناصر الدین قباچہ کی ملازمت اختیار کی اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ لب الباب جو ناصر الدین کی خاطر لکھی گئی اور دوسری جوامع الحکایات جو التمش کو معنون کی گئی۔

سلطان شمس الدین التمش بقول مورخین منہاج الدین مولف طبقات ناصری و ضیاالدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی علاوہ عالی حوصلہ و جلیل القدر حکمران ہونے کے روشن دماغ اور صاحب مذاق شخص تھا۔ اور مشائخ کرام و اولیائے عظام کا دلدادہ۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے (جو اپنی زاد بوم اصفہان اور اپنے وطن ایران کو خیرباد کر کے پہلے لاہور، دہلی اور بالآخر اجمیر میں مقیم ہوئے) اس کو بدرجہ غایت و عقیدت تھی اور بعد ازاں ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی بیعت کر کے ان کو شیخ الاسلام کا خطاب پیش کیا جو خواجہ نے منظور نہیں کیا۔ بعد ازاں اپنا لقب القطبی رکھ کر اپنی ارادت کا اعتراف و اظہار کیا، علمی مذاق و رغبت شعر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ناصری شاعر کو اپنے قصیدے کے صلہ میں جس میں ترپن (۵۳) ابیات تھے ترپن (۵۳) ہزار سکہ انعام دیئے۔

التمش کے دو جانشینوں کے بعد اس کے غلام اور داماد غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں بھی شہر دہلی شرفا علما اور عرفائے اسلام کا مرجع عام بن گیا تھا۔ نہ صرف ایران و روم و شام کے ملک

خراسان، عراق اور آذربائیجان تک کے شہزادے اور حکمران چنگیزیوں کی ترکتازی کے خوف سے بھاگ بھاگ کر دہلی میں بلبن کے دامنِ عاطفت میں بآرام رہنے سہنے لگے تھے۔ انہی نوواردوں کے ناموں پر دہلی میں پندرہ (۱۵) نئے محلے آباد ہو گئے۔ اسی دوران میں متعدد مشائخ عظام ہندوستان میں وارد ہوئے اور اسی وجہ سے عہد بلبن کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں خیر الاعصار کہا گیا ہے۔

شیخ سعدی کی آمد ہندوستان میں

مہاجرین میں شیخ مصلح الدین سعدیؔ کا نام نہایت ممتاز ہے۔ جن کو اپنا وطن شیراز ترک کرنا پڑا کیونکہ ایران کے اندر اس زمانہ میں شورش، فساد اور طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا، شیخ سعدی نے بمصداق ع ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست۔ اپنی تیس سالہ سیاحت میں چند سال ہندوستان میں بھی گزارے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے ولی عہد و منظورِ نظر سلطان محمد المعروف خاں شہید جب وہ ملتان کا نا [illegible] حکومت تھا دو بار بارہ ہزار روپیہ شیراز بھیج کر شیخ سعدی کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ مگر حضرت نے ضعفِ پیری کا عذر کر کے معافی چاہی۔ البتہ اپنا کلام نقل کر کے سلطان کے نام ارسال کر دیا۔ اور امیر خسرو کے لیے سفارش کی اور لکھا کہ وہ میرے نعم البدل ہیں۔ سعدی کی کثیر التعداد تصانیف میں سے گلستاں، بوستاں اور دیوان سعدی نے وہ شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ فارسی کی دنیائے ادب میں سوائے معدودے چند مستثنیات کے یعنی شاہنامہ، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کے اور کسی کو میسر نہیں ہوئی بقول مولانا جامی ؎

در شعر سہ کس پیمبرانند   ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

ایران و ہند کے روابط ادبی میں جن مردان خدا نے بے حد اضافہ کیا ان میں شیخ سعدی کا نام نامی نہایت بلند و روشن ہے۔ سعدی کے کلام سے ہر طبقہ و قماش، ہر طبیعت و مذاق کا آدمی لطف و استفادہ حاصل کر سکتا ہے، گلستاں و بوستاں میں پند و نصائح کو عام فہم حکایات کے پیرایہ میں نہایت خوش اسلوبی اور اختصار کے ساتھ نظم و نثر کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔ جیسا کہ مشتے نمونہ از خروارے ذیل کی چند مثالوں سے واضح ہو گا۔

مرا شیخ دانائے مرشد شہاب　　دو اندرز فرمود بر روئے آب

یکے آنکہ بر غیر بد بیں مباش　　دوم آنکہ بر خویش خود بیں مباش

یکے دیدم از عرصۂ رودبار　　کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار

چناں ہول ازاں حال بر من نشست　　کہ ترسیدنم پائے رفتن بہ بست

تبسم کناں دست بر لب گرفت　　کہ سعدی مدار آنچہ دیدی شگفت

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ　　کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

سعدی کے کلام میں اگرچہ شوخی وتیزی بدرجہ کمال ہے اور عشق و محبت کے علاوہ کہیں کہیں تمسخر ومزاح بھی پایا جاتا ہے جو ان کی شوخیِ طبع، فطری ذہانت اور آزاد منشی کا مظہر تھا۔ مگر زیادہ تر اور گہرا رنگ تصوف کا ہی ملتا ہے جو ان کے پیرومرشد کامل حضرت شہاب الدین سہروردی کے فیضانِ صحبت کا اثر تھا۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے عیاں ہوتا ہے۔

ما مقیمان کوئے دل داریم　　رخ بدنیا و دیں نمی آریم

مرغ شاخ درخت لاہوتیم　　گوہر درج گنج اسراریم

دیگر

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

سعدی کی حمد باری میں بھی اوپنشدوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔

جہاں متفق بر الٰہیتش　　فرو ماندہ در کنہ ماہیتش

نہ بر اوج ذاتش پرد مرغ وہم　　نہ در ذیل وصفش رسد دست فہم

بری ذاتش از تہمت ضد و جنس　　غنی ملکش از طاعت جن و انس

چہ شبہا نشستم در ایں دیر گم　　کہ حیرت کشید آستینم کہ قم

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار　　کہ پیدا نشد تختۂ برکنار

اگر طالبی کایں زمیں طے کنی　　نخست اسپ باز آمدن پے کنی

اسی طرح گلستاں کے آغاز میں جو حمد ربی درج ہے وہ ایک گونہ تحمل، ضبط نفس، حبس دم یا یوگ ابھیاس کی کلید ہے۔ منت مر خدائے را عزوجل کہ طاعتش موجب قربت است۔ و بہ شکر اندرش مزید نعمت ہر نفسے کہ فرو می رود ممد حیات است۔ چوں بر می آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفسے دو نعمت موجود است و بہر نعمتے شکرے واجب۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اے برتر از خیال و قیاس و گماں و وہم وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر ما ہم چنیں در اول وصف تو ماندہ ایم

حافظ شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت

خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو دکن کی برہمنی سلطنت کے بادشاہ محمود شاہ اور بنگال کے بادشاہ غیاث الدین نے ہندوستان آنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ مگر حافظ کو موقعہ سفر نہ ملا۔ البتہ انہوں نے اپنی ایک غزل شاہ بنگال کی خدمت میں ارسال کر دی۔ جس کے چند ابیات ذیل ہیں ؎

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود ایں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند ایں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
طی مکاں بہ بیں و زماں در سلوک شعر کایں طفل یک شبہ رہ یک سالہ می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطاں غیاث دیں خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

حافظؔ کا کلام تمام تر صوفیانہ ہونے کے علاوہ آزادانہ بلکہ رندانہ رنگ میں رنگا ہوتا تھا اور ریاکاری اور ظاہری زہد وورع کی جڑ کاٹتا تھا جیسا کہ اشعار ذیل سے صاف عیاں ہوتا ہے ؎

حافظا مے خورد و رندی کن و خوش باش دلے دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را
بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

بنا بریں ہم عصر ملکی ملاؤں اور طریقت پرستوں نے حافظ کی بھی بے قدری کی یہاں تک کہ ان کی وفات پر لوگوں کو ان کے جنازہ کے ساتھ جانے اور فاتحہ پڑھنے سے باز رکھنا چاہا۔ مگر روایت ہے کہ بعض حاضرین وقت کے اصرار پر ان کے دیوان سے فال لی گئی تو یہ شعر بر آمد ہوا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظؔ کہ گو غریق گناہ است می رود بہ بہشت

اس پر سب نے بالاتفاق نماز جنازہ ادا کی، خواجہ حافظ کو ہندوستان میں فارسی داں طبقہ میں لسان الغیب یا ترجمان الاسرار کے بلند القاب سے یاد کیا جاتا ہے جو مولانا عبدالرحمٰن جامؔی نے ان کے متعلق مرقوم کیے تھے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دیوان حافظؔ کی غزلوں میں عشق مجازی

کے پردے میں عشق حقیقی کا مزا اور کیف و وجدان کا لطفِ بے پایاں ہے جو اربابِ تصوف کا اہم حصہ اور تعلیم دیدانت کی شان ہے۔ کئی اہالیان نظر جو قرعہ اور فال پر اعتقاد رکھتے ہیں دیوان حافظ کے اشعار سے کتب مذہبی کی تقلید پر فال نکالتے ہیں چنانچہ یہ امر خالی از ادبی دلچسپی نہ ہوگا کہ شاہان ہمایوں و جہانگیر نے بھی کئی مرتبہ دیوان حافظ سے فالیں لیں۔ جن کو انہوں نے درست پایا۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔ جب ملک بدر ہمایوں ایران سے روانہ ہو کر ہندستان پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تب اس نے فال نکالی۔ دیوان حافظ کا شعر ذیل بر آمد ہوا۔

دولت از مرغ ہمایوں طلب و سایۂ او　　زانکہ بازاغ و زغن شہپر دولت نبود

پہلے مصرع میں لفظ ہمایوں دیکھ کر ہمایوں خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ اور اس کو فتح و کامیابی کا پورا یقین ہو گیا۔ دیوان حافظ کا جو قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے اس میں کئی جگہ جہانگیر کی دستخطی یادداشتیں پائی جاتی ہیں۔ جن سے پتہ لگتا ہے کہ کون کون سے اشعار بطور فال بر آمد ہوئے تھے۔ آزاد بلگرامی کا قول ہے۔

مرداں ز خاک ہم خبر آسماں دہند　　فال کلام حافظ شیراز کن لحاظ

اس زمانہ میں جب چنگیز خاں اور ہلاکو کی سفاکی اور غارت گری سے نہ صرف چین و تاتار و توران بلکہ ایران و افغانستان کے احکام و فرمانروایان بھی ہراساں اور باشندگان پریشان تھے اربابِ علم و اصحابِ معرفت بمصداق

ترحل عن مكان فيه ضيم　　و خل ا لدار تنعى من بناها

ان اطراف و جوانب کو چھوڑ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ دسویں صدی عیسوی میں بابا ریحان بغداد سے کئی درویشوں کو ساتھ لے کر بروچ میں آبسے۔ نور الدین یمن سے آکر گجرات میں رہنے لگے۔ علی بن عثمان الجویری صاحبِ کشف المحجوب غزنی سے لاہور آکر آباد ہو گئے۔ شیخ اسمٰعیل بخاری اور فرید الدین عطار مصنف منطق الطیر و تذکرۃ الاولیا نے بھی اپنی سیاحت کے دوران میں کچھ عرصہ ہندوستان میں گذارا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشیؒ، سید شاہ میرؒ، شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ بہاؤ الدینؒ وغیرہم نے ہندوستان کے مختلف مقامات میں سکونت اختیار کی۔ شیخ ابراہیم عراقی نے جو شاعر اور

عارف معروف تھا اپنے وطن سے ہجرت کر کے شہر مولستھان (ملتان حال) میں شیخ بہاؤالدین ذکریا کی خدمت میں قریباً پچیس سال ریاضت کی۔ اسی سلسلہ میں کئی دیگر مردان راہِ خدا مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء۔ شاہ چراغ داتا گنج بخش۔ شاہ بو علی قلندر۔ شاہ نورالدین سلیم چشتی نے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے شہروں کو ہی اپنی تعلیم و تلقین کا مرکز بنایا۔ یہ جلیل القدر درویش اگرچہ ظاہری طریقت اور شریعت کی پابندی مناسب سمجھتے تھے (بقول طریقت رو۔ شریعت گو۔ حقیقت درز باید بود کہ شیر وروغن و آرد زجمعیت شود حلوا) مگر ان کے عقاید اور اخلاق قیود دینی سے بالا وبرتر ہوتے تھے اور اپنی ذاتی ریاضت اور خدائی برکت سے کئی مراحل و مدارج طے کر کے اعلیٰ مقامات ومراتب روحانی پر پہنچے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ان کے عقید تمندوں کے دائرے میں نہ صرف مسلمان رعایا ہی بلکہ بادشاہان دہلی بھی آگئے تھے۔ چنانچہ سلطان شمس الدین التمش نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی عقیدت کے لحاظ سے اپنا لقب القطبی رکھا۔ اور اکبر بادشاہ بھی ابتداء خواجہ معین الدین چشتیؒ کا معتقد تھا۔ اندریں حالات کثیر التعداد اہل ہنود بھی ان اولیائے کرام کا بہت احترام کرتے تھے ان مشائخ عظام کی تصانیف عربی، فارسی اور ریختہ میں لکھی جاتی رہیں۔ ان میں سے قریب قریب تمام اصحاب کو صوفیائے کرام کے زمرے میں متصور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کا مشرب کس میازاری، ہر دلعزیزی۔ صدق و صفا اور تنافر از ریا ہوتا تھا۔

مباش درپے آزار و ہرچہ خواہی کن　　کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

شیخ فرید الدین گنج شکر نے پنجاب میں سکونت اختیار کی۔ ذیل کے اشعار ان سے منسوب ہیں جو فارسی وریختہ کا معجون مرکب ہیں۔

وقت سحر وقت مناجات ہے　　خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا　　خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
پند شکر گنج بدل بشنوی　　ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کی نسبت روایت ہے کہ ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سلطان علاء الدین خلجی نے امیر خسرو کو ان کی خدمت میں متعین کیا۔ خسرو نے اپنے شعر واشعار اور گانے بجانے سے حضرت کو خوش کر لیا۔ تب حضرت قلندر نے بھی کچھ اپنا کلام سنایا۔ جس کا نمونہ ذیل ہے۔

جن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے   بدھنا ایسی رین کو بھور کبھو نہ ہوئے

اور اسی مضمون کو فارسی میں اس طرح ادا کیا گیا۔

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب   تا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

اگرچہ ان مشائخ کی تصانیف کی ترویج واشاعت ان کے اپنے زمانوں میں زیادہ تر ہندوستان میں ہی محدود رہی کیونکہ ایران میں تین چار صدیوں تک شیعیت اور تعصبِ مذہبی کا دور دورہ رہا۔ تاہم ایران کے صوفی مشرب علما وغیر متعصب عرفا وفضلا بھی ان اصحابِ کرام کی بزرگی اور معرفت کا اعتراف کرتے رہے ہیں چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ان میں سے متعدد صوفیاء کرام کا تذکرہ اپنی مستند کتاب نفحات الانس میں درج کیا ہے، ادبی روابط بین الممالک ہند وایران میں ان صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ سمجھا جانا چاہیے کیونکہ ان حضرات کے افعال واقوال وتصانیف کے اثرات معاشرتی اخلاقی وروحانی دنیا میں بہت دور اور دیر تک جاری وساری رہتے ہیں۔ فقرہ "ہنوز دہلی دور است" جو ایک ولی اللہ کی زبان سے نکلا جزو محاورہ روز مرہ بن گیا ہے اور بیت ذیل جو حضرت خواجہ قطب الدینؒ کو وجد میں لے آیا کرتا تھا اب تک محافل میں قوالوں کی زبانی بار بار سنا جاتا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر دمے از غیب جانے دیگر است

شاہ بو علی قلندر کے ابیات ذیل بھی مشہور ہیں۔

چشم بند و گوش بند لب بہ بند   گر نہ بینی نور حق بر من بخند
اے حقیقت داں گذر کن از مجاز   چند باشی در مقامِ حرص و آز
چند در کثرت نمائی خویش را   یک زماں در خانۂ وحدت بیا
آشنا کن آں چناں با یار خویش   تا کہ خود را گم کنی از کار خویش

وصالی کا قول ہے۔

کہ چشمان دل مبیں جز دوست   ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

انہی بزرگوں میں سے ایک کا قول تھا۔

چار گوشہ در کلاہم می نماید چار ترک   ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولیٰ، ترکِ ترک

جہانِ ادب

مستانِ جامِ عشق کہ لاف از فنا زنند　　جاں می دہند و خیمہ ملکِ بقا زنند

امیر خسرو

خلجی اور تغلق بادشاہانِ دہلی کے زمانہ میں ہندوستان کے اندر ایک ایسا بلند پایہ شاعر پیدا ہوا جس نے فارسی زبان کی کثیر التعداد شاہکار تصانیف سے ثابت کر دیا کہ ایک ہندوستانی بھی جس نے ایران یا توران میں کبھی قدم نہ رکھا ہو ایرانی اہل زبان شاعروں پر سبقت لے جا سکتا ہے یہ شخص امیر خسرو تھا۔ جن کے والد ترکی النسل تھے اور والدہ ہندی خاتون تھی۔ خسرو نے جلال الدین اور علاء الدین خلجی اور بعد ازاں کیقباد محمد تغلق کے دربار میں ملازمت اختیار کر کے فارسی ادب اور ہندی ساہتیہ ہر دو کی خدمت انجام دی اور دین دنیا کی شہرت حاصل کی، خسرو کے قصائد خاقانی اور انوری کے ہم پلے سمجھے جاتے ہیں اور بلحاظ صنائع و بدائع تجنیس وایہام وغیرہ متقدمین سے فائق۔ اس کی غزل کی شیرینی بدرجہ کمال ہے۔ بقول خود ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

اس کی مشہور تصانیف ذیل ہیں:

شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ آئینہ سکندری۔ ہشت بہشت۔ قران السعدین۔ اور دیوان نظم میں شکرستاں۔ نہ سپہر۔ تاریخ دہلی۔ خزاین الفتوح اور چند رسالے علم موسیقی کے نثر میں ہیں۔ دیگر تصانیف کو چھوڑ کر اگر صرف ایک کتاب قران السعدین کا ہی مطالعہ کیا جائے تو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ شاعر کس اونچے درجے کا ہے۔ اس مثنوی میں بھی جدت، ندرت اور ایجاد پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور نظامی کی مثنوی سے کسی طرح کم نہیں ہے جو حمد ربی اس میں درج ہے وہ سعدی کی حمد منظوم کی ہمسری کرتی ہے ؎

واجبِ اول بوجود و قدم　　نے بوجودے کہ بود از عدم
پیشتر از وہم خرد پروراں　　بیشتر از فہم فراست گراں
دل متحیر کہ چہ داندورا　　روح در ایں گم کہ چہ خواند ورا
نور فزائے بصر دور بیں　　دیدہ کشائے دل عبرت گزیں

یہ مثنوی خسرو نے اپنے آقائے نامدار تغلق شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی جس کے لیے بیش بہا

موتیوں کی لڑیوں کی تھیلی بہ پیشگی مرحمت ہوئی تھی۔ اور تکمیل پر انعام واکرام کما حقہ کی امید تھی۔

خواستہ چند انت رسانم ز گنج کز پے خواہش نبری ہیچ رنج

مگر تغلق شاہ مرض الموت لاحق ہو جانے کی وجہ سے شاعر کی اس توقع کو پورا نہ کرسکا اگرچہ خسرو بھی مثل فردوسی حصول حق الخدمت میں ناکام رہا۔ مگر ہندی شاعر نے ایرانی استادِ سخن کی نسبت زیادہ بلند خیالی کا ثبوت دیا اور بجائے ہجو لکھنے کے حسب ذیل اشعار موزوں کیے۔

من کہ نہادم ز سخن گنج پاک گنج زر اندر نظرم ہست خاک
گر دہدم تاجور سر بلند دُر نتواں باز بہ دریا فگند
ہر ہمہ دانند کہ چندیں گہر کس نہ فشاند بدوسہ بدرہ زر
در دہدم گنج فریدوں وجم ہدیہ یک حرف بود بلکہ کم

اور کہا۔

نیست آں دارم از ایں پس بہ راز کز در شہ نیز شوم بے نیاز

نظامی گنجوی کے خمسہ کے مقابلہ میں خسرو نے بھی خمسہ لکھا اور نہایت زبردست لکھا۔ جس کی تعریف سب سخنداں کرتے ہیں بلکہ اصحاب نکتہ رس نظامی پر ترجیح دیتے ہیں۔ خسرو نے اس خمسہ میں شاعرانہ تعلّی کے طور پر کہا تھا کہ۔

دبدبہ خسرویم شد بلند زلزلہ در گور نظامی فگند

اس پر کسی ہم عصر حاسد نے اس کو طعنہ دیا۔ اور کہا۔

دُزدِ نظامی توی اے خود پسند مرتبہ دزد نہ گردد بلند

مثنوی قران السعدین کے مندرجہ ذیل اشعار اسی خوردہ گیری کے جواب سمجھے جاسکتے ہیں۔

دزد نیم خانہ بہ دیگرے خانہ کشادہ ز در دیگرے
طرفہ کہ شان دزد و من از شرم پاک صاحب کالا من و من شرمناک

امیر خسرو کی تصانیف گو اس کے ہم عصر اور مابعد کے علما و فضلائے ایران بھی نہایت شوق سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اگرچہ بعضوں کو اس کے کلام میں ایرانی محاوروں کے درست استعمال کی نسبت کلام تھا۔ تاہم جب سعدی شیرازی کا یہ اعتراف تھا کہ خسرو میر انعم البدل ہے تو اس

سے زیادہ اس کی قادر الکلامی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے، خسرو کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ بجثیتِ نظامی اس کا دلی رجحان معرفت حقیقی اور تصوف کی طرف ہی تھا۔ جیسا کہ اس کے اشعار سے ترشح ہوتا ہے۔

ستم است گر ہوست کشد، کہ بسیر سرو سمن درا　　تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درا

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند　　آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست

چہ تدبیر اے مسلماناں من خود را نمی دانم　　نہ ہندوام نہ گبرم نے نصاری نے مسلمانم

خسرو، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خاص مریدوں میں سے تھے اور اواخر عمر میں شاعری کے اعلیٰ مراحل طے کر کے تلامیذ الرحمٰن اور عرفائے زماں کے درجے پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اس مردِ خدا کے نام نامی کو اپنی تصنیف نفحات الانس میں دیگر مشائخ عظام وصوفیائے کرام میں جگہ دی ہے۔ خسرو کا کلام نہ صرف فارسی زبان بلکہ ہندی بھاشا میں بھی معروف ہے اور اس امر کا شاہد ہے کہ ہندوستان میں ایرانی اور ترکی قوم اور فارسی زبان کی درآمد سے یہاں کی بول چال اور بھاشا میں کس قدر تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ پرکرات۔ ڈنگل اور نگل اور اپ بھرنش بھاشا نے دہلی کی کھڑی بولی کا لباس پہن لیا اور ایک قسم کی نئی ملی جلی زبان ریختہ کی آمد آمد شروع ہو گئی جو دو صدیوں بعد مغلیہ عہد میں اردو کے نام سے نامزد ہوئی۔ جس طرح حافظ نے بعض غزلیات میں ایک مصرع فارسی کے ساتھ دوسرا مصرع عربی کا موزوں کیا تھا مثلاً۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا　　کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

از خون دل نوشتم نزدیک یارنامہ　　انی رأیت دھر امن ھجرك القیامه

اسی طرح خسرو نے بھی کئی اشعار ہندی فارسی کے ملے جلے لکھے مثلاً۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں　　کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ　　سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں، ز مہر آں مہ بگشتم آخر　　نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودھی بھی علم دوست اور علما پرور بادشاہان دہلی تھے۔ ان کے عہد میں کئی مدارس قائم ہوئے اور کثیر التعداد فارسی عربی علماء فضلا کو لاکھوں روپیہ سالانہ مشاہروں پر

بغرض تعلیم مقرر کیا گیا۔ سکندر لودھی پہلا مسلمان فرمانروائے دہلی تھا۔ جس نے ہندو لوگوں اور کاستھ قوم کو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری دفاتر میں داخل ہونے کی ترغیب دی اور خدمات کے صلہ میں جاگیریں عطا کیں۔

اسی زمانہ میں علامہ ابن بطوطہ ایک عرب سیاح ایران ہوتا ہوا ہندوستان میں وارد ہو کر دہلی میں مقیم ہوا اور یہاں کا حاکم مقرر ہو گیا۔ اس نے اپنی تصنیف مراۃ الاقالیم میں دہلی اور باشندگان ہند کا حال مرقوم کیا ہے۔

غرض یہ کہ اس زمانہ میں یعنی تیرہویں چودھویں صدی عیسوی کے اندر فارسی علم و ادب، نظم و نثر، فلسفہ و حکمت اور معرفت کا مرکز ایران سے ہٹ کر ہندوستان میں قایم ہونے لگا۔

پہلی قسط

اقبال کا پیغام
عصر حاضر کے نام

از جناب مولوی قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم۔اے (علیگ)
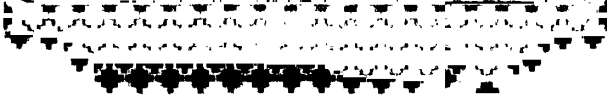
عصر حاضر کا انسان ـ

اپنی حکمت کے پیچ و خم میں الجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

بے شک زمانۂ حاضر کا انسان ایجاد و اختراع، فن و حکمت، سائنس و ہنر کے لحاظ سے کمال کے انتہائی مدارج پر گامزن ہے۔ اس کی نکتہ رس اور باریک بیں عقل نے ناممکنات کو ممکن بنادیا جو چیزیں وہم و گمان و قیاس کے ماورا تھیں اب وہ روزمرہ کے حقائق میں شامل ہیں۔ سات سمندر پار والوں سے گفتگو کی جارہی ہے، تصویریں بولتی ہیں۔ ٹیلی ویژن سٹ گھروں میں نصب ہیں ایکسریز ہمارے لیے ان دریچوں کا کام دیتی ہیں جن کے پٹ کھول کر ہم اپنے معدے اور آنتوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری سڑکیں ربڑ اور شیشے سے بنائی جارہی ہیں۔ ہماری کھیتی برقی قوت کے ذریعہ پکتی ہے، طے الارض کی کرامت کا ہم سے ظہور ہوتا ہے۔ فاصلے ہمارے لیے وجود نہیں رکھتے، ہمارے طیاروں نے زمین کو گھیر لیا ہے بہرحال مشین کو ہم نے ایجاد کیا اور مشین نے ہماری زندگی میں عظیم الشان تغیر پیدا کردیا۔ اسی تغیر کی ماہیت اور اس کے دوررس نتائج پر ہمیں یہاں

اقبالؔ پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ اور بتلاتا ہے کہ زندگی پر مشین کے تسلط کی وجہ سے جو تہذیب پیدا ہوئی ہے وہ فساد قلب اور فساد نظر میں مبتلا ہے اس کی روح میں عفت، اس کے ضمیر میں پاکی، اس کے خیال میں روحانی علو و بلندی اور اس کے ذوق میں لطافت و پاکیزگی مفقود ہے۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　ضمیر پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اقبالؔ کی نظر میں عہد حاضر کا انسان قلب و نظر کے امراضِ فاسدہ میں مبتلا ہے جس کا اصل سبب اقبالؔ کے نزدیک حیاتِ انسانی کے وہ غلط نظریے ہیں جن کے تحت وہ آج اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ اس لیے آیئے ذرا دیر کے لیے یکسو ہو کر ہم اجمالاً ان نظامہائے حیات پر نظر ڈالیں جس کو اس نے اپنا رکھا ہے۔

جزئیات و فروع سے قطع نظر اصولی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو انسانی زندگی کے لیے جتنے مذہب و مسلک بنے ہیں وہ بالعموم چار ہیں۔

ا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے۔ جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کار فرما نہیں ہے، یوں ہی بن گیا ہے، یوں ہی چل رہا ہے اور یوں ہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کی دیگر اشیاء کی طرح انسان بھی ایک ہے اس کی بھی کچھ خواہشات ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے علم و عقل کا سہارا کافی ہے۔ اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی دنیوی زندگی کی حد تک ہیں اس کے ماسوا کوئی زندگی نہیں۔ لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابل اخذ اور قابل ترک ہونے کا فیصلہ انہیں نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانہ میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر حکمرانوں نے، امیروں نے، درباریوں نے اور ارباب حکومت نے، خوشحال لوگوں اور خوشحالی کے پیچھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اس کو ہم "ملحدانہ یا جاہلانہ" نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں۔ زمانۂ اسلام سے پیشتر جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گائے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑ میں یہی نظریہ کام کرتا رہا ہے موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد بھی یہی نظریہ ہے اگرچہ اہل مغرب سب کے سب خدا و آخرت کے منکر

نہیں ہیں، نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں لیکن جو روح ان کے پورے نظامِ تہذیب و تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکار خدا و آخرت اور اس مادہ پرستانہ اخلاق کی روح ہے اس کی بنیاد پر جو ذہنیت مرتب ہوتی ہے اور جن افکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے خواہ وہ کتابوں کی صورت میں مدون ہو یا صرف ذہن ہی میں محفوظ ہو ان سب میں الحاد و مادیت کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، انفرادی واجتماعی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں مادہ پرست قانون ساز انسان کے قوانین کا نشو و نما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے اور پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر ابھر کر وہ لوگ آتے ہیں جو سب سے زیادہ ڈپلو میٹ اور خبیث النفس ہوتے ہیں، تمام سوسائٹی کی سیادت، قیادت اور مملکت کی زمامِ کار انہیں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ان کی کتاب آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوتا ہے۔ جہاں کوئی مادی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی وہاں کوئی چیز ان کو ظلم سے نہیں روک سکتی۔ یہ ظلم ان کے خاص وطن میں یہ شکل اختیار کرتا ہے کہ طاقتور طبقے اپنی ہی قوم کے کمزور طبقوں کو کھاتے اور دباتے ہیں اور اپنے ملک کے باہر اس کا ظہور قوم پرستی، امپیریلزم اور ملک گیری واقوام کشی کی صورت میں ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا نظریۂ حیات جس کو انسان نے اپنا رکھا ہے یہ ہے کہ کائنات عالم کا نظام اتفاقی تو نہیں ہے اور نہ بے خداوند ہے مگر اس کا ایک خداوند نہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ یہ خیال چونکہ کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں بلکہ محض خیال آرائی پر اس کی بنا ہے اس لیے موہوم، محسوس اور معقول اشیاء کی طرف خداوندی والہیت کو منسوب کرنے والوں کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے نہ کبھی ہوا ہے خداؤں کی فہرست گھٹتی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، سیارے، زندہ و مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، بادل اور خیالی مرکبات مثلاً شیر انسان، ماہی انسان، چہار سرا، خرطوم بینی وغیرہ معبودوں میں جگہ پاتے رہے ہیں پھر ان کے گرد اوہام وخرافات کا ایک عجیب طلسم ہوشربا تیار ہوا ہے۔ جس میں قوتِ واہمہ نے اپنا شادابی ونادرہ کاری کے وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے جہاں کہیں خداوند اعلیٰ کا تصور کچھ نمایاں ہے وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرز کا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے چھوٹے خدا اس کے وزیر، مصاحب اور درباری ہیں جن کو خوش کیے بغیر انسان بادشاہ سلامت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے اس کے معاملات ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں

خداوند اعلیٰ کا تصور بہت دھندلا یا قریباً مفقود ہے۔ وہاں تو ساری خدائی ارباب متفرقین ہی میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی قسم کے نظریۂ زندگی کو ہم مشرکانہ نظریۂ حیات کہہ سکتے ہیں۔ یہ اپنی بہن نمبر ایک سے ہمیشہ تعاون کرتی رہی ہے مثلاً:

(الف) مشرکانہ جاہلیت میں مبتلا انسان اپنے خیالی معبود کو نافع وضار سمجھ کر مراسم عبودیت تو ضرور ادا کرتا ہے، لیکن چونکہ اس کو اپنے معبود کی طرف سے کوئی اخلاقی ہدایت یا زندگی بسر کرنے کا قانون وضابطہ نہیں ملتا ایسی صورت میں مشرک انسان خود ہی اپنی فہم و عقل کے مطابق اپنے لیے ایک شریعت تصنیف کرتا ہے اس طرح وہی ملحدانہ جاہلیت برسرکار آجاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک جگہ خداؤں کے لیے عبادت اور عبادت گاہوں کا سلسلہ [illegible] ہوتا ہے دوسری جگہ نہیں ورنہ اخلاق واعمال جیسے یہاں کے ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی [illegible] ہیں۔ بت پرست یونان و روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی [illegible] پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

(ب) اسی طرح مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتی ہے جن کو ملحد سوسائٹی اختیار کرتی ہے اگرچہ سوسائٹی کی تعمیر و ترتیب [illegible] دونوں کے ڈھنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ شرک کی مملکت میں باد[illegible] مقام دیا جاتا ہے روحانی پیشواؤں اور مذہبی عہدہ داروں کا ایک طبقہ مخصوص [illegible] پیدا ہوتا ہے جو شاہی خاندان سے مل کر ایک ملی بھگت قایم کرتا ہے اس [illegible] عوام [illegible] جال پھیلا کر ظالمانہ تسلط قایم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف الحاد پرست سوسائٹی میں [illegible] نسل پرستی، قوم پرستی، ڈکٹیٹر شپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار [illegible] جہاں تک روح اور جوہر کا تعلق ہے انسان پر انسان کی خدائی مسلط کرنے انسان کو [illegible] پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کر کے ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے [illegible] میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

(۳) تیسرا نظریۂ حیات جس کے فریب میں انسان اب تک مبتلا ہے یہ ہے کہ [illegible] جسمانی وجود انسان کے لیے ایک دارالعذاب ہے انسان کی روح اس کے جسم کے اندر [illegible] یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اصل میں اس قید خانہ کے طوق و سلاسل [illegible]

ہیں۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ خواہشات ولذات کو مٹایا جائے اور اپنے اس دشمن نفس و جسم کو مجاہدات وریاضت کے ذریعہ اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلط قایم نہ ہو سکے اس طرح روح پاک وصاف ہو جائے گی۔

اس نظریہ کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظامِ فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں۔ ویدانتزم، اشرافیت، یوگ، مسیحی رہبانیت اور بدھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو افیون و کوکین کا کام کرتا ہے خواہ وہ اعمال و عقائد میں ہو یا ادب و سیاست میں۔

یہ نظریہ حیات جماعت کے نیک اور پاکباز افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں [illegible] تا ہے اس لیے سوسائٹی کے بدترین شریر افراد کے لیے میدان صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے [illegible] جاہلیت کے اثرات عوام میں غلط قسم کا صبر و تحمل پیدا کرتے ہیں جو انہیں ظالموں کے [illegible] میں کھلونا بنا دیتا ہے اسی وجہ سے سماج کے با اقتدار طبقے بادشاہ، امراء اور مذہبی ٹھیکیدار اس [illegible] و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے ہیں اور یہ ان کی سرپرستی میں پھلتا پھولتا رہتا

[illegible] جاہلیت کا معاملہ اپنی ہم جنس بہنوں کے ساتھ جیسا بھی ہے وہ ظاہر ہے مگر انبیاء علیہم [illegible] کی [illegible] کے ساتھ تو نہایت عجیب و غریب ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے [illegible] دنیا کو یہ دار العمل اور مزرعۃ الآخرت کے بجائے دار العذاب اور مایا کے جال کی حیثیت سے [illegible] ہے اس سے جو ذہنیت مرتب ہوتی ہے اس کی رو سے عبادات و اوامر و نواہی کا یہ مفہوم [illegible] یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں یہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب اعمال گناہِ زندگی کا کفارہ ہیں۔ اس طرح انسان روایات کی دنیا میں گم ہو کر خلافت الٰہی کی ذمہ داریوں کو بھول جاتا ہے۔ جس کی طرف علامہ اقبالؔ نے بار بار توجہ دلائی ہے جیسا کہ آگے مذکور ہے۔

(۴) زندگی گزارنے کا چوتھا نظریہ یہ ہے کہ یہ سارا عالمِ ہست و بود جو ہمارے گردو پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جز ہم خود ہیں دراصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے اور وہی بلا اشتراک غیرے اس کا مالک ہے۔ انسان اس مملکت میں پیدائشی رعیت ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی

مرضی پر موقوف نہیں بلکہ ... [illegible]

میں نہیں جس طرح مملکت کے تمام اجزا بادشاہ کے امر

کرے۔ اور جو ہدایت بھی بذریعہ وحی اس تک پہنچے اس

کے دنیوی اعمال کا اصل حساب و کتاب مہلت کی یہ ز

آخرت ہے۔ آخرت کی فلاح و خسران کا مدار اس پر ہے کہ

استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کے طرف سے آئی ہوئی ہدایت

اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں اور اس کے امر شرعی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ ایک مستقل

فلسفہ پیدا کرتا ہے اس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے، اس تہذیب کی رگ

اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور

کے "تابع شریعت ہونے کی روح" ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام تمدن

خود مختاری بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی

لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قایم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے

دخال و رنگ و روغن دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونے سے ہر جز اور ہر

ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تمدن کی تمام تفصیلات کا نقشہ دوسرے تمام نقشو

ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرز زندگی، شخصی کردار، کسب معاش، صر

، ازدواجی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات دولت کی تقسیم، حکومت کی تشکیل

حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، صنعت و تجارت، صلح و جنگ کے معاملات اور خارجی سیاست

کہ انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملا

تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے جس کا ہر جز اللہ کی حاکمیت، انسان

اور آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

تین افراد کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا: ایک وہ امام جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں، دوسرا وہ
کے لیے آتا ہے اور اس کی جماعت چھوٹ جاتی ہے اور تیسرا وہ شخص جو آزاد کو غلام بناتا ہے۔

اور جاگیرداری کا
تاریخی پس منظر

از جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری

زمین سے متعلق ابتدائی تصورات

ابتدائی زمانہ میں زمین تمام انسانوں کی ملک سمجھی جاتی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلے کسی قطع زمین کو کام میں لے آتا اسی کی عارضی ملکیت قایم ہو جاتی اور جب تک قبضہ کا عمل باقی رہتا بے دخل کر کے کسی دوسرے کا قابض ہونا انصاف اور قانونِ فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا چونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ اگر قابض سے زیادہ طاقتور شخص کو یہ مقام پسند ہوگا تو بے دخل کر کے خود قبضہ کرلے گا اس لئے کچھ دنوں بعد مستقل ملکیت کا تصور قایم ہوا۔

پہلے صرف استعمال کا حق تھا اور اب اس کے ذات کی بنیاد پڑ گئی۔ پہلے قبضہ نے ایک عارضی حق پیدا کیا تھا یہی حق بعد میں مستقل ملکیت کا سبب بنا۔

"بلیک اسٹون" کا یہی نظریہ ہے۔ "جرمنی کا مشہور مقنن "سوگنی" تقریباً اسی رائے کا مؤید ہے "الل روما" میں جائداد کا یہی ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔ جے۔ کے ملخلی ایک حد تک اسی کی تائید میں ہے[1]

[1] قدیم قانون فصل ہشتم ص ۲۰۳ نیز نظریہ سلطنت ص ۲۴۳

مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا اور کچھ ہونا اس کے امکان میں نہیں، جس طرح مملکت کے تمام اجزا بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کرے۔ اور جو ہدایت بھی بذریعہ وحی اس تک پہنچے اس پر وفاداری کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ اس کے دنیوی اعمال کا اصل حساب و کتاب مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد ہے اور اسی کا نام آخرت ہے۔ آخرت کی فلاح و خسران کا مدار اس پر ہے کہ انسان اپنی قوت نظر واستدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کے طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں اور اس کے امر شرعی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتداء سے انبیاء علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ یہ ایک مستقل نظام فلسفہ پیدا کرتا ہے اس فلسفہ کی بنیاد پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے، اس تہذیب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں جو روح کام کرتی ہے وہ اللہ واحد و قہار کی حاکمیت، آخرت کے اعتقاد اور انسان کے تابع شریعت ہونے کی روح ہے بخلاف اس کے دیگر تہذیبوں کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری بے قیدی و بے مہاری اور غیر ذمہ داری کی روح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاء علیہم السلام کی قایم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے اس کے خط و خال و رنگ و روغن و دوسری تہذیبوں کے بنائے ہوئے نمونے سے ہر جز اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تمدن کی تمام تفصیلات کا نقشہ دوسرے تمام نقشوں سے بدلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، خوراک، لباس، طرز زندگی، شخصی کردار، کسبِ معاش، صرف دولت ،ازدواجی زندگی، معاشرتی رسوم، سماجی تعلقات دولت کی تقسیم، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شوریٰ کا طریقہ، صنعت و تجارت، صلح و جنگ کے معاملات اور خارجی سیاست غرض یہ کہ انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طور و طریق اپنی ایک مستقل شان رکھتا ہے جس کا ہر جز اللہ کی حاکمیت، انسان کی مسئولیت اور آخرت کی مقصودیت سے جڑا ہوا ہے۔

(باقی آئندہ)

تین افراد کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا: ایک وہ امام جسے لوگ ناپسند کرتے ہوں، دوسرا وہ جو آخر میں نماز کے لیے آتا ہے اور اس کی جماعت چھوٹ جاتی ہے اور تیسرا وہ شخص جو آزاد کو غلام بناتا ہے۔

(ابوداؤد)

زمینداری اور جاگیرداری کا تاریخی پس منظر

از جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری

زمین سے متعلق ابتدائی تصورات

ابتدائی زمانہ میں زمین تمام انسانوں کی ملک سمجھی جاتی اور انتفاع کے لحاظ سے سب میں مشترک تھی۔ جو شخص پہلے کسی قطع زمین کو کام میں لے آتا اسی کی عارضی ملکیت قایم ہو جاتی اور جب تک قبضہ کا عمل باقی رہتا ہے دخل کر کے کسی دوسرے کا قابض ہونا انصاف اور قانونِ فطرت کے خلاف سمجھا جاتا تھا چونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ اگر قابض سے زیادہ طاقتور شخص کو یہ مقام پسند ہوگا تو بے دخل کر کے خود قبضہ کر لے گا اس لئے کچھ دنوں بعد مستقل ملکیت کا تصور قایم ہوا۔

پہلے صرف استعمال کا حق تھا اور اب اس کے ذات کی بنیاد پڑ گئی۔ پہلے قبضہ نے ایک عارضی حق پیدا کیا تھا یہی حق بعد میں مستقل ملکیت کا سبب بنا۔

"بلیک اسٹون" کا یہی نظریہ ہے۔ "جرمنی کا مشہور مقنن "سوگنی" تقریباً اسی رائے کا مؤید ہے "اہل روما" میں جائداد کا یہی ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔ جے۔ کے ملجلی ایک حد تک اسی کی تائید میں ہے[1]

[1] قدیم قانون فصل ہشتم ص ۲۰۳ نیز نظریہ سلطنت ص ۲۶۲

شخصی ملکیت کی ابتداء

مستقل ملکیت کا تصور قایم ہونے کے بعد زمین و جائداد کا مالک ایک شخص یا ایک خاندان نہ ہوتا بلکہ اس وقت پدر سری خاندان کے نمونہ پر جو جماعتیں قایم تھیں وہی اس کی مالک ہوتیں اور انہیں کے ذمہ پورا انتظام ہوتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جماعت کے مشترکہ حقوق علیحدہ ہوتے گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ شخص واحد مالک سمجھا جانے لگا۔[1]

عام طور سے ہوتا بھی یہی ہے کہ خاندان بڑھ کر ایک جدی رشتہ داروں کا مجموعہ ہو جاتا ہے پھر یہ مجموعہ مختلف گھرانوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور بالآخر گھرانوں کی جگہ اشخاص قایم ہو جاتے ہیں جو مالک سمجھے جانے لگتے ہیں۔ لیکن تبدیلی کے ہر مرحلہ پر ملکیت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

زمینداری کی ابتدائی حالت

پہلی مرتبہ "روما" میں اتنی بڑی جائدادوں کا ذکر ملتا ہے جن کی کاشت خاندان کا سردار اپنے گھر کے لڑکوں اور غلاموں کی مدد سے نہ کرا سکتا تھا۔ غالباً یہ زمیندار آزاد آسامیوں کے ذریعہ کاشت کرانے سے ناواقف تھے اس زمانہ میں عام طور سے کاشتکاری کا کام غلام انجام دیا کرتے، ادنیٰ درجہ کے غلام اعلیٰ غلاموں کے سپرد کر دئے جاتے اور وہی ان سے کام لیا کرتے تھے مدتوں کاشت کا یہی طریقہ جاری رہا۔ جب زمینداروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جب تک پیداوار سے کاشکار کا تعلق نہ ہو زمین کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی پیداوار بڑھ سکتی ہے تو بعض زمینداروں نے دوامی پٹہ اور مقررہ لگان پر آزاد آسامیوں کو زمین دینے کا طریقہ رائج کیا۔ اس کے بعد کاشتکار کی دو قسمیں ہو گئیں (۱) غلام کاشتکار (۲) آزاد آسامی کاشتکار۔

رعایا اور ان کے اختیارات

پھر کچھ غلاموں نے ترقی پائی اور آزاد آسامیوں کی حالت میں تنزلی ہوئی جس کے نتیجہ میں رعایا کا وجود ہوا۔ یہ لوگ سالانہ پیداوار کا ایک حصہ زمیندار کو دیا کرتے تھے۔ دراصل زمین کو بٹائی پر دینے کی ابتداء اسی سے ہوئی ہے۔

زمیندار اور کاشتکار کا یہ معاملہ پہلے معاہدہ کے ذریعہ ہوتا تھا بعد میں اس کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی اور معاہدۂ محدود ملکیت نام رکھ دیا گیا۔

---

[1] قدیم قانون فصل ہشتم

"رومہ" میں اس شکل نے یہاں تک ترقی پائی کہ کاشتکار کو زمین کے ساتھ دلچسپی پیدا کرنے کا اس سے عمدہ اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس میں کاشتکاروں کو اتنے وسیع اختیارات ملتے تھے کہ "روما" کے حکام انہی کو مالک سمجھتے اور بے دخل ہو جانے کی صورت میں دخلیابی کی نالش کر کے دوبارہ قبضہ کرنے کی اجازت تھی۔

اگر وہ وقت پر محصول ادا کر دیا کرتے تو پٹہ دہندہ (زمیندار) کسی قسم کی دست اندازی کا مجاز نہ ہوتا لیکن محصول ادا نہ کرنے کی صورت میں قبضہ کا اور عام حالت میں طریقۂ کاشت وغیرہ پر خاص قسم کی نگرانی کا حق باقی رہتا تھا۔ دراصل اس صورت میں دوہری ملکیت کا اصول قایم تھا یعنی بعض اختیارات کی بناء پر یہ کہا جا سکتا کہ کاشتکار مالک ہے اور دوسرے بعض اختیارات پر نظر کی جاتی تو زمیندار مالک ہوتا تھا یہی دوہری ملکیت کا اصول روما فوج کے سپاہیوں کی زمین میں بھی نافذ تھا۔ یہ لوگ سرحدی زمینوں پر مالکانہ حیثیت سے قابض تھے، زمین حکومت ہی کی ہوتی تھی لیکن سپاہی جب تک فوجی خدمت انجام دیتے تھے کاشت کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی۔

حقوق استفادہ نے موروثی شکل اسی محدود ملکیت سے اختیار کی ہے کیونکہ اس قسم کی زمین عام طور پر آزاد آسامیوں کے ورثاء پر منتقل ہو جاتی تھیں۔

جاگیرداری کا رواج

محدود ملکیت کی مذکورہ شکل تقریباً سو سال تک غیر مہذب اقوام کے پادشاہوں کے سامنے رہی انہوں نے اسی کو دیکھ کر جاگیری نظام قایم کیا۔

عام طور سے جاگیر پادشاہوں کے مصاحبوں کو درباداری کے صلہ میں ملا کرتی تھی اور یہ لوگ اس کے صلہ میں اپنی ذاتی آزادی کو قربان کر دیا کرتے تھے، ظاہر نظر میں یہ خدمت بڑی شاندار معلوم ہوتی تھی اس سے ایک قسم کی غلامانہ ذلت کی بو آتی تھی کیونکہ اس کے بدلہ اپنی ہر آزادی کو قربان کرنا پڑتا تھا۔

یہ ہیں زمینداری اور جاگیرداری کے ابتدائی تصورات جو تمام رومی و یونانی دنیا میں رائج تھے اور تقریباً دنیا کی ہر قوم میں پائے جاتے تھے [1]

---

[1] [illegible] ص ۲۴۶

رومی یونانی زمینداری و جاگیرداری

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ذاتی ملکیت کی ابتدا ایک خاص مقصد اور فائدہ کے تحت ہوتی تھی لیکن بعد میں اس مسئلہ کا غلط تصور عالمگیر انقلاب اور طبقاتی فساد کا سبب بنا۔ حتیٰ کہ اللہ کی زمین جو سب میں مشترک تھی اور جس کے سب حقدار تھے ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور دوسرا طبقہ جبر و تحکم کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہر قسم کے وحشیانہ سلوک برداشت کرنے پر مجبور ہوا اور انسان اپنی فطری صلاحیتوں اور طبعی استعدادوں کو چھوڑ کر زمیندار اور زرعی غلام میں تقسیم ہو گیا۔ پہلا طبقہ ہر حیثیت سے آزاد تھا اور دوسرا طبقہ ہر حیثیت سے غلام تھا۔ زمین کو چھوڑ کر نہ دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی اور نہ اپنی محنت سے منتفع ہونے کی سکت تھی۔ نہ آقاؤں کی تبدیلی کا اختیار اور نہ اپنے آقا سے سرخروئی کی امید تھی۔"

چنانچہ مشہور فلسفی افلاطون قدیم یونان کی یہ حالات بیان کرتا ہے:

"یونان میں ظالم مظلوم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے کبھی پردہ کے پیچھے اور کبھی کھلے بندوں کبھی مظلوموں کی شورشیں پھوٹ پڑتیں اور ظالمانہ طور پر دبائی جاتیں۔ گھروں کو جلانا، کھیتوں کو تباہ کرنا، قتل کرنا، غلام بنانا، غرض ہر قسم کے وحشیانہ سلوک عوام اور کاشتکاروں کے ساتھ مباح تھے۔"[1]

اور مشہور مورخ ایڈورڈ گبن رومن امپائر کے زوال کے اسباب کا خلاصہ یہ بیان کرتا ہے:

"روم دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا ایک ظالم، دوسرا مظلوم۔ عوام اور کاشتکار کی زندگی بیلوں اور گدھوں کے مثل تھی، حکام کے اختیارات غیر محدود اور سزا دینے میں ہر طرح آزاد تھے۔ زرعی غلاموں سے بھاری بھاری لگان وصول کیا جاتا اور تحصیل وصول میں ہر قسم کی دردناک اور عبرتناک سزائیں دی جاتیں۔"[2]

اس میں شک نہیں کہ بعض فرمانروائے روم آگسٹس وغیرہ نے اصطلاحات کی کوششیں کیں اور ان میں رعایا پروری کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے لیکن ان کی یہ کوششیں دیرپا ثابت نہ ہو سکیں کیونکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس نظام میں زیادہ جاگیریں ہوں گی اس میں کاشتکار زیادہ پریشان ہوں گے اور سلطنت کے اجزاء میں نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار نہ قائم رہ سکے گا۔ (باقی آئندہ)

---

[1] جمہوریہ افلاطون مقالہ پنجم ص ۲۲۸ و ص ۲۵۰ نیز ریاست ص ۵۱۸ و مقدمہ ریاست ص ۴۸

[2] تاریخ زوال روما ص ۵۴۔ ۶۱۔ ۹۳۔ ۹۸